

ابن صفی

میر

# جاسوسی دنیا

113- ریت کا دیوتا

114- سانپوں کا مسیحا

115- ٹھنڈا جہنم

116- عظیم حماقت

PDFBOOKSFREE.PK



جاسوسی دنیا نمبر 113

# ریت کا دیوتا

(مکمل ناول)

## پیشکش

”ریت کا دیوتا“ حاضر ہے۔ بار بار وعدہ کرنے کے باوجود بھی بہت دنوں سے جلد از جلد کوئی کتاب پیش کر دینے کی توفیق مجھے نہیں ہو رہی اس سلسلے میں کوئی ”بہانہ“ بھی نہیں رکھتا۔ فلم کا چکر بھی ہمہ وقتی نہیں کہ اسی کا سہارا لے کر معذرت طلب کروں۔ پھر.....؟ وجہ؟  
بس اللہ کی مرضی..... ہفتوں لکھنے کا موز نہیں بنتا۔ پھر اگر فریدی جیسے سنگلاخ کردار کا ناول ہو تو کیا کہنا..... ایک ایک سطر لکھ کر گھنٹوں بیٹھے سوچتے رہتے۔ ڈرتے رہنے کہ کہیں یہ حضرت اپنے مقام بلند سے ایک آدھ انچ نیچے نہ کھسک آئیں۔

بہر حال ”ریت کا دیوتا“ ملاحظہ فرمائیے..... کئی ماہ پہلے اس نام کا اعلان ہوا تھا۔ لہذا اس دوران میں میرے پڑھنے والوں نے اسی نام کی مناسبت سے بے شمار کہانیاں خود ہی ترتیب دے ڈالی ہوں گی اور جب یہ کہانی ان کی ترتیب دی ہوئی کہانی سے لگانہ کھائے گی تو مجھ پر چڑھ دوڑیں گے۔ میرے ساتھ عموماً یہی ہوتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے میرے ایک دوست مجھ سے خواہ مخواہ معافی مانگنے لگے۔ میں نے پوچھا بھائی کس بات کی معافی..... کہنے لگے پہلے معاف کر دو پھر بتاؤں گا..... میں نے کہا اچھا بابا معاف کیا۔ اب بتاؤ کیا بات ہے۔ بولے تمہیں یاد ہوگا جب تم نے ”تجاسی کا خواب“ اور ”مہک شناسائی“ نامی کتب پیش کی تھیں تو میں نے تمہیں بہت برا بھلا کہا تھا۔ میں نے کہا ہاں مجھے یاد ہے۔ کہنے لگے بھائی انہی پرسوں کی بات ہے پڑھنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ لا بریری گیا وہاں بھی کوئی نئی کتاب نہ مل سکی..... یہ دونوں کتابیں ایک ہی جلد میں ہاتھ لگیں۔ میر نے کہا چلو یہی سہی۔ یقین کرو اب جو پڑھنا شروع کیا ہے تو مزہ آ گیا۔ اب سوچتا ہوں آخر پہلے کیوں مزہ نہیں آیا تھا۔ میں نے کہا سوچتے رہو۔ شاید خود ہی جواب بھی پالو۔

میرے ساتھ عموماً یہی ہوتا ہے۔ حقیقی صلاحیت رکھنے والے ذہنوں نے ”ریت کا دیوتا“ کی کہانی اپنے طور پر ضرور ترتیب دے ڈالی ہوگی۔ مثلاً ایک پُر اسرار قبیلہ..... جو ایک ایسے دیوتا کی پوجا کرتا تھا جو ریت کا دیوتا کہلاتا تھا۔ کوئی نامعلوم اس دیوتا کا ایک کان کاٹ کر فرار ہو گیا۔ اب اس پُر اسرار قبیلے کے کچھ افراد اس کی تلاش میں نکلتے ہیں اور پُر اسرار واقعات کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ بات فریدی کی تک پہنچتی ہے اور بالآخر..... وہ کان فریدی کے ہاتھ لگتا ہے۔ دراصل وہ کان نہیں تھا بلکہ ایک چھوٹی سی سب میرین تھی۔ یعنی سب میرین کا موزل جس کا نقشہ ڈھائی ہزار سال پہلے ایک جام نے بنایا تھا۔

اگر میری کہانی کا لاٹ اس سے مطابقت نہیں رکھتا تو مجھے لکھ بھیجیں گے۔ ناول نہایت ”پھس“ رہا۔ آخر آپ کے قلم کو زنگ کیوں لگتا جا رہا ہے۔ میں صبر کر لوں گا اور منتظر رہوں گا کہ کچھ دن گزرنے کے بعد یہ ناول دوبارہ پڑھا جائے۔

میرے ساتھ زیادہ تر یہی ہوتا ہے۔ آپ کو میری کتاب ”پاگلوں کی انجن“ بھی یاد ہوگی۔ اب اس کے سلسلے میں خطوط آرہے ہیں کہ کیا کتاب لکھ دی تھی آپ نے..... لیکن جب پہلے پہل شائع ہوئی تھی تو زیادہ تر دل توڑنے ہی والی باتیں سننے میں آئی تھیں۔

والسلام

ابن صفی

۲۲/۰۶/۲۰۲۲

## ڈاڑھی کا نقاب

جیسے جیسے سورج بلند ہو رہا تھا۔ سڑک نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی۔ تیز ہوا اپنے تھ ریت کے ذرات اڑاتی حد نظر تک جاری و ساری تھی۔ اس تسلسل میں پل بھر کا بھی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ریگستان کو لٹار کی اس شفاف اور چکنی سڑک کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہتا ہو۔ سنانے کا یہ عالم تھا کہ گاڑی کے انجن کی مسلسل آواز بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ کیپٹن حمید محسوس کر رہا تھا جیسے وہ بھی اس بیکراں سنانے کا ایک جزو بن کر رہ گئی ہو۔

حد نظر تک ریت ہی ریت۔ اس کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ پھر تیش کا کیا پوچھنا۔ حمید اپنی بیچارگی پر ٹھنڈی سانس تک نہیں لے سکتا تھا۔

یہی غنیمت تھا کہ روانگی سے قبل اس نے پانی کے کئی مشکیزے بھر کر ڈکے میں رکھ دیئے

تھے ورنہ شاید یہ ریگستان ہی اس کے لئے میدان حشر بن جاتا۔

اس سفر کی وجہ؟

بعض اوقات ایسے واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو خواب بیداری معلوم ہونے لگتے

تھیں۔ پانچ دن پہلے حمید تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسے اس نوعیت کا کوئی سفر درپیش ہوگا۔ اچھا

”دشواری تو بدستور قائم ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ دشواری ختم ہو جائے گی۔“ وکیل نے کسی قدر تذبذب کے ساتھ کہا۔

چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر حمید سے بولا۔ ”آپ کو اس کا علم تو ہوگا ہی کہ آپ کے نانا کے دو بیویاں تھیں۔“

”رہی ہوں گی۔“ حمید نے جھنجھلا کر کہا۔ ”میرا اب کسی سے بھی کوئی تعلق نہیں!“ وہ برائسل الجھن میں پڑ گیا تھا۔ نہیں چاہتا تھا کہ وہ پرانا قصہ یہاں ڈی آئی جی کے سامنے دہرایا جائے۔

”خاموشی سے سنو۔“ ڈی آئی جی نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور حمید خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے جواب سے ڈی آئی جی کی تجسس والی حس بیدار ہوگئی ہے اور اب ساری بات کھل کر رہے گی۔ لہذا وہ تن بہ تقدیر ہو بیٹھا۔

”آپ کے نانا کی دو بیویاں تھیں..... پہلی بیوی سے صرف لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک آپ کی والدہ ماجدہ.....!“

وکیل جملہ پورا کئے بغیر خاموش ہو گیا اور حمید نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اٹھ کر بھاگ تو سکتا نہیں تھا۔

”تفصیل میں جانے سے کیا فائدہ۔“ وکیل کھکا کر بولا۔ ”مجھے صرف ان کی دوسری بیوی سے متعلق گفتگو کرنی چاہئے۔“

”وہ بیوی نہیں داشتہ تھی۔“ حمید نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔

”مجھے گہرا صدمہ پہنچا کیپٹن حمید۔“ وکیل کا لہجہ بھی اچھا نہیں تھا۔ ”مرحوم کو صرف آپ سے بہتر توقعات تھیں۔ براہ کرم اب کوئی نامناسب جملہ زبان سے نہ نکالئے گا۔ چودھری صاحب سے میرے دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ چودھری صاحب کے لئے پہلی بیوی کی اولاد نے اسی قسم کا پروپیگنڈہ کیا تھا۔ ان کی والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ والد کا انتقال ہوا تو وہ صرف اٹھارہ سال کے تھے۔ میٹرک پاس کر چکے تھے۔ بے حد حساس ہونے کی بناء پر وہ گھر چھوڑ گئے۔ پھر انہوں نے کبھی کسی کو اطلاع نہ ہونے دی کہ وہ زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔ چھ دن ہوئے پینٹھ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں

بھلا آفس میں بیٹھا تھا کہ ڈی آئی جی کے آفس میں طلبی ہوئی۔ اس وقت فریدی موجود تھا۔ لیکن یہ طلبی فریدی کے عیوض نہیں تھی۔ وہ الجھن میں پڑ گیا تھا۔

ڈی آئی جی کے پرسنل اسٹنٹ نے فوری طور پر آفس میں پہنچا دیا۔ سر کی جنبش ڈی آئی جی نے اسکے سلام کا جواب دے کر سامنے پڑی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ حمید بیٹھ گیا۔ ایک آدمی اور بھی موجود تھا۔ ڈی آئی جی نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ ”کیپٹن حمید ہیں۔“

”اوہ.....!“ اجنبی اٹھتا ہوا بولا اور دونوں نے مصافحہ کیا؟

”میرا نام شاہد عزیز ہے.....!“ اجنبی نے دوبارہ بیٹھے ہوئے کہا۔ ”اور میرے ذہن فی الحال یہ کام ہے کہ آپ کو ایک بُری خبر سناؤں۔“

”بُری خبر.....!“ حمید چونک پڑا۔

”میں ایڈووکیٹ ہوں اور آپ کے ماموں کے قانونی مشیر کے فرائض انجام دیتا رہا ہوں۔“

”میرے ماموں.....!“ حمید کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔

”چودھری شیر علی خان مرحوم.....!“ وکیل نے مغموم لہجے میں کہا۔

”شاید یہ نام بھی میرے لئے نیا ہے۔“

ڈی آئی جی نے وکیل کو گھور کر دیکھا۔ لیکن وکیل کے ہونٹوں پر ایک مغموم سی مسکراہ نظر آئی تھی۔

”جی ہاں.....!“ وہ سر ہلا کر بولا۔ ”ممکن ہے نام آپ کے لئے نیا ہو۔ لیکن وہ آپ

کے ماموں تھے۔ میں آپ کو ان کے انتقال کی خبر کے ساتھ وصیت نامہ دینے آیا ہوں۔“

حمید نے بے بسی سے ڈی آئی جی کی طرف دیکھا۔

”سوال یہ ہے مسٹر شاہد۔“ ڈی آئی جی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”اگر کیپٹن

اپنے ماموں سے واقف.....!“

”یہ خاندانی معاملات ہیں جناب۔“ وکیل نے طویل سانس لی چند لمحے خاموش رہا۔

بولا۔ ”اسی دشواری کی بناء پر میں نے آپ کے توسط سے رابطہ قائم کیا ہے ورنہ شاید

دشواری پیش آتی۔“

اپنے اعزاء کے احوال سے پوری طرح واقف ہوں لیکن اُن کے لئے میں مرہبہ گا..... اور پکتان صاحب! انہی کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ آپ کے والدین معاملے میں بالکل الگ رہے تھے۔ انہوں نے اس پروپیگنڈے کی نہ تائید کی تھی اور نہ کی تھی۔ آپ کو حیرت ہوگی کیپٹن..... کہ چودھری صاحب آپ کو بے حد چاہتے تھے آپ کو دیکھنے کے لئے تین سو میل کا سفر طے کر کے یہاں آئے تھے اُن کی حویلی میں آپ کی تصویریں نظر آتی ہیں۔“

حمید حیرت سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی جھنجھلاہٹ رفع ہو چکی تھی۔ ”ہاں..... تو.....!“ وکیل نے بات جاری رکھی۔ ”انہوں نے آپ کو اپنا وارث قرار ہے..... شادی نہیں کی تھی۔ لاولد مرے ہیں۔ لیکن کچھ خاندانوں کی کفالت کرتے ہیں۔ ازدوئے وصیت آپ کو بھی ان کی کفالت کرنی پڑے گی۔ جائیداد بہت بڑی ہے۔“

”خداوند!..... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا.....!“ حمید بڑبڑایا۔ ”ٹھہرو.....!“ ڈی آئی جی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”تمہارے لئے تو سیدھی سی بات ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس میں میری وساطت کی ضرورت کیوں پیش آئی۔“

”ابھی عرض کرتا ہوں.....!“ وکیل نے اپنا بریف کیس کھولتے ہوئے کہا۔ اس کچھ کاغذات نکالے اور ڈی آئی جی کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ ”ملاحظہ فرمائیے۔“

ڈی آئی جی کاغذات دیکھنے لگا۔ کمرے کی بوجھل سی خاموشی میں حمید کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس نے اپنے ایسے اہل کا ذکر اپنی دونوں بڑی خالوں سے سنا تھا لیکن خود اس کے والدین اس سلسلے میں کبھی گفتگو سے ہمیشہ پہلو بچاتے رہتے تھے۔ لیکن یہ وصیت نامہ! اور وکیل کا بیان..... اس کی الجھن بڑھتی رہی۔ بالآخر ڈی آئی جی کاغذات کو ایک طرف رکھتا ہوا بولا۔ ”ہاں وجہ صاف ہے..... دراصل اس وصیت نامے کے مطابق تم ایک شرط کے ساتھ مرحوم کے وارث قرار پائے ہو۔ شرط یہ ہے کہ تم دو ماہ تک کی کوٹھی میں مقیم رہ کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو گے کہ ان کی سرپرستی میں زندگی بسر کر والے خاندان سے کس قسم کے تعلقات تھے۔ اُن خاندانوں کے افراد ان کے بارے میں

رائے رکھتے تھے۔ یہ معاملہ میرے توسط سے اسی لئے تمہارے سامنے رکھا گیا ہے کہ تم وصیت نامے کی اس شرط کی پابندی پوری پوری دیانت داری سے کرو۔“

”جناب عالی!“ حمید طویل سانس لے کر بولا۔ ”میں اپنے خاندان والوں سے مشورہ کئے بغیر اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔“

ڈی آئی جی نے وکیل کی طرف دیکھا۔ ”ایسی کسی چویشن کے لئے شیر علی خان کی زبانی ہدایت مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“

وکیل نے کہا۔ ”انہوں نے کہا تھا اگر کوئی ایسی صورت پیش آئے تو کیپٹن حمید کو چاہئے کہ صرف اپنے والدین سے مشورہ کریں اور کسی کو بھی اس کی خبر نہ ہونے دیں اور اپنے والدین سے بھی درخواست کریں کہ یہ بات ان کی ذات سے آگے نہ بڑھنے پائے۔“

اُس وقت بات ختم ہو گئی تھی۔ وکیل نے حمید کو اپنا پتہ دیا تاکہ معاملات طے ہو جانے کے بعد وہ اس سے رابطہ قائم کر سکے۔

کاغذات وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ وکیل کے چلے جانے کے بعد ڈی آئی جی نے مسکرا کر حمید کی طرف دیکھا۔

”مبارک ہو کیپٹن حمید..... لاکھوں کی جائیداد ہے۔“

”جناب! میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”تم اپنے والدین سے مشورہ کرو..... شرط پوری کرنے کے لئے تمہیں دو ماہ کی چھٹی مل جائے گی۔“

حمید نے ڈی آئی جی کا شکریہ ادا کیا تھا۔

واپسی پر فریدی سے ملاقات ہوئی۔ ظاہر ہے کہ حمید نے اسے بتانے میں دیر نہ لگائی ہوگی۔

”بہت اچھے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”ڈی آئی جی اگر اس پر مسرت موقع پر تمہیں دو ماہ کی چھٹی دے سکتے ہیں تو کیا میں تین دن کی نہیں دے سکتا۔ جاؤ اور اپنے والدین سے مشورہ کرو۔“

”بس اتنا ہی کہنا ہے آپ کو.....!“ حمید نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔

”اور کیا چاہتے ہو.....!“

”کچھ بھی نہیں۔“ حمید کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”اوہو..... اچھا.....!“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”تم سمجھ رہے ہو شاید میں نے تمہیں کسی اندھی چال پر لگا دینے کا پروگرام مرتب کیا ہے؟“

”کیا میں ایسا سمجھنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتا جناب کرنل صاحب۔“

”دیکھو فرزند..... یہ بات میں نے اسی لئے چھیڑی ہے کہ تم اس طرف سے مطمئن

ہو جاؤ۔ مجھے اعتراف ہے کہ کئی بار میں نے تمہیں ہراول دستے کی حیثیت دی ہے۔ لیکن اس

معاملے میں جتنے لاعلم تم ہو اس سے کہیں زیادہ میں خود ہوں۔ مثال کے طور پر مجھے پہلی بار

معلوم ہوا ہے کہ تمہارا کوئی ماموں بھی تھا۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب اس کے ماموں کی حیثیت زیر بحث آئے اس

لئے وہ ”تین دن کی چھٹی“ پر فریدی کا بھی شکریہ ادا کر کے دفتر سے نکل بھاگا تھا۔

بہر حال اُسے اس مسئلے پر اپنے خاندان والوں سے گفتگو کرنی تھی۔ تین دن کے لئے

شہر چھوڑنا پڑا۔

شاید پورے پانچ سال بعد وہ اپنے خاندان والوں میں پہنچا تھا۔ انہیں حیرت بھی ہوئی

تھی اور مسرت بھی، لیکن جب اس نے اپنے والدین کے سامنے شیر علی خان کا ذکر چھیڑا تو

دونوں گم سم نظر آنے لگے۔

”میں حقیقت معلوم کرنا چاہتا ہوں؟“ حمید نے کہا۔

”آخر تمہیں اچانک اس ذکر کی کیوں سوچھی۔“ باپ بولا۔

”بس یونہی۔“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ اپنی ماں سے پوچھو۔“

ماں نے چپ سادھ رکھی تھی۔ حمید بضد ہوا تو اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

باپ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”شیر علی تمہاری والدہ کا سوتیلا بھائی تھا۔ اس کی ماں

داشتہ نہیں منکوحہ تھی۔ یہ سب کچھ محض اس لئے ہو گیا کہ وہ ایک غریب

شیر علی کی طرف سے کوئی بولنے والا نہیں تھا۔ تمہاری ماں اپنی بڑی بہنوں سے بہت ڈرتی تھیں۔

اس لئے وہ اس معاملے میں داخل اندازی نہ کر سکیں۔“

”آپ کیوں خاموش رہے تھے۔“ حمید کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔

”مجھے ان لوگوں کے خاندانی معاملات سے کوئی سروکار نہ تھا۔“

”لیکن شیر علی خاں کے حصے کی جائیداد سے تو سروکار لازمی ٹھہرا ہوگا۔“ حمید نے طنزیہ

لہجے میں کہا۔

”بکواس مت کرو جو کچھ بھی ہے تمہاری ماں کا ہے۔ میرے پاس میری اپنی جائیداد کم

نہیں تھی۔“ باپ کو بھی غصہ آ گیا۔

حمید نے پھر اس مسئلے پر کوئی گفتگو نہیں کی تھی۔ کسی کو بھی نہ معلوم ہو سکا کہ اس نے شیر

علی خان کا ذکر کیوں چھیڑا تھا۔

وہاں سے واپسی پر وکیل سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔

”مجھے خوشی ہے کیپٹن کہ آپ مطمئن ہو گئے۔“ وکیل نے کاغذات اس کے حوالے

کرتے ہوئے کہا تھا۔

”اب مجھے کیا کرنا ہوگا۔“ حمید نے پوچھا۔

”سعد آباد جائیے..... اور دو ماہ تک وہیں قیام کیجئے۔ آپ وہاں پہنچ کر بے حد خوش

ہوں گے پورے نخلستان پر آپ کو اپنی حکومت نظر آئے گی۔ آپ دیکھیں گے شیر علی خان کیسے

باہمت تھے۔ ریگستان کے اس ٹکڑے کو انہوں نے کس طرح گلزار بنایا تھا۔ دیکھ کر حیرت ہوتی

ہے۔“

”ایک بڑی دشواری ہے۔“ حمید بولا۔

”غالباً آپ یہ کہیں گے کہ سعد آباد کسی ریلوے لائن پر نہیں ہے۔“

”جی ہاں.....!“

”آپ کار سے سفر کر سکتے ہیں۔“

”ہوں..... خیر..... دیکھوں گا۔“ حمید نے کہا تھا اور یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تھا۔ پھر روانگی

تے قبل فریدی نے اس سے کہا تھا ”کسی دن تم سے ملنے ضرور آؤں گا۔“

”میری خواہش تو تھی کہ آپ دو ماہ تک مجھ حقیر پر تقصیر کے مہمان رہتے۔“



اندازہ کر لیا کہ ڈاڑھی مونچھیں اصلی نہیں ہو سکتیں۔ اس نے طویل سانس لے کر جملہ پورا کیا۔  
”لیکن مجھے علم نہیں کہ گاڑی بحفاظت کدھر سے لے جاسکوں گا۔“

”اوہو..... میرے پیچھے آئیے... میں بتاؤں گا۔“ وہ اپنی جیب کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔  
حمید نے جیب کے پیچھے اپنی گاڑی موڑی تھی۔ اب تو وہ اسے نظر انداز کر ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ ڈاڑھی میں بھی اس کی آنکھیں بہت خوبصورت لگی تھیں۔ کچھ دور چل کر جیب دائیں جانب ریت میں اتر گئی اور حمید اپنی گاڑی جیب کے ٹائروں کے نشانات پر چلانے کی کوشش کرتا رہا۔

پھر کھجوروں کے جھنڈ میں داخل ہوتے وقت اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔  
راہبر نے دفعتاً اپنی جیب روک دی۔ وہ ابھی بستی میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ جیب سے اتر کر وہ پھر حمید کے پاس پہنچا۔

”کس کے گھر جائیں گے آپ۔“ اس نے پوچھا۔  
”کسی کے بھی نہیں۔ یہاں سایہ ہے۔ گاڑی میں لیٹ کر سو جاؤں گا۔“  
”جانا کہاں ہے؟“  
”سعد آباد.....!“

”اوہو..... وہاں کس کے پاس جائیں گے۔“  
”کسی خاص آدمی کے پاس نہیں۔ سرکاری کام ہے۔“  
”اوہ تو آپ کس قسم کے سرکاری ہیں۔“  
”زمینوں کا سروے کرتا ہوں۔“  
”آپ یہاں تکلیف اٹھائیں گے جناب..... اچھا چلئے میرے گھر چلئے..... دوپہر وہاں آرام سے گزارئیے گا۔“

”آپ کی تعریف.....!“ حمید نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”فی الحال شاہد فاروقی۔“  
”فی الحال نام ہی کا حصہ ہے؟“ حمید نے حیرت سے پوچھا۔  
”جی نہیں۔“ وہ ہنس پڑا اور پھر بولا۔ ”گھر پہنچ کر شاہدہ فاروقی ہو جاؤں گی۔“

”بہت بہت شکریہ جاگیر دار صاحب! لیکن میں بہت مصروف ہوں۔“ اس وقت سارا باتیں ایک ایک کر کے اسے یاد آ رہی تھیں اور یہ ریگستان اُسے کھائے جا رہا تھا۔ ابھی ایک سے زائد میل طے کرنے تھے۔ دراصل اسے منہ اندھیرے سفر شروع کرنا چاہئے تھا۔ فرما نے بھی یہی مشورہ دیا تھا لیکن وہ دن چڑھے تک سوتا رہ گیا تھا۔  
بہر حال اب اس غلطی کی سزا بھگتنی ہی تھی۔

ہر لمحہ تپش میں اضافہ محسوس ہو رہا تھا۔ پانی کے دو چھوٹے چھوٹے مشینز اب خالی ہو چکے تھے لیکن پیاس تھی کہ کسی طرح بجھنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔  
دو سو تیسویں میل پر بائیں جانب ایک چھوٹا سا نخلستان دکھائی دیا اور حمید نے گاڑی روک دی۔ اس کے اندازے کے مطابق نخلستان کا فاصلہ سڑک سے دو ڈھائی فرلانگ ضرور ہوگا۔

لیکن گاڑی سمیت وہاں تک پہنچنے کی کوشش خطرے سے خالی نہ ہوتی۔ گاڑی سڑک بھی نہیں چھوڑی جاسکتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اگر کسی طرح اس نخلستان میں دن گزار دیا جا۔  
بقیہ ستر میل شام کو بہ آسانی طے کئے جاسکیں گے۔  
دفعتاً ایک جیب سامنے سے آتی دکھائی دی۔ پھر اس کی گاڑی کے قریب پہنچ کر کے بریک چڑ جائے تھے۔

”کیوں! بھائی کوئی پریشانی؟“ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے حمید کو مخاطب نہیں..... شکریہ۔“ حمید نے لاپرواہی سے جواب دیا۔  
لیکن وہ جیب کو آگے بڑھانے کی بجائے اتر کر حمید کے قریب آکھڑا ہوا۔  
”کیا..... ادھر جانے کا ارادہ ہے۔“ اس نے نخلستان کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔  
”ارادہ..... تو تھا..... لیکن.....!“ حمید نے اسے گھورتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔  
آدمی کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔

گھیر دار شلوار اور قمیض پر کوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر بڑی سی پگڑی تھی۔ گھنی ڈاڑھی مونچھوں میں چہرہ نصف سے زیادہ چھپ گیا تھا۔ لیکن آواز؟  
آواز بالکل عورتوں کی سی تھی اور پھر قریب سے دیکھنے پر حمید نے دوسری ہی نظر

چ بولنے والی تھی تو اس میک اپ کا کیا مقصد ہو سکتا تھا۔

حمید کی گاڑی جیپ کے پیچھے چلتی ہوئی ایک پختہ عمارت کے قریب پہنچی جس کے تین اطراف میں دور تک چھوٹے چھوٹے مکان اور جھونپڑے بکھرے ہوئے تھے۔

وہ جیپ سے اتری اور حمید کو گاڑی ہی میں بیٹھے رہنے کا اشارہ کر کے عمارت کے اندر چلی گئی۔ یہ بستی کے سب سے متمول آدمی کی رہائش گاہ معلوم ہوتی تھی۔

کچھ دیر بعد دو آدمی عمارت سے برآمد ہوئے۔ ظاہری حالت سے ملازم ہی معلوم ہوتے تھے۔

”چلئے جناب؟“ ایک بولا۔

”آپ کا سامان جناب۔“ دوسرے نے سوال کیا۔

”سامان کی فکر نہ کرو.....!“ حمید گاڑی سے اترتا ہوا بولا۔ ”چلو۔“

وہ دونوں اسے ایک ایسے کمرے میں لائے جس کی آرائش پر کم از کم پچاس ہزار روپے ضرور صرف ہوئے ہوں گے۔ ملازم بن اسے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ریگستان کی اس جنت کو دیکھتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد ایک خوش لباس ادھیڑ عورت ہاتھوں پر کسی مشروب کی کشتی اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔

مشروب بڑے ادب سے حمید کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ لیکن جب اس نے گلاس ہاتھ میں لیا تو وہ عورت بول پڑی۔

”ٹھہریئے جناب! ابھی نہ پیجئے۔“

حمید نے گلاس میز پر رکھ دیا اور اسے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ عورت اسی صراحی سے دوسرا گلاس لبریز کر کے ایک ہی سانس میں خود پی گئی۔

حمید ہنس پڑا۔

”ہنسی کا سبب جناب عالی!“ عورت نے بڑے ادب سے پوچھا۔

”اس طرح تم مجھے اطمینان دلانا چاہتی تھیں کہ اس مشروب میں کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔“

”جی ہاں! مجھے خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ آپ کو اطمینان دلا دوں۔“

”میں بالکل نہیں سمجھا۔“ حمید نے بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”میں لڑکی ہوں۔“

”اگر لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں تو مجھے ڈوب مرنا چاہئے۔“ حمید نے اس کے چہرے

طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”یہ..... یہ..... تو برقعہ ہے میرا.....!“ اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

حمید خاموشی سے اسے گھورے جا رہا تھا۔ قہقہہ روک کر اس نے کہا۔ ”پردے کا

مقصد تو ہوتا ہے ناک عورت نا محرموں کی ہوس ناک نظروں سے محفوظ رہے۔“

”غالباً.....!“ حمید برا سامنہ بنا کر بولا۔

”غالباً نہیں بلکہ یہ حقیقت ہے..... اتفاقاً آپ کی نظر مجھ پر پڑ جائے تو پڑ جائے

خاص طور پر آپ مجھے دیکھنا گوارہ نہ کریں گے۔“

”میں عرصہ سے کسی ڈاڑھی دار لڑکی کی تلاش میں ہوں۔“

”کیا آپ یہیں کھڑے باتیں بناتے رہیں گے جناب۔“

”تو پھر کیا کروں.....؟“

”میں نے عرض کیا تھا میرے گھر چلئے۔“

”سوال تو یہ ہے کہ آپ میرے سامنے بے پردہ کیوں ہو گئیں؟“

”آپ جیسی صورت والے مجھے محرم ہی لگتے ہیں۔“

”شکر ہے کہ میں اپنا بکرا ساتھ نہیں لایا۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لی۔

”کیا مطلب.....؟“

”مجھے اور زیادہ مغموم ہونا پڑتا..... چلئے..... آپ کا گھر بھی دیکھ لوں۔“

جیپ پھر اشارت ہو کر آگے بڑھ گئی۔ حمید اس کے پیچھے جانے پر مجبور تھا۔ ایسی

لڑکیاں ساری دنیا میں کہیں اور نہ پائی جاتی ہوں گی۔ کسی سازش کا امکان بھی تھا لیکن وہ

ہی کیا جسے غیر معمولی قسم کی لڑکیاں پاگل بنا کر نہ رکھ دیں۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہ دم

ہرگز قبول نہ کرتا۔

یہ بات کتنی عجیب تھی کہ اس نے خود ہی اپنا راز ظاہر بھی کر دیا تھا۔ اگر وہ فطرتاً ایسا



سے مقفل رہی ہے۔ میں اس کا مالک ہوں۔“

## پراسرار وکیل

حمید نے طویل سانس لی اور بولا۔ ”کیا میری گاڑی کے آگے جیب موجود نہیں ہے۔“  
 ”ہے..... ہماری جیب..... لیکن وہ تمہاری گاڑی کے پیچھے ہے۔“  
 ”اوہو..... تو یقیناً کوئی گڑبڑ ہوئی ہے۔ لیکن کیا باہر کسی گاڑی کے اشارت ہونے کی آواز یہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔“  
 ”کیوں نہیں پہنچ سکتی۔“

”اچھی بات ہے تو پھر مجھے باہر جا کر حالات کی نوعیت کو سمجھنا پڑے گا۔“ حمید بولا۔  
 ”ہرگز نہیں۔“ ریوالور والا بولا۔ ”تم یہاں سے ہل بھی نہیں سکتے۔“  
 پھر اس نے پہلے آدمی سے کہا۔ ”آپ اندر جا کر دیکھئے میں اسے سنبھالے ہوں۔“  
 ”تم ٹھیک کہتے ہو.....!“ اس نے سر ہلا کر کہا اور سامنے والے دروازے میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دوسرا آدمی حمید پر ریوالور تانے کھڑا تھا۔

حمید نے اس سے پوچھا۔ ”آپ کی جیب کا میک اور رنگ کیا ہے۔“  
 ”ٹولیوٹا..... گرین۔“

”لیکن اس لڑکی کی جیب خاکی رنگ کی تھی اور ٹولیوٹا بہر حال نہیں تھی۔“  
 ”تم یقیناً ٹھگنوں کے کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہو۔“ ریوالور والا غرایا۔

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پہلا آدمی واپس آ گیا۔ اس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار تھے۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ حمید پر جھپٹ پڑا۔ ساتھ ہی وہ چیخے جا رہا تھا۔ ”اسے پکڑو..... بھاگنے نہ پائے۔ اس نے کسی کو قتل کر دیا ہے۔ لاش اندر پڑی ہے۔“

”لیکن میں اب بھی مطمئن نہیں ہوں۔“ حمید نے اپنے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس گلاس کی تہہ میں پوٹاشیم سائٹانیڈ کے چند ذرے جو پہلے سے موجود رہے ہوں میرا کام تمام کر سکتے ہیں۔“

عورت کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار نظر آئے۔ پھر سنبھالا لے کر بولی۔ ”میں آپ کی اس دشواری کی اطلاع دے کر ابھی حاضر ہوتی ہوں۔“  
 وہ چلی گئی تھی اور حمید میز رکھے ہوئے گلاس کو گھورتا رہا تھا۔  
 دس منٹ گزر گئے لیکن وہ عورت واپس نہ آئی۔ چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔ دفعتاً حمید نے محسوس کیا جیسے اب اس عمارت میں اس کے علاوہ اور کوئی نہ ہو۔ چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اٹھو اور باہر نکل جاؤ۔

پھر وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ بیرونی دروازے سے دو آدمی اندر داخل ہوئے اور اسے دیکھ کر ٹھنک گئے۔ ان میں سے ایک نے جو پہلے آدمی سے کسی قدر پیچھے تھا بڑی پھرتی سے اپنے ہولسر سے ریوالور نکال لیا۔

پہلے آدمی نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ”تم یہاں کیسے داخل ہوئے؟“  
 ”محترم..... محترم.....!“ حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”زیادہ تیزی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ میں یہاں لایا گیا ہوں خود سے نہیں آیا۔“

”کون لایا ہے؟“

”مختہ شاہدہ فاروقی۔“

”بکو اس مت کرو..... تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں۔“

”میں تنہا ہوں..... کیا تم نے میری گاڑی باہر نہیں دیکھی۔“

”تم نے قفل توڑ کر اندر داخل ہونے کی جرأت کیسے کی..... اگر مسافر تھے تو براآمدے

میں بھی ٹھہر سکتے تھے۔“

”میں یہاں لایا گیا ہوں..... اس گھر کی وہ لڑکی لائی ہے جو مردوں کے بھیس میں رہتی

ہے۔ اس نے اپنا نام شاہدہ فاروقی بتایا تھا۔“

”یہاں کوئی لڑکی نہیں ہے۔“ وہ آدمی حمید کو گھورتا ہوا بولا۔ ”اور یہ حویلی پچھلے پندرہ دن

ی لگتی ہے۔“

”ہاں..... میں بھی یہی سوچ رہا تھا؟“ مالک مکان نے حمید کو گھورتے ہوئے کہا۔

”مہ..... میرا خیال ہے کہ ہم ان کی تصویریں دیکھتے رہے ہیں۔“

”اوہو.....!“ مالک مکان اچھل پڑا۔ حمید کو غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔

”بلاشبہ وہی! میں نے پہچان لیا ہے۔“

اس بار اس کے لہجے میں جوش مسرت کی جھلکیاں ملی تھیں۔

”ہوں.....!“ حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا غرایا۔ ”تو میں کون ہوں؟“

”اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ سعد آباد کے شیر علی خان کے بھانجے ہیں۔“

حمید اسے پہلے ہی کے سے انداز میں گھورتا رہا۔

”وہ میرے گہرے دوستوں میں سے تھے۔“ مالک مکان پھر بولا۔ ”میرا نام شمشاد

ہے۔ یہ علاقہ بھی آپ اپنا ہی سمجھتے۔ لیکن میرے خدا یہ سب کیا ہے۔“

حمید نے ریوالور والا ہاتھ نیچے گرا دیا۔

”مہ..... مگر یہ لاش.....!“ دوسرا آدمی ہکلا یا۔

”تم دونوں نے جس طرح مجھے پہچانا ہے اسی طرح اس کو بھی پہچاننے کی کوشش کرو۔“

”بالکل اجنبی..... یقین کیجئے۔“ شمشاد نے کہا۔

”آپ شیر علی خان کے دوست ہوں گے۔ لیکن شاید ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔“

”ان کی حویلی میں شاید ہی کوئی ایسا کمرہ ہو جہاں آپ کی تصویر موجود نہ ہو۔“

”کیا اس حویلی کی نگرانی کے لئے بھی آپ نے کوئی آدمی نہیں رکھا۔“

”قطعاً غیر ضروری ہے۔ یہاں کون ہے، جو ادھر آکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔ میں پورے

ملائے کا مالک ہوں۔“

”کیا یہاں بالکل تنہا رہتے ہیں۔“

”نہیں..... میرا خاندان گرمیاں پہاڑ پر گزارتا ہے۔“

”آپ ان دنوں کہاں تھے؟“

”سعد آباد میں..... وہاں بھی میرا ایک مکان ہے۔“

ریوالور والے نے ریوالور صوفے پر ڈال دیا اور خود بھی حمید سے لپٹ پڑا۔

وہ دونوں شاید لڑاکے نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اس لئے حمید بہ آسانی ان کی گرفت سے

نکل گیا اور پھر قبل اس کے کہ ان میں سے کوئی صوفے پر پڑے ہوئے ریوالور کو اٹھا سکتا

نے اس پر قبضہ کر لیا۔

”جہاں ہو وہیں ٹھہرو۔“ حمید نے انہیں کور کرتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

دونوں نے ہاتھ اٹھا دیئے۔

”اب بتاؤ کسی کی لاش کہاں پڑی ہے۔“

دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بولا۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”چلو..... مجھے دکھاؤ لاش کہاں ہے۔“ حمید نے ریوالور کو جنبش دے کر کہا۔ ”دروازہ

کی طرف مڑو اور چل پڑو۔“

”انہوں نے بے چون و چرا تعمیل کی تھی۔“

کئی کمروں سے گزرنے کے بعد وہ کچن میں پہنچے اور یہاں سچ مچ ایک لاش پڑی

آئی۔ کئی ہوئی گردن سے خون بہہ بہہ کر چاروں طرف پھیل گیا تھا۔

”یہ کون ہے؟“ حمید نے انہیں گھور کر پوچھا۔

”تم بتاؤ..... ہم تو نہیں جانتے لیکن آخر اس کھیل کے لئے میرا گھر کیوں منتخب کیا گیا

میں تو تمہیں بھی نہیں جانتا۔“

مقتول ایک کیم شیم آدمی تھا۔ عمر چالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ لباس

ذی حیثیت معلوم ہوتا تھا۔

حمید نے لاش سے نظر ہٹا کر مالک مکان کی طرف دیکھا۔

”کھیل سے کیا مراد ہے؟“ اس نے چہیتے ہوئے لہجہ میں سوال کیا۔

”پھر یہ کیا ہے؟ پندرہ دن سے حویلی مقفل تھی۔ میں یہاں نہیں تھا۔“

”تم کہاں تھے؟“

”تم آخر ہو کون؟“ مالک مکان کو پھر غصہ آ گیا۔

دفعاً دوسرا آدمی بولا۔ ”صاحب! ذرا انہیں غور سے دیکھئے..... صورت کچھ جانی پہچانی

حمید ان دونوں کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ لہذا اُن میں سے کسی کو عمارت ہی میں چھوڑنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے انہیں بھی عقبی دروازے سے باہر نکال لے گیا۔ عمارت کی پشت پر حد نظر تک ویرانی ہی ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ دفعتاً شمشاد کا ساتھی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”وہ رہے گاڑی کے نشانات، ادھر کوئی گاڑی آئی۔“

”ہم دیکھیں گے..... ضرور دیکھیں گے۔“ شمشاد مضطربانہ لہجے میں بولا۔

”واپس چلے۔“ حمید نے سپاٹ آواز میں کہا۔

وہ پھر اندر آئے اور نشست کے کمرے سے گزرتے ہوئے برآمدے میں پہنچے۔ حمید کی گاڑی جہاں تھی وہیں نظر آئی اور اسکے پیچھے والی جیب بہر حال پہلی جیب سے مختلف تھی۔ گاڑیوں کے قریب پہنچ کر حمید نے کہا۔ ”جیب یہاں سے اشارت کئے بغیر عمارت کی پشت پر بے جا لگی ہوگی، ورنہ میں آواز ضرور سنتا۔“

”جی ہاں..... یہی ہو سکتا ہے۔“ شمشاد پر نظر لہجے میں بولا۔

جیب کے نشانات پر چلتے ہوئے ایک بار پھر وہ عمارت کی پشت پر پہنچ گئے۔

حمید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ یہ دونوں بھی اس کے لئے اجنبی تھے۔ عمارت کے اندر ایک لاش موجود تھی اور فرار ہو جانے والوں کی جیب کے نشانات بار بار دعوت عمل دے رہے تھے۔ خود شمشاد نے کچھ دیر پہلے جیب کے نشانات پر دوڑ لگانے کی تجویز پیش کی تھی لیکن کیا یہ مناسب ہوتا کہ وہ اُس لاش کو دو مشتبہ آدمیوں کی تحویل میں دے کر خود اُس لڑکی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ وہ سوچتا رہا اور پھر یہ فیصلہ کیا کہ شمشاد کو اپنے ساتھ رکھے اور دوسرے آدمی پر لاش کی نگرانی کی ذمہ داری عائد کر کے وہیں چھوڑ جائے۔ کچھ دیر بعد شمشاد اس کے برابر بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”نشانات ابھی واضح نظر آ رہے ہیں لیکن کچھ دیر بعد یہ اڑانے والی ریت میں دفن ہو جائیں گے۔“

”ہو سکتا ہے..... کچھ دور چلتے کے بعد ہی سلسلہ منقطع ہو جائے۔“

”جی ہاں یہ بھی ممکن ہے..... لیکن.....“ آفتا ہوں کہ اس طرف جانے والے کہاں تک جاسکتے ہیں۔“

حمید تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر انہیں اپنے یہاں تک پہنچنے کا واقعہ بالتفصیل ہوئے کہا۔ ”مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ عورت ہی تھی۔“

”آپ تو مجھے الف لیلا کی کوئی داستان سنا رہے ہیں جناب۔“ شمشاد نے اسے اعتباری سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ مجھے کوئی غیر ذمہ دار آدمی سمجھتے ہیں۔“ حمید نے اسے پھر گھور کر دیکھا۔

”تو پھر کیا کہوں اس کہانی پر۔“

”آپ اپنے بچاؤ کی فکر کیجئے جناب۔“ حمید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ کہانی آ جی بہلانے کے لئے نہیں سنائی گئی تھی۔ آپ کو اس لاش کے سلسلے میں جواب دی کرنی ایک ذمہ دار پولیس آفیسر کو دھوکے سے لایا گیا تھا۔“

”کک..... کون..... پولیس آفیسر.....!“ شمشاد ہلکایا۔

حمید نے اپنا دزینگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

کارڈ پر نظر پڑتے ہی شمشاد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے حمید کی دیکھا اور تھوک نکل کر رہ گیا۔

”تب تو..... کیا آپ شیر علی خاں کے بھانجے نہیں ہیں۔“

”میں نے اس سے کب انکار کیا ہے؟“

”میرے خدا.....؟“ وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ”میری مشکل حل ہو گئی۔“

”آپ کا بھانجا نہیں ہوں۔“ حمید نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے سنا

میں کہا۔

”آپ غلط سمجھے..... میں آپ سے کسی رعایت کا طلب گار نہیں۔ جو کارروم چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن اب میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ شیر علی مرحوم حالات میں نہیں مرے اور شاید میں بھی ایسے ہی حالات کا شکار ہونے والا ہوں۔“

حمید نے دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”میں پوری عمارت کا جائزہ لینا چاہتا ہوں

”ضرور..... ضرور.....!“ شمشاد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اس میں پندرہ منٹ صرف ہوئے تھے اور عمارت کا عقبی دروازہ کھلا ہوا ملا تھا۔

شمشاد نے کہا۔ ”اس کے علاوہ دور دور تک ریگزار کے علاوہ اور کچھ نہیں۔“

”جو لوگ اتنے چالاک ہوں وہ اس طرح اپنا سراغ نہیں چھوڑیں گے کہ آپ ان تک جاسانی پہنچ سکیں۔ ہو سکتا ہے..... یہاں سے وہ پھر پختہ سڑک کی طرف مڑ گئے ہوں۔“

”اوہ..... میں نے تو اس پر غور ہی نہیں کیا تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ ہمیں اس بھاگ دور سے باز رہنا چاہئے..... ویسے اس علاقہ کا پولیس اسٹیشن کہاں ہے۔“

”اس کے لئے ہمیں سڑک ہی کی طرف واپس چلنا پڑے گا۔ جہاں سے آپ بستی کی طرف مڑے ہوں گے وہاں سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔“

”سعد آباد کی سمت۔“

”جی ہاں۔“

جیپ وہاں سے پھر واپس ہوئی تھی۔ شمشاد کی حویلی کے قریب پہنچے تو اس کے ایک حصے سے دھوئیں کے کثیف مرغولے اٹھتے ہوئے دکھائی دیتے۔

”ارے..... یہ..... کیا ہوا.....!“ شمشاد کہتا ہوا جیپ سے کودا اور عمارت کی طرف دوڑنے لگا۔

عمارت کے گرد بستی کے لوگ جمع تھے۔ شمشاد اور حمید آگے پیچھے عمارت کے اندر داخل ہوئے۔ کچن میں جہاں انہوں نے لاش دیکھی تھی آگ لگی نظر آئی۔ بستی کے لوگ بالٹیوں میں پانی لئے آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

کچن کے سامنے شمشاد کا ساتھی فرش پر اوندھا پڑا تھا۔ شمشاد اس کی طرف جھپٹا۔

”عادل خان..... عادل خان.....!“ وہ اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر آواز دے رہا تھا۔

عادل خان پر بے ہوشی طاری تھی اور بے ہوشی کا سبب غالباً سر کی چوٹ بنی تھی جس سے خون بہہ بہہ کر فرش پر پھیل گیا تھا۔

بستی والوں سے صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ انہوں نے عمارت سے اچانک دھواں اٹھتے دیکھا تھا اور ابھر دوڑ آئے تھے۔ عادل خان انہیں اسی حالت میں بے ہوش پڑا ملا تھا۔

حمید نے پٹرول کی بوتل پہلے ہی محسوس کر لی تھی اور دوڑ کر اپنی گاڑی کی طرف گیا تھا اور

”آپ نے کہا تھا کہ شیر علی خان صاحب کی موت معمولی حالات میں نہیں ہوئی کا کیا مطلب تھا۔“

”میں دراصل اسی لئے ایک ہفتے سے سعد آباد میں مقیم تھا کہ حقیقت معلوم کر سکوں میرا خیال ہے کہ انہیں اپنی موت کا علم پہلے سے ہو گیا تھا۔“

”آخر کس بناء پر آپ نے یہ رائے قائم کی ہے۔“

”جس وقت انہوں نے آپ کے حق میں وصیت نامہ مرتب کیا تھا۔ میں بھی موجود تھا وصیت نامہ مرتب کرنے کے تین دن بعد مجھے اطلاع ملی کہ ان کا انتقال ہو گیا۔ تکفین میں میری شرکت نہیں ہو سکی تھی۔“

”کیا وہ بیمار تھے۔“

”ہرگز نہیں..... کسی مستقل مرض میں بھی مبتلا نہیں تھے۔“

”کیا انہوں نے کبھی زندگی سے مایوسی کا بھی اظہار کیا تھا۔“

”کبھی نہیں! بے حد زندہ دل آدمی تھے۔ کسی کو مغموں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لیکن آپ پر تو غور کیجئے کہ کوئی تندرست آدمی اچانک وصیت نامہ مرتب کرنے بیٹھے اور تین دن مر جائے۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ جیپ آگے بڑھتی رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔ ”اپنے وکیل عزیز سے ان کے تعلقات محض کاروباری تھے یا کچھ اور بھی۔“

”دونوں بہت اچھے دوست بھی تھے۔“ شمشاد نے جواب دیا۔

”چودھری صاحب کی تجہیز و تکفین میں کن لوگوں نے حصہ لیا تھا۔ کیا شاہد عزیز اس وقت۔“

”اس سلسلے میں آپ پوری معلومات چودھری صاحب کے خصوصی ملازم دلاوا حاصل کر سکیں گے۔“

حمید نے دفعتاً جیپ روک دی چونکہ یہاں دوسری گاڑی کے نشانات معدوم ہو گئے تھے۔

”چلتے رہے..... ان اطراف میں صرف ایک جگہ ایسی ہے جہاں وہ جا سکتے ہیں۔“

ان کا وارث کوئی پولیس آفیسر ہے۔“

”اسی لئے میں سچی بات جاننا چاہتا ہوں۔“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”جو کچھ میں پہلے کہہ چکا ہوں اس کے علاوہ اور کوئی بات میرے علم میں نہیں ہے۔“

”کوئی اور ایسا فرد جو ان کے ترکے کا دعویٰ دار ہو سکے۔“

”جی نہیں! مجھ سے تو وہ صرف اپنے ایک بھانجے ساجد حمید کا ذکر کیا کرتے تھے۔“

”ہوں! لیکن اب سوال یہ ہے.....!“ فریدی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی آنکھوں

میں پل بھر کے لئے عجیب سی چمک نظر آئی تھی اور وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”ایڈوکیٹ..... شاہد عزیز۔“ اس نے حمید کی طرف دیکھ کر کہا۔ پھر شمشاد سے بولا۔

”آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔“

”ضرور..... ضرور..... وہ مجھ سے بخوبی واقف ہے۔“

کچھ دیر بعد فریدی کی لنگن اسی عمارت کے سامنے رکی جس میں وکیل کا فلیٹ تھا۔

حمید کی رہنمائی میں وہ فلیٹ نمبر بیالیس تک پہنچے جو تیسری منزل پر واقع تھا۔

حمید ہی نے کال بل کا بٹن دبایا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے دباتا ہی رہا۔ لیکن دروازہ

نہ کھلا۔ فریدی کی نظر رسٹ واچ پر تھی۔ دو منٹ گزر جانے کے بعد اس نے برابر والے فلیٹ

کی کال بل کا بٹن دبایا۔

دروازہ کھلنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

”فرمائیے جناب!“ بوڑھے آدمی نے فریدی کو نیچے سے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ایک پولیس آفیسر ہوں۔“

”اوہ..... تو پھر جناب۔“ بوڑھا کچھ زور سے سانپڑ آنے لگا تھا۔

”برابر والے فلیٹ کی گھنٹی دیر سے بجائی جا رہی ہے لیکن جواب نہیں ملتا۔“

”تو پھر میں..... میں اس سلسلے میں کیا کر سکوں گا جناب۔“

”آپ کی موجودگی میں ہم اندر داخل ہونا چاہتے ہیں۔“

”کک..... کوئی کڑبڑ..... جناب۔“

”ضروری نہیں ہے۔“

اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ فالتو پٹرول کے ٹن غائب ہیں۔ ٹائروں کی ہوا بھی کسی نے نکال دی تھی۔

بہر حال آگ پر قابو پالنے جانے کے بعد حمید کچن میں داخل ہوا۔ لاش مسخ ہو کر ناقابل شناخت ہو چکی تھی۔ آگ لگانے کا مقصد بھی شاید یہی تھا کہ لاش جل کر شناخت کے قابل رہے۔

عادل خان ہوش میں آنے کے بعد یہ نہ بتا سکا کہ اس پر پیچھے سے کس نے حملہ کیا تھا چار بجے کے قریب حمید اس علاقے کے پولیس اسٹیشن سے رابطہ قائم کر سکا تھا۔

اس نے اپنی رپورٹ درج کرائی اور شمشاد سمیت اس کی جیب سے شہر کی طرف ہو گیا۔ عمارت اور اپنی گاڑی کی نگرانی کے لئے دو مسلح سپاہی متعین کرادیئے تھے۔

شہر پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ فریدی گھر ہی پر موجود تھا۔ حمید کی واپسی پر اس نے حے ظاہر کی تھی، لیکن جب اس کی کہانی سنی تو طویل سانس لے کر بولا۔ ”تمہارا مقدر.....!“

اور پھر شمشاد کو گھورنے لگا تھا۔ شمشاد گڑبڑا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”سچی بات..... شمشاد صاحب؟“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”مم..... میں نے جو کچھ بتایا ہے..... اس میں شہہ برابر بھی جھوٹ نہیں۔“

”اچھا تو پھر سعد آباد میں اپنی مصروفیات کے بارے میں بتائیے۔“

”کک..... کچھ بھی نہیں۔ بس اتنی سی بات ہے کہ میں شیر علی مرحوم کے بارے

لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔“

”وجہ.....؟“

”پہلے ہی بتا چکا ہوں..... قدرتی بات ہے کوئی اچھا بھلا شخص وصیت نامہ مرتب کر کے تین دن بعد مر جائے تو..... کیا کہیں گے۔“

”اوہو..... آپ غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جس کے حق میں وصیت نامہ مرتب کیا گیا اس نے جلد از جلد جائیداد حاصل کرنے کے لئے۔“

”نہن..... جناب۔“ شمشاد نے ہاتھ اٹھا کر احتجاج کیا۔ ”میں ت..... تصور نہیں کر سکتا.....! ہرگز نہیں..... خدا کی پناہ..... شیر علی مرحوم نے کبھی یہ بات ظاہر نہیں کی تھی

ایڈووکیٹ شاہد عزیز ظاہر کیا تھا۔ شاید اس کی موت دم گھٹنے کی وجہ سے واقع ہوئی تھی۔ چہرے پر ایسے آثار پائے جاتے تھے۔

دفتر حمید نے بوڑھے سے پوچھا۔ ”شاہد عزیز..... اس فلیٹ میں کس سے مقیم تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ پچھلے چھ ماہ سے۔“

”اس آدمی کو آپ نے پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا۔“ حمید نے لاش کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”اپنی یادداشت میں تو کبھی نہیں۔ آخر وکیل صاحب گئے کہاں! ان سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔“

اتنے میں فریدی واپس آ گیا۔

”یہاں کہیں فون بھی ہے؟“ اس نے بوڑھے سے پوچھا۔

”فون ہے تو یہاں..... غالباً آپ بیدروم ہی میں تھے۔“

”فی الحال یہاں کا فون استعمال نہیں کیا جاسکتا۔“

”تو پھر میرے فلیٹ میں تشریف لے چلے۔“

فریدی اس کے ساتھ چلا گیا۔ حمید اور شمشاد تنہا رہ گئے۔

”آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے کپتان صاحب۔“ شمشاد نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کیا آپ مجھے شاہد عزیز کا حلیہ بتائیں گے۔“ حمید خود سوال کر بیٹھا۔

”حلیہ..... حلیہ..... کھڑا کھڑا نقشہ..... خوبصورت سی سیاہ ڈاڑھی..... ریم لیس فریم کی

عینک لگاتا ہے۔ خوش لباس آدمی ہے..... جامہ زمینی میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتا..... لیکن.....

یہ آدمی..... کک..... کیا..... میرا مطلب یہ ہے کہ آپ دونوں کی گفتگو سے میں نے اندازہ

لگایا ہے کہ شاید یہ آدمی۔“

”غیر ضروری باتیں نہیں۔“ حمید نے ہاتھ اٹھا کر خشک لہجے میں کہا۔

شمشاد کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نظر آئے اور وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

پھر کچھ دیر بعد محکمہ سرانصرسانی کے مختلف شعبوں کے ماہرین وہاں پہنچ گئے تھے اور لاش

سے متعلق ضروری کارروائی شروع ہو گئی تھی۔

حمید فریدی کے ساتھ دوسرے کمرے میں آیا۔ یہاں ایک بڑی مسہری، دو کرسیوں،

لیکن جب وہ اندر پہنچے تو گڑبڑ ہی نظر آئی۔ دروازہ اندر سے بولٹ نہیں کیا

بندل گھماتے ہی کھل گیا تھا۔

سامنے فرش پر ایک آدمی اونڈھا پڑا دکھائی دیا۔ شب خوابی کا لباس اور گاؤن جسم پر

”اوہ.....!“ حمید تیزی سے آگے بڑھا۔

”ٹھہر.....!“ فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا اور خود آگے بڑھ کر اس پر جھک پڑا۔

اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ دروازے کے قریب سے اسے شناخت نہیں کیا

۔ دفعتاً فریدی نے مڑ کر حمید کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”اوہ.....!“ حمید چہرے پر نظر پڑتے ہی ہلکے ہلکے ہنسنے لگا۔

”یہی ہے.....؟“ فریدی نے پوچھا۔ حمید نے سر کو اثباتی جنبش دی۔

”مرچکا ہے؟“ فریدی نے دوسروں کی طرف مڑ کر کہا۔

”کک..... کون ہے؟“ شمشاد نے تھوک نگل کر پوچھا۔

”شاہد عزیز.....!“

پڑوسی اور شمشاد دونوں ہی تیزی سے آگے بڑھے تھے۔ حمید نے دونوں کی آ

میں حیرت کے آثار دیکھے۔

دفعتاً شمشاد نے کہا۔ ”یہ شاہد عزیز نہیں ہے۔“

”کیا.....؟“ حمید سیدھا ہو کر اسے گھورنے لگا۔

”جی ہاں۔ یہ وکیل صاحب نہیں ہیں۔“ بوڑھے پڑوسی نے کپکپاتی ہوئی آواز میں

اب فریدی اور حمید ایک دوسرے کو گھورے جارہے تھے۔

”یہ..... یہ..... ڈی آئی جی صاحب بھی.....!“ حمید بات پوری نہیں کر پایا تھا کہ

نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”پھر یہ کون ہے.....!“ فریدی بوڑھے کی طرف مڑا۔

بوڑھے نے لاعلمی ظاہر کی۔

فریدی نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور انہیں وہیں چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلا

حمید اس شخص کی لاش کو گھورے جارہا تھا جس نے ڈی آئی جی کے سامنے بھی



## دوسری ڈاڑھی

وہ مصنوعی ڈاڑھی لاش کے نیچے دبی ہوئی ملی تھی۔ اس اطلاع پر حمید نے معنی خیز نظروں سے فریدی کی طرف دیکھا۔

فریدی نے ڈاڑھی اپنے ماتحت کے ہاتھ سے لے لی تھی اور اُسے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ ڈاڑھی سے پلاسٹک کا خول بھی منسلک نظر آیا جس کی بناوٹ ناک کی سی تھی۔  
”کیا لاش اس جگہ سے اٹھالی گئی.....!“ فریدی نے ماتحت کو گھورتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

”جی ہاں..... اسٹریچر پر رکھ دی گئی ہے۔“

”تم نے اسے اٹھایا کیوں؟“ فریدی نے ڈاڑھی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”مجھے صرف اطلاع دینی تھی۔“

”غغ..... غلطی ہوگئی جناب۔“ ماتحت اس غیر متوقع سوال پر بوکھلا گیا۔

”فرش پر لاش کی آؤٹ لائن بنادی گئی ہے یا نہیں۔“

”بنادی گئی ہے جناب۔“

فریدی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ لاش ابھی کمرے ہی میں موجود تھی۔ اسٹریچر باہر نہیں لے جایا گیا تھا۔

فرش پر لاش کی جگہ سفید چاک سے اس کی آؤٹ لائن بنائی گئی تھی۔ فریدی نے نقلی ڈاڑھی کو اسی ماتحت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اسے پھر اسی جگہ ڈال دو جہاں سے اٹھائی گئی تھی۔“

ماتحت نے فوراً تعمیل کی۔ ڈاڑھی لاش کی آؤٹ لائن کے وسط میں رکھ دی گئی تھی۔ فریدی کبھی ڈاڑھی کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی اسٹریچر پر رکھی ہوئی لاش کی طرف۔

”کیا خیال ہے.....!“ حمید آہستہ سے بولا۔ ”جھگڑے کے دوران میں ڈاڑھی نکل گئی اور وہ جلدی میں اسے ساتھ نہ لے جاسکا۔“

ایک چھوٹی میز اور ایک بک شیلف کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

حمید کتابوں کی الماری کے قریب جا کھڑا ہوا اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس قانون کی ایک بھی کتاب نہیں تھی۔

دفعہ اس نے فریدی کو کہتے سنا۔ ”غالباً تم قانون کی کوئی کتاب تلاش کر رہے ہو۔“

”قدرتی بات ہے.....!“ حمید نے جواب دیا۔

فریدی پھر کچھ نہیں بولا تھا۔

حمید الماری کا جائزہ لیتے لیتے دفعتاً چوک پڑا اور مڑ کر فریدی کی طرف دیکھا جو بستر جھکا ہوا کچھ دیکھ رہا تھا۔ حمید الماری کے پاس سے ہٹ کر اس کے قریب پہنچا۔

”ہوں!“ فریدی بدستور جھکا ہوا بولا۔ ”کچھ کتابیں الماری میں الٹی بھی لگی ہوئی ہیں۔“

”جی ہاں..... میں یہی بتانا چاہتا تھا۔“

فریدی سیدھا کھڑا ہو کر چند لمحوں کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ”کہیں انتشار کے آثار نہیں ملتے..... پھر بھی قتل کے بعد یہاں کوئی چیز ضرور تلاش کی گئی ہے۔ الماری میں الٹی کتابیں جلد بازی کا نتیجہ ہیں کیوں نہ تم الماری دوبارہ خالی کر دو۔“

”یعنی کتابیں فرش پر ڈال دوں۔“

”ہاں.....!“

حمید نے اس مشورے پر عمل کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ کتابیں شیلف سے نکال کر ڈھیر کرتا رہا۔ اس دوران میں فریدی نے بستر الٹ دیا تھا اور گدے کے نیچے برآمد ہونے والی کسی چیز کو بہت غور سے دیکھے جا رہا تھا۔

شیلف بھی خالی ہوگئی۔ اس میں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ فریدی نے جو چیز بستر کے سے اٹھائی تھی حمید کے قریب پہنچنے سے قبل ہی جیب میں ڈال لی اور شیلف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ”کچھ بھی نہیں ہے؟“ حمید نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

فریدی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دوسرے کمرے سے عجیب سی آوازیں آئیں اور فریدی کا ایک ماتحت تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کی مصنوعی ڈاڑھی تھی۔

”کون ساتھ نہ لے جاسکا؟“ فریدی نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”قاتل.....!“

”ہونہہ..... یہ ڈاڑھی اس لاش کے علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔“ اس نے کہا اور ڈاڑھی کو فرش سے اٹھا کر قریب پہنچا اور پلاسٹک کا خول اس کی ناک پر جماتے ہوئے ڈاڑھی کے دونوں گوشے کینیوں تک لے گیا۔ پھر حمید کی بطونپ مڑ کر بولا۔ ”شمشاد اور بوڑھے پڑوسی کو بلاؤ۔“

وہ دونوں اندر لائے گئے اور جیسے ہی لاش پر ان کی نظریں پڑیں بیک وقت ان کی زبانوں سے ”ارے“ نکلا۔

”وکیل صاحب۔“ بوڑھا تھوک نگل کر بولا اور شمشاد نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چاؤ ڈھانپ لیا۔

”ہوں..... کیا بات ہے؟“ حمید نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نرم لہجے میں سوال کیا

”مم..... میرا سر پکھرا رہا ہے..... جناب.....!“ شمشاد بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

فریدی نے حمید کو اشارہ کیا کہ فی الحال خاموش رہے۔

کچھ دیر بعد لاش وہاں سے ہٹا دی گئی۔ پھر وہاں ان چاروں کے علاوہ اور کوئی نہ گیا۔ شمشاد اور بوڑھے پڑوسی کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا چچ ڈاڑھی کی دریافت کے بعد ہی انہیں پہلی بار احساس ہوا ہو کہ کوئی مار ڈالا گیا ہے۔

فریدی نے پڑوسی کو متوجہ کر کے پوچھا۔ ”شاہد عزیز سے آپ کے تعلقات کیسے تھے؟“

”اچھے ہی تھے جناب۔ وہ خوش اخلاق اور نرم مزاج آدمی تھے لیکن سمجھ میں نہیں آتا۔“

نقلی ڈاڑھی..... بھلا اس کی کیا ضرورت تھی۔“

”کیا آپ نے کبھی انہیں کسی کورٹ میں بھی دیکھا تھا۔“

”جی نہیں..... اس کا اتفاق کبھی نہیں ہوا۔“

”ان کے سوا کبھی یہاں بھی آتے رہتے ہوں گے۔“

”اس کے بارے میں بھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکوں گا۔“

پھر فریدی نے بوڑھے کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ آپ کو پھر تکلیف دے

جائے۔“

”میں ہر وقت حاضر ہوں جناب۔“

شمشاد کے چہرے کی زردی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس طرح سر جھکائے بیٹھا تھا جیسے اس

عشاق کی بناء پر اسے گہرا صدمہ پہنچا ہو۔

فریدی کے اشارے پر حمید نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔

کچھ دیر بعد وہ فریدی کے سنگ روم میں ایک آرام کرسی پر نیم دراز بھرائی ہوئی نحیف

آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ شاہد عزیز کی ڈاڑھی نقلی ہوگی..... آخر

..... یہ سب کیا ہے..... میری عقل کام نہیں کرتی اگر اس نے کسی قسم کا فراڈ کیا تھا تو خود اسے

کس نے مار ڈالا۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ کے علاوہ اور کوئی اس پر روشنی نہ ڈال سکے گا؟“ فریدی نے

اسے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

”مم..... میں..... یقین کیجئے۔“

”پلیز..... شمشاد صاحب۔“ حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں آپ کو یہاں اسی لئے لایا

ہوں کہ آپ کزنل صاحب سے کسی قسم کی بھی غلط بیانی نہ کر سکیں..... آپ میرے ماموں

صاحب کے دوست ہیں ورنہ حقیقت تو میں ہی آپ سے اگلو لیتا۔“

”مم..... میں دل کا مریض ہوں..... آپ لوگ مجھ پر رحم کیجئے۔“

”مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ حمید اسے گھورتا ہوا بولا۔ ”یاد کیجئے اپنا جملہ۔ آپ نے کہا

تھا کہ اب میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شیر علی مرحوم معمولی حالات کے تحت نہیں مرنے

اور شانہ میں بھی ایسے ہی حالات کا شکار ہونے والا ہوں۔“

شمشاد تھوک نگل کر رہ گیا پھر کھولی آواز میں بولا۔ ”مجھے تو نہیں یاد پڑتا کہ میں نے

ایسی کوئی بات کہی ہو۔“

”مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ حمید نے سخت لہجے میں کہا۔

”بس ختم کرو۔“ دفعتاً فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”شمشاد صاحب اگر آپ زیادہ تکلیف

محسوس کر رہے ہوں تو میں ڈاکٹر کو طلب کروں۔“

”نن..... نہیں جناب..... آپ مجھے میری قیام گاہ پر بھجوادیتجئے۔“

”کیا یہاں بھی آپ کی کوئی قیام گاہ موجود ہے۔“

”جی ہاں..... موڈل کالونی میں شمشاد والا۔“

”اوہ..... اچھا..... حمید..... تم ہی جاؤ۔“

دن بھر کی تھکن کے بعد اب حمید کی حالت اس قابل نہیں تھی کہ اخلاقاً بھی کسی کوئی ڈیوٹی برداشت کر سکتا۔ لیکن وہ اچھی طرح جانتا تھا فریدی خود اسے کیوں زحمت دے گا۔ یہ کام تو اس کا ذرا بیور بھی بخوبی انجام دے سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ فریدی شمشاد کی طرف سے مطمئن نہیں ہے۔

شمشاد کی جیب وہیں رہ گئی تھی اور حمید اسے فریدی کی لٹکن میں بٹھا کر موڈل کالونی طرف روانہ ہو گیا تھا۔

شمشاد کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ کہیں آپ لوگوں ہی ان سب وارداتوں کا ذمہ دار تو نہیں سمجھ رہے؟“

”کیا ہم اس حد تک جاسکتے ہیں؟“ حمید نے سوال کیا۔

”حالات کے تحت اس کا امکان ہے۔“

”لیکن آپ حقیقتاً بالکل معصوم ہیں..... کیوں؟“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں؟ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے سلسلے میں کوئی ثبوت نہیں رکھتا۔“

”کہہ بھی چکے کسی صورت سے۔ اس کا فیصلہ ہم پر چھوڑ دیجئے کہ ہم اس پر یقین یا نہ کریں۔“

”ہم سب کسی سازش کا شکار ہوئے ہیں۔“

”ہرگز نہیں..... ہم تو ابھی ابھی کسی نائٹ کلب میں جشن منا رہے تھے۔“

”میں سنجیدگی سے گفتگو کر رہا ہوں کپتان صاحب۔“ شمشاد نے ناخوشگوار لہجے میں ”میں آپ کو غیر ضروری الفاظ کے استعمال سے باز رکھنا چاہتا ہوں..... اگر آپ بتانے جا رہے ہیں تو اب اس کیلئے تمہید ضروری نہیں۔ صبح سے تمہید ہی تمہید تو چل رہی ہے۔“

”میری دشواری یہ ہے کہ خود بھی ایک غیر قانونی حرکت کا مرتکب ہو چکا ہوں۔ قانون

نے مجھے فظوں کو اس کا علم نہیں۔ لیکن وہ لوگ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

”پھر تمہید.....!“ حمید بھنا کر بولا۔ ”اب مجھ پر رحم کیجئے ورنہ میں ماموں کا دوست ہونا

زقانونی قرار دلا دوں گا۔“

”م..... میں نے شیر علی خان مرحوم کی قبر کھودنے کی کوشش کی تھی۔ اسی رات سے کچھ

معلوم لوگ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

حمید نے طویل سانس لی اور گاڑی کی رفتار کم کر کے اسے بالآخر سڑک کے کنارے

رک دیا۔

”کک..... کیوں؟“

”پیارے شمشاد ماموں..... آخر آپ نے اتنی اہم بات اب تک کیوں چھپائے رکھی تھی۔“

”اس شخص کے سامنے میری گھگھی بندھ جاتی ہے۔ وہ جو تمہارا آفیسر ہے..... کیا نام

ہے اس کا۔“

”کرنل فریدی۔“

”ہاں..... ہاں..... اسکی آنکھیں مجھے اپنی ہڈیوں میں پیوست ہوتی محسوس ہونے لگتی تھیں۔“

”مجھے بتا دیا ہوتا۔“ حمید نرم لہجے میں بولا۔ ”اب میں اسے مناسب نہیں سمجھتا کہ آپ

لو کہیں تنہا چھوڑ دوں۔“

”کک..... کیا مطلب؟“

”آپ ہمارے ساتھ ہی قیام کریں گے۔“

”م..... میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ لیکن جو کچھ پوچھنا ہے آپ ہی پوچھ لیجئے.....“

”میں کرنل فریدی سے گفتگو نہیں کر سکتا۔“

”اچھی بات ہے..... تو پھر پہلے ہم آپ کی مقامی قیام گاہ پر چلتے ہیں۔“

”مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہاں بھی کوئی پریشان کن وقوعہ پہلے ہی سے میرا منتظر نہ ہو.....“

”خدا آج کا دن کتنا منحوس تھا۔“

”ہو سکتا ہے..... تو پھر ہم کہاں چلیں۔“

”کیا مطلب.....؟“ حمید اچھل پڑا۔

”ہاں..... میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ قبر میں لاش ہے بھی یا نہیں۔“

”خدا کی پناہ..... کتنی دیر بعد آپ نے اصلیت ظاہر کی ہے۔ کیا میں اس کی وجہ پوچھ

سکتا ہوں۔“

”جو کچھ بھی میں نے کہا ہے اس کے لئے کوئی واضح ثبوت نہیں رکھتا۔ اسی لئے زبان

سے نہیں نکال رہا تھا۔“

”کوئی شبہ بے بنیاد نہیں ہوتا۔ لہذا میں شبہ کی وجہ جاننا چاہوں گا۔“

”چودھری صاحب بے حد ہراسہ راتھے۔ ان کے بارے میں کبھی کوئی کچھ نہ جان سکا۔

آپ اپنی ہی بات لے لیجئے۔ انہوں نے کسی کو نہیں بتایا کہ آپ کا عہدہ کیا ہے۔ نہ یہی بتایا

کہ آپ ان سے ملنے کے لئے سعد آباد کیوں نہیں گئے!“

”یہ ذاتی نوعیت کے معاملات ہیں۔“ حمید نے خشک لہجے میں کہا۔

”بہر حال میں انہیں پچھلے دو ماہ سے بہت زیادہ پریشان دیکھتا رہا تھا۔“

”یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں جس کے لئے آپ قبر کھودنے بیٹھ جائیں۔“

”یہ بات بھی ذہن نشین کر لیجئے کہ اپنے دوستوں میں سب سے زیادہ اعتماد مجھ پر

کرتے تھے۔“

”آہا.....!“ حمید جھنجھلا کر بولا۔ ”انہوں نے خود ہی آپ کو مشورہ دیا تھا کہ قبر کھود کر

دیکھ لینا کہ میں موجود ہوں یا نہیں۔“

”مم..... میری بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا وہ خود کو خطرے

میں محسوس کر رہے ہیں اگر کچھ دنوں کے لئے روپوش ہو جائیں تو اس کی چھان بین نہ کی

جائے۔ خود اپنے خاندانی معاملات میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس میں بعض افراد کی علالتیں بھی

شامل تھیں۔ زیادہ تر پہاڑ پر رہا۔ واپس آیا تو ان کی موت کی خبر سنی..... خداوند!..... میری تو

مقلہ ہی خطا ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ شاہد عزیز..... آخر یہ کیا کر رہا تھا۔ پھر اس طرح مردہ پایا گیا۔

پتہ نہیں۔ چودھری صاحب اس کی اصلیت سے واقف تھے یا نہیں۔ یقین کیجئے میں تو قریب

سے نجی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ ڈاڑھی نقلی ہوگی اور ہاں آپ کو میری دیہی قیام گاہ پر اس

”میری عقل جواب دے گئی ہے..... آپ ہی کچھ سوچئے۔“

”میرے خیال سے یہاں بھی باتیں ہو سکتی ہیں۔ آپ نے مرحوم کی قبر کیوں کھودی تھی

”مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ طبعی موت مرے ہوں گے؟“

”اگر آپ ان کے ایک مخلص دوست تھے تو آپ کو اپنے شبہ کا اظہار باضابطہ طور

پر چاہئے تھا۔ پولیس سے رجوع کرنے کی کوشش کرتے۔“

”پہلے میں خود مطمئن ہونا چاہتا تھا۔“

”ہوں! بات تفصیل طلب معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے شمشاد والا ہی چلنا چاہئے۔“

”کک..... کیوں.....؟“

”بھلا آپ کس طرح اپنا اطمینان کرتے..... کیا آپ لاش دیکھ کر بتا سکتے ہیں کہ

کن حالات میں ہوئی ہوگی؟“

”نن..... نہیں؟“

”پھر قبر کھودنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔“

”مم..... مجھے گھر لے چلئے..... میری حالت بگڑ رہی ہے۔“

حمید نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی۔ اس کے ہونٹ سختی سے بھنجے ہوئے تھے۔ شمشاد

خاصی شاندار عمارت ثابت ہوئی۔ حمید نے شمشاد کو سہارا دے کر گاڑی سے اُتارا تھا۔

کچھ اور لوگ بھی پہلے ہی سے مقیم تھے۔ شمشاد نے بتایا کہ اس نے اپنے بعض قریبی عز

کو یہ شہری قیام گاہ عاریتاً دے رکھی ہے۔

حمید نے اسے دیوان پر لٹا دیا اور خود ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

شمشاد کی آنکھیں بند تھیں اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ تھوڑی دیر

نے نحیف سی آواز میں کہا۔ ”میں نے دوبارہ قبر کھودنے کی کوشش کی لیکن چندنا معلوم آ

کی مداخلت کی بناء پر کامیاب نہ ہو سکا۔“

”آپ تنہا ہی تھے یا کوئی اور بھی ساتھ تھا۔“

”تنہا..... کیپٹن حمید..... اصل بات یہ ہے کہ مجھے چودھری صاحب کی موت ہی پر

نہیں آیا۔“

”کیا مطلب.....؟ سعد آباد نہیں چلنا۔“

”ہوش میں ہو یا نہیں..... اس وقت سعد آباد۔“

”تو کیا ابھی آپ نے شمشاد ولافون نہیں کیا تھا۔“

”نہیں..... کیا قصہ ہے؟ وہیں ٹھہرو۔ میں آ رہا ہوں۔“

حمید دروازے کے قریب ہی رک گیا تھا۔ وہ دونوں تجربہ گاہ سے باہر آئے۔ حمید نے

اسے فون کال کے بارے میں بتایا۔

”میں نے تمہیں فون نہیں کیا تھا۔ تمہارے جانے کے بعد سے تجربہ گاہ ہی میں رہا ہوں۔“

”تب تو شمشاد بھی قتل ہو چکا ہوگا۔“

”کیوں؟“ فریدی نے اُسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

حمید نے جلدی جلدی اپنی اور شمشاد کی گفتگو دہرانے کی کوشش کی۔ ”ایکس چیچ سے

شمشاد و لا کے نمبر معلوم کرو۔“ فریدی نے اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

نمبر حاصل کرنے میں پانچ منٹ صرف ہوئے تھے۔ فریدی نے شمشاد و لا سے رابطہ

قائم کر کے شمشاد کی خیریت دریافت کی۔

”دل کا دورہ پڑا ہوا ہے۔“ دوسری طرف سے کسی عورت نے کہا۔ ”خود فون اٹینڈ نہیں

کر سکتے۔ آپ کون صاحب ہیں۔“

”بس خیریت معلوم کرنی تھی۔ انہیں تنہا نہ چھوڑا جائے تو بہتر ہوگا۔“

”ہم سب ان کے قریب ہی موجود ہیں۔ آپ کون صاحب ہیں؟“

”طبیعت بہتر ہو تو کہہ دیجئے گا کہ کرنل فریدی نے خیریت دریافت کی تھی۔“

”بہت بہتر جناب۔“

”شکریہ.....“ فریدی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

”کیا بات ہوئی۔“ حمید بڑبڑایا۔

”ضروری نہیں کہ ہر بات کی تہہ میں کچھ نہ کچھ.....!“ فریدی جملہ ادھورا چھوڑ کر پرہیزگار

انداز میں گارے لگانے لگا۔

”اب آپ فلٹر میڈ گار بنوایا کیجئے۔ اگر اس سلسلے میں کمپنی سے مراسلت کریں تو بہتر ہوگا۔“

طرح الجھایا گیا کہ آپ لوگ مجھ پر کسی قسم کا شبہ کرنے لگیں۔“

وہ خاموش ہو گیا۔ حمید اس کے چہرے پر چھائی ہوئی زردی کو بغور دیکھے جا رہا تھا۔

دفعتاً فون کی گھنٹی بجی اور حمید انسٹرومنٹ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ذرا تکلیف کیجئے۔“ شمشاد نے ملتبیانہ انداز میں کہا۔ ”اگر کوئی مجھے پوچھے تو

دیجئے گا کہ طبیعت خراب ہے۔ خود فون اٹینڈ نہیں کر سکتا۔“

حمید نے اٹھ کر ریسپور اٹھایا۔

”ہیلو.....!“

”اوہ تو تم ہی ہو۔“ دوسری طرف سے فریدی کی آواز آئی۔ ”فورا واپس آؤ..... ہم

وقت سعد آباد جائیں گے۔ شمشاد صاحب کی طبیعت بہتر ہو تو وہ بھی ساتھ چل سکتے ہیں۔“

”ٹھہریئے..... میں پوچھتا ہوں۔“

حمید ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر شمشاد کی طرف مڑا اور فریدی کی پیشکش کا تذکرہ کر

ہوئے کہا۔ ”اگر آپ چل سکیں تو ہمیں مزید آسانیاں ہو جائیں گی۔“

”اب مجھ میں سکت نہیں رہی کپتان صاحب۔ ایک ہفتے سے پہلے شاید ہی بستر

اٹھ سکوں۔ دل کی حالت بہتر نہیں ہے۔“

حمید نے فریدی کو اس کی اطلاع دے کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد وہ گھر

طرف روانہ ہو گیا تھا۔ آنکھیں نیند کے دباؤ سے بوجھل ہوئی جا رہی تھی۔

گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ فریدی تجربہ گاہ میں ہے۔ سیدھا وہیں چلا گیا۔ وہ اس

کہنا چاہتا تھا کہ اگر دو تین گھنٹے سو کر گزار لینے کے بعد سفر شروع کیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔

تجربہ گاہ میں اندھیرا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی اس نے فریدی کی آواز سنی۔

”کون ہے؟“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔

”الو.....!“ حمید بھنا کر بولا۔

”اوہ..... کیوں..... کیا بات ہے؟“

”روشنی کیجئے۔“

”جاؤ..... سو جاؤ..... صبح باتیں ہوں گی۔“ فریدی نے کہا۔

تھا کہ جب وہ یہاں سے واپس ہوئے تھے تو فلیٹ کی نگرانی کے لئے ایک مسلح کاٹھیل وہاں چھوڑ دیا تھا اور راہداری کے سارے بلب بھی روشن تھے۔

فریدی نے پنل مارچ روشن کی اور حمید چونک پڑا۔ روشنی کا مختصر سا دائرہ مسلح کاٹھیل پر مرکوز ہو کر رہ گیا تھا۔

”کک..... کیا یہ بھی ختم.....!“ اس نے سرگوشی کی۔

کاٹھیل دیوار کی جڑ سے لگا لبا لبا لیٹا ہوا تھا۔ فریدی نے جھک کر اسے دیکھا اور پھر روشنی کا دائرہ فلیٹ کے دروازے پر ریگ گیا۔ دروازہ بند تھا۔

اس نے بہ آہستگی اس کا پینڈل گھمایا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ لیکن دوسرے کمرے کے دروازے کی جھری روشن تھی۔ حمید نے بغلی ہولسٹر سے ریوالت نکال لیا۔

کوئی اس کمرے میں چل رہا تھا۔ دفعتاً حمید نے فریدی کا بازو پکڑ کر آگے بڑھنے سے روک دیا اور خود دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

پھر دروازہ پر اس نے ٹھوکر رسید کی تھی اور دروازہ اندر گھس گیا تھا۔

کمرہ خالی نظر آیا۔ باتھ روم کی طرف بڑھا ہی تھا کہ فریدی نے آواز دے کر روک دیا۔ وہ تیزی سے اس کے قریب پہنچا تھا۔

”اس میں کیا مصلحت تھی فرزند۔“ اس نے حمید کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

”کیسی مصلحت۔“

”مجھے روک کر خود تیں مار خات بننے کی کوشش کر ڈالی۔“

”آپ سے پہلے مرنا چاہتا ہوں۔“

”چچ..... دل چھوٹا نہ کرو۔ ایک رات کی نیند پر زندگی نہیں قربان کی جاسکتی۔“

”میں کہتا ہوں اسے باتھ روم سے نکالنے کی کوشش کیجئے۔“

”نکل آؤ بھئی..... جو کوئی بھی ہو۔“ فریدی نے اونچی آواز میں کہا۔ ”آنکھ مچولی سے

کیا فائدہ۔“

حمید نے متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔ فریدی سے اس قسم کی غیر سنجیدگی کی توقع

فریدی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ اس کا پلڑ کرزیوں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اور پھر جب وہ لنکن میں بیٹھ گئے اور لنکن باہر جانے کے لئے پھانک سے گزرنے حمید نے شمشاد کا نام لے کر کئی بیہودہ خیالات کا اظہار کیا۔

”اس سے کیوں خفا ہو گئے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”دن بھر کی تھکن کے بعد ایک گھنٹے کی نیند بھی مقدر میں نہیں۔“

”تو اس میں شمشاد کا کیا قصور..... تمہیں سعد آباد کیلئے اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے تھا

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ زبان ہلانے سے بہتر تو یہ ہوگا کہ کسی قدر اونگہ ہی کا موقع نکال لے۔ لیکن اونگھنے کا موقع اسے خراٹوں کی دنیا میں گھسیٹ گیا۔

پھر جب تک جھنجھوڑا نہیں گیا تھا آنکھیں نہیں کھلی تھیں۔

”ہم کہاں ہیں۔“ حمید نے بھرائی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

”اپنے حواس مجتمع کرلو۔“ فریدی خشک لہجے میں بولا۔

”شمشاد ولا۔“

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

”کک..... کیوں..... پھر کہاں ہیں۔“

”شہد عزیز کی رہائش گاہ کے قریب۔ اب اترو بھی۔“

حمید گاڑی سے اتر گیا۔ سڑک سنسان پڑی تھی لیکن یہ وہ جگہ تو نہیں تھی۔

”کچھ دور پیدل چلنا پڑے گا۔“ فریدی نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

”کیا پاپ سگا سکتا ہوں۔“ حمید نے آئی ہوئی جمائی کا گلا گھونٹتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں.....؟“

کچھ دور چلنے کے بعد حمید نے اندازہ لگایا کہ ان کی گاڑی عمارت سے قریب آ

فرلانگ کے فاصلے پر پارک کی گئی تھی۔

زینے طے کر کے وہ اس منزل پر پہنچے جس میں شاہد عزیز کا فلیٹ تھا۔

پوری راہداری تاریک پڑی تھی۔ فریدی ٹھیک فلیٹ کے سامنے تھا۔ حمید کو اچھی طرح



”تمہیں کس چیز کی تلاش ہے۔“

شاہدہ نے کوئی جواب دینے کی بجائے اپنے چہرے سے نقلی ڈاڑھی اور مونچھیں نکال پھینکیں۔

”اب تم خود کو حراست میں سمجھو۔“ حمید غرایا۔

اس نے بڑے دلاویز انداز میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور حمید کو اپنی عافیت خطرے میں نظر آنے لگی۔

”میں خود دیکھوں گا کہ تمہیں کس چیز کی تلاش تھی۔“ فریدی نے کہا اور کتابوں کے ریک کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ کتابیں تو اب بھی فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔

حمید شاہدہ کی طرف متوجہ تھا اور شاہدہ فریدی کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

”اے تم ادھر دیکھو! تمہیں اس لاش کے سلسلے میں جواب دہی کرنی ہے، جو خلیستان والی عمارت میں ملی تھی۔“ حمید نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”وہ لاش وہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔“ لڑکی نے لاپرواہی سے کہا۔ ”میں آپ کو اس تک پہنچا کر خود غائب ہو جانا چاہتی تھی۔“

”پھر اس عمارت میں آگ کس نے لگائی تھی۔“

”معلوم کیجئے! آپ کے چیف تو غیب دانی کی سرحدوں کو بھی چھو سکتے ہیں۔“ لڑکی کا لہجہ طنزیہ تھا۔

حمید نے اسے گھورتے ہوئے نفرت سے ہونٹ سکڑ لئے۔

## خطرناک سفر

”اس لڑکی کو جانے دو۔“ دفعتاً فریدی کی آواز سنائے میں گونجی۔

حمید چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور لڑکی بولی۔ ”میں تو نہیں جاؤں گی۔“

نہیں تھی۔

اچانک فریدی نے جھپٹ کر ہاتھ روم کا دروازہ باہر سے بولٹ کرتے ہوئے کہا جو کوئی بھی ہے پوری طرح قابو میں آ گیا۔ کیا خیال ہے۔“

حمید نے پھر اسے حیرت سے دیکھا۔ یہ انداز گفتگو بھی اس کے لئے نیا تھا۔

فریدی اب اپنے بغلی ہولسر سے ریوالور نکال رہا تھا۔ اس نے حمید کو بستر کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور اب یہ بات حمید کی سمجھ میں آئی کہ جو بھی ہے اس نے ہینچے ہی پناہ لی ہوگی۔ کیونکہ چادر فرش تک لگی ہوئی تھی۔

”بستر کے نیچے سے نکلو.....!“ دفعتاً فریدی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”ورنہ تمہارا چھلنی ہو جائے گا۔“

ٹھیک اسی وقت حمید کی طرف چادر کا کنارہ اٹھا اور اس نے دروازے کی جانب بھاگنے کی کوشش کی تھی۔

”نہیں محترمہ۔“ حمید ریوالور کو جنبش دے کر بولا۔ ”اپنا پردہ برقرار ہی رکھو تو بہتر ہے بارش چہرے والی محترمہ نے بے بسی سے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیئے۔“

”کرئل صاحب! یہ ہیں محترمہ شاہدہ فاروقی۔“ حمید نے شاہدہ پر نظر جماتے ہوئے ”اوہ..... اچھا.....!“ فریدی کا لہجہ پرسکون تھا۔

”اوہ..... اچھا.....!“ شاہدہ نے اس کے لہجے کی نقل اتاری اور فریدی چونک کر گھورنے لگا۔ دونوں آوازوں میں سرمو فرق نہیں تھا۔

”اوہ..... تو کچھ دیر پہلے شمشاد ولا میں تم نے ہی مجھے فون کیا تھا۔“

”جناب عالی.....؟“ وہ بے خوفی سے مسکرائی۔

”کیوں.....؟“ حمید نے آنکھیں نکالیں۔

”اس لئے کہ آپ دونوں شمشاد کی زندگی خطرے میں سمجھ کر ادھر متوجہ ہو جا

میں یہاں اپنا کام کر سکوں۔“

”لیکن ناکام رہیں.....!“ فریدی بولا۔

”جج..... جی ہاں۔“

وہ چلا گیا تھا اور یہ دونوں فٹ پاتھ پر کھڑے رہ گئے تھے۔ حمید پاپ میں تمباکو بھرنے لگا۔  
”مجھے حیرت ہے۔“ لڑکی بڑبڑائی۔

”کس بات پر مس ریش دراز.....!“

”کرنل فریدی کا رویہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔“

”ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے بنی..... اسے سمجھنے کیلئے نسلوں کی عمریں درکار ہوں گی۔“

”اچھا تو میرے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہتے ہو۔“

”کسی اچھے سے نائٹ کلب میں رقص کے دو چار راؤنڈ..... عمدہ ناشتہ اور پھر.....؟“

”کیا واقعی مجھے حوالات میں نہیں ڈالا جائے گا۔“

”فادر کا فرمان اٹل ہوتا ہے۔“

”آخر وجہ.....؟“

”خواہ مخواہ سر نہ کھپاؤ..... جو کچھ کہا گیا ہے کرو۔“

”کیا یہ بھی نہ کرو گے کہ مجھے شمشاد ہی تک لے چلو۔“

”کیا مطلب.....؟“

”ہوسکتا ہے وہ مجھے جانتا ہو..... آخر میں نے اسی کی حویلی میں تو تمہارے ساتھ فراڈ کیا

تھا؟“

”میں نے تو تم سے اس فراڈ کا مقصد تک معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔“

”لیکن یہ شاہد عزیز ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔“

”آپ کے ماموں کا بہترین دوست تھا اور بالآخر انہیں کے لئے مارا گیا۔“

”میک اپ میں کیوں رہتا تھا.....؟“

”اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“

”یہاں کس چیز کی تلاش تھی تمہیں؟“

”کیا کرنل نے وہ چیز تمہیں نہیں دکھائی تھی؟“

”اس فلم میں کیا ہے؟“

”یہ بھی میں نہیں جانتی۔“

حمید بدستور فریدی ہی کی طرف دیکھتا رہا جواب ریک کے درمیانی تختے کو اس کی  
سے ہٹانے کے لئے زور لگا رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس میں کامیاب بھی ہو گیا۔ حمید لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تو اسے  
اسی سمت نگران پایا۔ البتہ اب اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔

فریدی نے ایک بار پھر لڑکی سے چلے جانے کو کہا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں  
اب وہ ان کے قریب واپس آ گیا تھا۔ حمید نے اس کے ہاتھ میں آٹھ ملی میٹر کی فلم کی ایک  
ریل دیکھی۔

”تم نے اسی کے لئے اتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا؟ کیوں؟“ وہ لڑکی کو گھورتا ہوا بولا۔

”جی ہاں۔“ اس نے مردہ سی آواز میں جواب دیا۔

”وہ کانشیل کتنی دیر میں ہوش میں آئے گا۔“

”صبح تک آرام سے سوتا رہے گا جناب۔“

”شاہد عزیز کو کس نے قتل کیا۔“

”میں نہیں جانتی؟“

”قاتل کو بھی اس فلم کی تلاش تھی؟“

”رہی ہوگی۔“ لڑکی نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”اچھا..... تو چلو.....؟“ فریدی نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

فریدی کے اس نرمی کے برتاؤ کے باوجود حمید کا رویہ ابھی تک لڑکی کو کور کئے ہوئے  
راہداری میں رک کر فریدی نے حمید سے کہا۔ ”رویہ اور ہولسٹر میں رکھو اور کانشیل کو اٹھاؤ  
اسے اٹھا کر زینے طے کرنے میرے بس کا روگ نہیں۔“

”بہت بہتر..... روشنی دکھائیے۔“ فریدی نے پنسل نارچ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے  
پھر فریدی نے کانشیل کو ہاتھوں پر اٹھایا تھا اور وہ زینے طے کر کے نیچے پہنچے تھے  
حمید لیکن وہاں لایا تھا۔

”تم دونوں یہیں ٹھہرو۔“ فریدی نے بے ہوش کانشیل کو لیکن کی پچھلی سیٹ پر ڈال

ہوئے کہا۔ ”میں اسے حلقے کے تھانے میں پہنچا کر واپس آتا ہوں۔“

”یقیناً!“

”وہ کون تھا.....“

”میں نہیں جانتی! اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔“

”کیا میرے ماموں کو علم تھا کہ شاہد عزیز میک اپ میں رہتا ہے۔“

”میں نہیں جانتی!“

”کیا تمہیں بھی علم نہیں تھا کہ وہ مصنوعی ڈاڑھی لگائے پھرتا ہے۔“

”کبھی قریب سے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔“

”تم نے میک اپ کرنا کس سے سیکھا تھا.....؟“

”آپ کے ماموں سے..... وہ میک اپ کے ماہر تھے۔ کیا آپ کو علم نہیں۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لڑکی سے کیا برتاؤ کرنا چاہئے۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس کا بیان درست ہی ہو ممکن ہے کہ وہ اس طرح کی گفتگو کر کے خود کو شے سے بالاتر ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ لنگن فٹ پاتھ سے آگئی اور ساتھ ہی فریدی کی آواز سنائی دی۔

”تم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔“

خاموشی سے تعمیل کی گئی۔ لنگن دوبارہ حرکت میں آئی اور کچھ دیر بعد حمید نے محسوس کیا کہ وہ گھر پہنچنے کی بجائے قومی شاہراہ پر آنکے ہیں۔

”اوہو..... تو کیا سعد آباد.....!“ حمید نے سوچا اور لڑکی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اب سعد آباد میں تصدیق ہو سکے گی کہ تم کون ہو۔“

”میں یہی چاہتی تھی کہ آپ لوگ سعد آباد چلیں۔“

”لیکن سفر خطرات سے خالی نہ ہوگا جناب کرنل صاحب۔“ حمید نے اونچی آواز میں کہا۔

”کیوں.....؟“ فریدی کا مختصر سا سوال تھا۔

”یہ محترمہ ابھی مجھے بتا رہی تھیں کہ اگر مجھے دھوکہ سے شمشاد کی حویلی میں نہ لے جاتیں اس سعد آباد سے تین میل ادھر ہی قتل کر دیا جاتا۔“

”تب تو انہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ لوگ کون ہیں؟“

”کس کے لئے کام کر رہی ہو۔“

”اپنے لئے..... صرف اپنے لئے۔“

”تب پھر میں تمہارے لئے پاگل خانے کی سفارش کروں گا۔“

”تمہیں بھی ساتھ لے چلوں گی اکیلے جی نہ لگے گا..... واقعی لا جواب آدمی ہو

معلوم ہو جانے کے بعد کہ میں لڑکی ہوں کس طرح بھاگے گئے تھے میرے ساتھ..... پوہ

قبہ بہ لگا کر اسے طول دیتی چلی گئی۔

”تم تو ڈاڑھی مونچھ والی تھیں..... سر پر سینگ رکھنے والی لڑکیوں کے پیچھے بھی

طرح دوڑتا ہوں۔“ حمید جھلا کر بولا۔

لڑکی ہنسی رہی پھر اچانک سنجیدگی اختیار کر کے بولی۔ ”میں اگر تمہیں اس طرح نہ

تو تم سعد آباد سے صرف تین میل کے فاصلے پر ٹھکانے لگا دیئے جاتے۔“

”کیا شمشاد کے بارے میں کچھ کہنا چاہتی ہو؟“

”میں کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔“

”تم کو میرے ماموں کے معاملات سے کیا سروکار.....؟“

”اس دنیا میں ان کے علاوہ میرا اور کوئی نہیں تھا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”کیا وصیت نامے میں ان خاندانوں کا ذکر نہیں جن کی پرورش انہوں نے اپنے

لے رکھی تھی۔“

”اوہو..... تب تو شمشاد کے بارے میں بہت کچھ بتا سکو گی۔“

”شاہد عزیز اور شمشاد..... دونوں ہی سے ان کی گہری دوستی تھی۔“

”شمشاد کا خیال ہے کہ ان کی موت قدرتی نہیں ہو سکتی۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”شمشاد کچھ نامعلوم آدمیوں سے خائف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس کی حویلی

پائی جانے والی لاش اسے پھنسانے کے لئے کسی نے ڈلوائی تھی۔ کیا تم نے وہ لاش اچھی

دیکھی تھی۔“

حمید ہڑبرا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

”آپ نہ جانے کیا کرتے پھر رہے ہیں۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”لڑکی بحفاظت سعد آباد پہنچ جانا چاہتی تھی۔ لہذا اس کی خواہش پوری کر رہا ہوں۔“

حمید نے عقب نما آئینے پر نظر ڈالی۔ دو گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس صاف دکھائی دے رہی تھیں لیکن اس کی دانست میں دونوں لوڈنگ ٹرک بھی ہو سکتے تھے۔ قومی شاہراہ کسی وقت بھی بالکل سناں تو نہیں رہتی تھی۔

ابھی وہ قومی شاہراہ ہی پر تھے سعد آباد جانے والی سڑک پر نہیں مڑے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد سعد آباد والی سڑک ملی۔ تب حمید کو تعاقب کا یقین ہو سکا۔ ریوالور اس نے پہلے ہی ہولسر سے نکال لیا تھا۔ اس سڑک پر چار یا پانچ میل طے کرنے کے بعد فریدی نے لڑکی کو آواز دی لیکن جواب نہ ملا۔

”اسے جگاؤ۔“ اس نے حمید سے کہا۔ ”بلکہ بہتر ہوگا کچھلی سیٹ پر چلے جاؤ۔“

حمید نے پشت گاہ پر جھک کر اس کا شانہ ہلایا اور وہ اچھل پڑی۔

”اٹھ بیٹھو!“ حمید آہستہ سے بولا۔ ”خطرہ ہے۔“

”کک..... کیا بات ہے؟“ لڑکی ہکلائی۔

”تعاقب..... سنجل کر بیٹھو؟“

”خدا یا رحم.....!“ لڑکی کی آواز کانپ رہی تھی۔

دفعتاً گاڑی کے پیچھے ایک زوردار دھماکہ ہوا اور ایسا معلوم ہوا جیسے گاڑی بھی اچھل گئی ہو۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ فریدی نے ڈرائیونگ میں اپنی مہارت کا ثبوت پیش کیا تھا۔ اسپیدو میٹر کی سوئی اسی اور نوے کے درمیان جھول رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں گاڑیاں بہت پیچھے رہ گئیں۔

”کیا میں سب مشین گن نکالوں؟“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں وہ بھاگ کھڑے ہوں گے..... آنے دو!“

”اگر کوئی دہتی بم ہماری گاڑی ہی پر آ پڑا تو۔“

”بے فکر رہو..... وہ اتنے فاصلے پر نہ پھینک سکیں گے اور نہ رفتار ہی بڑھانے کی جرأت

”جی نہیں..... میں نہیں جانتی۔“ لڑکی نے کہا۔

”پھر تمہیں اس کا علم کیونکر ہوا۔“

”کسی نامعلوم آدمی نے مجھے اس خطرہ سے آگاہ کیا تھا۔“

”کس طرح آگاہ کیا تھا.....؟“

”بذریعہ خط..... جو انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا تھا۔“

”تمہیں ان معاملات سے کیا سروکار؟“

”میں ابھی کیپٹن حمید کو بتا چکی ہوں کہ ان کے ماموں میری کفالت کرتے تھے۔“

”تم نے میری آواز کہاں سنی تھی کہ اس کی اتنی کامیاب نقل اتار سکیں۔“

”میں اور چودھری صاحب اکثر شہر آتے تھے اور آپ دونوں سے قریب رہنے کی

کرتے تھے۔ ان مقامات پر ضرور جاتے تھے جہاں کیپٹن حمید سے ملنے کے امکانات ہوتے

”اب بتاؤ کہ شاہد عزیز کے فلیٹ میں تمہیں کس نے بھیجا تھا۔“

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔

فریدی نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”دو لاشوں سے تمہارا تعلق کسی نہ کسی طرح

تمہارے لئے بڑی دشواریاں پیدا کر چکا ہے۔“

لڑکی پھر بھی خاموش رہی۔

اس بار حمید بولا۔ ”دیکھو..... وصیت نامے کی رو سے تمہاری حفاظت کرنا میرے

میں شامل ہو چکا ہے۔ اس لئے تمہیں بھی تعاون کرنا چاہئے۔“

”میں سعد آباد پہنچ کر ہی اس مسئلے پر گفتگو کر سکوں گی۔“

”اچھی بات ہے۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”اگر تم سونا چاہو تو حمید اگلی سیٹ پر آؤ۔“

”بہت بہت شکریہ جناب۔ میری تھکن بے ہوشی کی حد کو چھونے لگی ہے۔“

فریدی نے گاڑی روک دی تھی اور حمید اتر کر اس کے برابر جا بیٹھا تھا۔

سفر جاری رہا۔ حمید اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن عافیت اسی میں

بھی اونگھنا شروع کر دے۔ پھر شاید دس منٹ بھی اس کیفیت میں نہ گزرے ہوں

فریدی نے اسے ٹھوکا دیا۔ ”جاگتے رہو..... پیچھے دو گاڑیاں اور بھی ہیں۔“

”میرے لئے فرق پڑتا ہے کیونکہ میں ابھی سن چکا ہوں وہ کسی اور کے احکامات پر عمل کر رہے ہیں۔“

”تو پھر اس سے کیا ہوتا ہے۔“

”کرائے کے آدمی روٹی کے لئے سر سے کفن باندھتے ہیں۔ بھے ان سے ہمدردی ہے اور اس وقت تک رہے گی جب تک ہماری سوسائٹی صحیح معنوں میں انسانی سوسائٹی نہیں ہو جاتی۔ مشین گن رکھ دو..... اگر یہ گاڑیوں سے اتر بھاگے تو اندھیرے میں ہم انہیں کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔“

اچانک لڑکی نے قہقہہ لگایا۔

”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔“ حمید بھنا کر بولا۔

”کرنل صاحب ان شریف آدمیوں سے واقف نہیں ہیں اسی لئے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔“

”اگر تم میری معلومات میں اضافہ کر سکو تو ممنون ہوں گا۔“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔

”میرا خیال ہے کہ یہی لوگ چودھری صاحب کی موت کا باعث بنے ہیں۔“

”خیال کی وجہ.....؟“

”بڑی عجیب بات ہے کہ آپ یعنی..... کرنل فریدی..... دج پوچھ رہے ہیں۔“

”میں غیب دان تو نہیں ہوں؟“

دفعۃً ٹرانسمیٹر سے آواز آئی۔ ”ہیلو..... گاڈ آف ڈیزاٹ..... ہیلو..... ہیلو!“

”ہلو..... کیا بات ہے۔“ دوسری آواز آئی۔

پہلی آواز۔ ”ابھی میں نے ٹرانسمیٹر پر اُن کی آوازیں سنی ہیں۔ اُن کے پاس مشین گن

ہے۔ ہمیں نشانہ بنا سکتے ہیں اُور.....!“

پہلی آواز۔ ”میں بھی اُن کی آوازیں سن رہا ہوں..... اور اب میں تم سے مخاطب ہوں

کرنل فریدی..... میں ریت کا دیوتا..... تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ واپس جاؤ..... میں تمہیں

تاتا ہوں کہ چودھری شیر علی خان جو میرا پیاری تھا مجھ سے باغی ہو کر روپوش ہو گیا ہے۔ مرنے

کا ذرا مہص اس لئے اسٹیج کیا ہے کہ تم اپنے ماتحت کیپٹن حمید کی حمایت میں مجھ تک آپہنچو۔

مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔ اب میں اپنے ان پیاریوں سے مخاطب ہوں جو تمہارا تعاقب کر رہے

کر سکیں گے..... کیونکہ دونوں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بہت کمزور معلوم ہوتی ہیں لیکن تم ذرا بڑا ٹرانسمیٹر کی ہر فریکوئنسی چیک کر لو۔ میرا خیال ہے کہ یہ لوگ بہت منظم ہیں۔“

”میرا ٹرانسمیٹر گمراہی پر رہ گیا۔“

”اچھا تو پھر آگے آ کر ڈیش بورڈ والے کو دیکھو..... میں اسٹیئرنگ نہیں چھوڑنا چاہتا۔“

حمید نے پھر اگلی سیٹ پر چھلانگ لگائی اور ڈیش بورڈ کے ایک خانے میں ہاتھ ڈال

سوچ آن کیا..... مختلف فریکوئنسیز کو آزما رہا تھا کہ آواز آئی۔ ”وہ بہت تیز رفتاری

جار ہے ہیں۔ ہینڈ گرنیز ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اُور.....!“

”پرواہ مت کرو۔“ دوسری آواز آئی۔ ”تمہارے پاس جتنے بھی ہیں پھینک دو۔“

نشانے پر بیٹھیں یا نہ بیٹھیں..... اُور.....!“

”بہت بہتر جناب..... اُور.....!“

اس کے بعد دوسری آواز نہیں سنائی دی تھی۔

”سوچ آف نہ کرنا۔“ فریدی نے کہا۔ ”اسی فریکوئنسی پر رہنے دو اور اب اگر تم چاہو تو

بات اُور ہی رہ گئی تھی۔ کیونکہ ایک دھماکہ پھر ہوا۔ لیکن یہ بم لنگن سے بہت دور گرا تھا

”ہاں تو اب تم سب مشین گن استعمال کر سکتے ہو۔“ فریدی نے جملہ پورا کر دیا۔

کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

حمید پھر پچھلی سیٹ پر جا پہنچا۔ بائیں جانب کے دروازے سے لگے ہوئے ایک بڑے

دبائے ہی ہٹا کے کے ساتھ ایک بڑا سا مستطیل غلامودار ہوا تھا۔

”ٹھہرو۔“ دفعۃً فریدی بولا۔ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ پھر دھماکہ ہوا۔

”خیال رہے کہ صرف ہیڈ لائٹس نشانہ بنیں۔“ اس نے جملہ پورا کیا۔

”اس کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔“ حمید نے سب مشین گن کی نال کھڑکی سے

نکالتے ہوئے کہا۔

”تو پھر رہنے دو۔“

”کمال کرتے ہیں آپ وہ ہم پر بم برسا رہے ہیں۔ اگر ایک آدھ ان میں سے م

گیا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

حمید کا دم گھٹنے لگا۔ اس کے بعد اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

کچھ دیر بعد لڑکی ہی نے پوچھا۔ ”آپ کیا سوچنے لگے۔“

”میں سوچ رہا ہوں کہ آدمی سے زیادہ بے بس جانور اس زمین پر شاید ہی کوئی دوسرا

پایا جاتا ہو۔“

”اس میں تو شک نہیں۔“ لڑکی بولی۔ ”بعض اوقات وہ اپنی گردن کٹ جانے پر واویلا

بھی نہیں کر سکتا۔“

”تم میں دونوں سے متفق نہیں ہوں۔ آدمی میں صرف اخلاقی جرأت ہونی چاہئے۔ پھر

دنیا کی کوئی طاقت اُسے زیر نہیں کر سکتی۔“

”شریف آدمیوں میں اخلاقی جرأت نہیں ہوتی۔“

”وہ شریف نہیں بلکہ غلط تربیت کا شاہکار ہوتے ہیں۔ بزدل ہوتے ہیں۔ سچی بات

بھی کسی کے منہ پر نہیں کہہ سکتے اور اپنی اس کمزوری پر فراخ دلی کا غلاف چڑھائے رکھتے

ہیں۔ کہتے ہیں کہ دل آزاری اُن کا شیوہ نہیں۔ شاید تم بھی ایسے ہی گدھوں کے ریوڑ سے

تعلق رکھتے ہو۔“

”بالکل درست ہے۔“ حمید چپک کر بولا۔ ”اب میں ان محترمہ کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر

انہوں نے مجھے سعد آباد سے تین میل کے فاصلے پر مر جانے دیا ہوتا تو میری رات اس طرح

تباہ نہ ہوتی۔“

لڑکی ہنس پڑی۔

چاروں طرف ہو کا عالم تھا۔ لنگن سڑک پر بے آواز تیرتی چلی جا رہی تھی۔ اُن گاڑیوں کا

اب کہیں پتہ نہیں تھا جو کچھ دیر پہلے ان کا تعاقب کرتی رہی تھی۔

”سعد آباد اب تقریباً کتنی دور ہوگا۔“ حمید نے لڑکی سے پوچھا۔

”تیس چالیس میل۔ اب تو صبح ہونے والی ہے۔“

”ہو بھی چکے کسی صورت سے تاکہ میں تمہاری شکل دوبارہ دیکھ سکوں؟“

”ہاں ایک بات۔“ اگلی سیٹ سے فریدی کی آواز آئی۔ ”تمہیں اس فلم کی تلاش کا کیا

طریقہ بتایا گیا تھا.....؟“

ہیں۔ سنو میرے بچہ..... تم وہیں سے واپس ہو جاؤ..... کرنل فریدی کو سعد آباد پہنچنے دو۔

میں یہی چاہتا ہوں۔“

”بہت بہتر جناب۔“ کسی نے جواب میں کہا اور پھر آوازیں آنی بند ہو گئیں۔

فریدی نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر ٹرانسمیٹر کا سوچ آف کر دیا۔

”سنا تم نے۔“ حمید نے لڑکی کا شانہ ہلا کر کہا۔

”میں سن رہی تھی لیکن.....!“

”لیکن کیا.....؟“ حمید کے لہجے میں تلخی تھی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ فریدی بولا۔ ”اب تم دوبارہ سو سکتی ہو۔“

”آپ کی باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں۔“

”میں سب کچھ سمجھتا ہوں..... تم جانتی ہو کہ چودھری شیر علی زندہ ہیں۔“

”ہاں میں جانتی ہوں..... وہ اس آدمی کے خلاف کوئی واضح ثبوت فراہم نہیں

تھے اس لئے اس طرح انہوں نے آپ کو اس آدمی کی راہ پر ڈالا ہے۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ فریدی بولا۔ ”اب تم سو جاؤ..... ہم پھر کبھی اس مسئلے

کریں گے۔“

”اب مجھے نیند نہیں آئے گی؟“

”اچھا تو یہی بتا دو۔“ حمید نے آہستہ سے پوچھا۔ ”کیا وہ شخص سچ مچ میرا ماموں

.....؟“ ”یہ بالکل درست ہے کیپٹن حمید..... چودھری صاحب کو میں اپنا باپ سمجھتی ہوں

وہ اس شخص سے دو چار نہ ہوئے ہوتے تو مرنے کے بعد ہی آپ کو ان کا ترکہ پہنچتا اور

ان کے بارے میں معلوم ہوتا۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ وہ آپ کو کتنا چاہتے تھے۔ پچھلے

بات ہے آپ آرکچو میں اپنے ایک بھاری بھر کم دوست کے ساتھ بیٹھے کھانا کھا رہے

دونوں بھی وہیں تھے۔ آپ ہنس رہے تھے، قہقہہ لگا رہے تھے، آپ اپنے دوست کو جھج

تھے اور میں چودھری صاحب کی بے تائیاں دیکھ رہی تھی۔ آخر کار وہ رو پڑے تھے۔ کتنے

کتنی بڑی ٹریجڈی ہے۔ میں اپنے خون کو یہ نہیں بتا سکتا کہ میں کون ہوں..... میں

پیشانی نہیں چوم سکتا۔“



میں نکلے تھے۔ کسی نے شمشاد کے ملازم کے سر پر ضرب لگا کر اسے بے ہوش کر دیا اور عمارت کے اس حصے میں آگ لگا دی جس میں لاش پڑی ہوئی تھی۔  
 ”مجھے بعد کے حالات کا علم نہیں۔ وہاں سے بھاگ کر میں سیدھی شہر آئی تھی اور مے پول ہوٹل میں قیام کیا تھا۔ چودھری صاحب نے فون پر مجھے شاہد عزیز کے قتل کی اطلاع دی اور کہا کہ میں اس کے فلیٹ میں فلم تلاش کرنے کی کوشش کروں۔“  
 یہاں حمید بھی فریدی سے سوال کرنا چاہتا تھا کہ آخر اچانک اس نے وہ فلم کیسے برآمد کر لی تھی لیکن پھر نامناسب سمجھ کر خاموش ہی رہا۔  
 پوچھنے لگی تھی۔ کچھ دیر بعد انہیں مسجدوں کے منارے نظر آئے۔ عمارتیں کھر میں لپٹی ہوئی تھیں۔

”وہ سعد آباد میں داخل ہوئے اور لڑکی نے چودھری شیر علی کی حویلی تک انکی رہنمائی کی۔“  
 گاڑی بڑے سے پھانک پر رکی۔ پائیں باغ کی چہار دیواری بیس فٹ سے کم بلند نہ رہی ہوگی۔ پھانک بند تھا۔ پھانک کھلوانے کیلئے وہ گاڑی سے اتر ہی رہے تھے کہ اندر سے پے در پے فائروں کی آوازیں اور ایک طویل چیخ سنائی دی۔ فریدی پھانک کی طرف جھپٹا۔

## دشوار گزار راستے

حمید نے لڑکی کی طرف مڑ کر دیکھا وہ مڑی طرح کانپ رہی تھی۔

فائروں اور چیخ کے بعد اندر بٹکانا چھا گیا تھا۔

”اوہ.....!“ لڑکی بڑبڑائی۔ ”یہ خطرناک ہوگا۔“

وہ پھانک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ حمید نے بھی مڑ کر دیکھا۔ فریدی پھانک کی پیٹیوں پر بیٹھ جاتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دیوار پر پہنچ گیا۔ پھر انہوں نے اسے دوسری طرف اترتے دیکھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ بس یہی کہ اسے شاہد عزیز کے فلیٹ میں تلاش کرنا ہے؟“

”کیا تمہیں پوری طرح یقین ہے کہ شاہد عزیز چودھری صاحب کے ہمدردوں میں تھا۔“

”مجھے پوری طرح یقین ہے جناب۔ وہ محض اسی لئے مار ڈالے گئے کہ ان کے پاس بھی ان لوگوں کے خلاف کچھ ثبوت تھے۔“

”اور یہ بھی درست ہے کہ شمشاد کی حویلی میں پائی جانے والی لاش بھی تمہارے کسی اجنبی ہی کی تھی۔“

”جی ہاں یقین کیجئے۔ میں اب آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔“

”شمشاد کی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کرو۔“

”جو کچھ میں آپ کو پہلے بتا چکی ہوں اس میں صرف اتنا اضافہ کروں گی کہ چودھری صاحب نے اس معاملے میں شاہد عزیز کے علاوہ اور کسی کو راز دار نہیں بنایا تھا۔ شمشاد سے براہ دوستی تھی۔“

”لیکن کچھ لوگ شمشاد کے بھی پیچھے پڑ گئے ہیں کیونکہ اسے بھی چودھری صاحب موت پر یقین نہیں ہے۔“

”میں اس سلسلے میں بالکل لاعلم ہوں۔“

”پھر تم حمید کو اس کی حویلی میں کیوں لے گئی تھیں اور غیر قانونی طور پر اس کا قتل کیوں کھولا تھا۔“

”میں نے چودھری صاحب کی ہدایات پر عمل کیا تھا۔ یقین کیجئے میں نہیں جانتی کہ کہاں ہیں ورنہ ان سے بہتری باتیں معلوم کرنے کی کوشش کرتی۔ صرف ان کے احکامات عمل کر رہی ہوں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ شمشاد چودھری صاحب کو علم نہیں تھا کہ شمشاد کی جلدی حویلی میں جا پہنچے گا۔ کیونکہ وہ تو بہت دنوں سے خالی پڑی تھی۔ ارادہ تھا کہ شام تک کپٹن حمید کو وہیں روک کر کسی طرف واپس کر دیا جاتا۔ لیکن وہاں ایک لاش دیکھ کر میں نے وہ طرح نروس ہو گئی اور مجھے بھاگنا پڑا۔“

”پھر لاش جلا کو سخم کردی گئی تھی..... یہ اس وقت ہوا جب شمشاد اور حمید تمہاری تلاش

لے ہیں بڑی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔“  
 ”آج تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ کرٹل جیسے نرم دل اور سنجیدہ لوگوں کی  
 آپ جیوں سے کس طرح نبھ جاتی ہے۔“  
 ”کرٹل کی تو بات ہی نہ کرو۔“

”کیوں نہ کروں..... کیا میں نے ان کی گفتگو نہیں سنی تھی۔ جب آپ مشین گن سے  
 اندھا دھند فارنگ کرنے کی اجازت مانگ رہے تھے۔“  
 ”تم انہیں سمجھ سکی ہو تیں تو کوئی رائے قائم کرنے میں بہت محتاط ہوتیں۔“  
 ”کیا مطلب.....؟“

”کچھ بھی نہیں۔ ارے میری بات کرو نا۔ کرٹل فریدی کو کیوں لے دوڑیں۔“  
 ”ایسا شائستہ اور مہذب آدمی آج تک میری نظر سے نہیں گزرا.....!“  
 ”اور میں لفنگا ہوں..... کیوں؟“

”چودھری صاحب کبھی کبھی پیار سے آپ کو لفنگا ہی کہا کرتے تھے کپتان صاحب۔ وہ  
 آپ کے ابتدائی حالات سے بھی پوری طرح باخبر رہے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ بھی  
 جاگیردار طبقے سے انہی کی طرح متفر ہیں۔ جاگیردارانہ رکھ رکھاؤ اور مصلحت آمیز اخلاق سے  
 انہیں شدید نفرت ہے۔ میرے چودھری بابا بہت عظیم ہیں، کپتان صاحب۔“  
 ”مجھے اس پر کیوں مجبور کر رہی ہو کہ میں تمہاری عزت کرنے لگوں۔“

”وہ تو کرنی ہی پڑے گی کپتان صاحب۔ میری تربیت چودھری بابا کے ہاتھوں ہوئی  
 ہے۔ میں ان کے اور آپ کے لئے جان تک دے سکتی ہوں۔ ہر اس شخص کے لئے سب کچھ  
 قربان کر سکتی ہوں، جسے چودھری بابا عزیز رکھتے ہوں۔“  
 ”اے معلمہ اخلاقیات۔ اب بس کرو، ورنہ میں بور ہو کر مر جاؤں گا۔ سنجیدگی سے مجھے  
 نفرت ہے۔“

وہ کچھ کہنے ہی مانی تھی کہ فریدی واپس آ گیا۔

”دلاور کی کیا نہ ہے؟“ اس نے لڑکی سے پوچھا۔

”کم از کم بیسٹھ سال..... ہو سکتا ہے ستر کے قریب ہو۔“

اس کے بعد پھانک کھلنے میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگا تھا۔  
 پھانک کھول کر فریدی گاڑی میں آ بیٹھا اور انہیں بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

گاڑی اشارت ہوئی اور تیز رفتاری سے پھانک میں داخل ہو کر طویل برآمدے  
 طرف بڑھتی چلی گئی۔

”یہاں کون کون رہتا ہے۔“ حمید نے لڑکی سے پوچھا۔

”صرف دلاور..... چودھری صاحب کو اس کے علاوہ کسی پر بھی اعتماد نہیں۔ لیکن  
 حقیقت ہے کہ وہ بھی اس راز میں شریک نہیں۔ وہ بھی یہی سمجھتا ہے کہ چودھری صاحب  
 خدا نخواستہ انتقال کر چکے ہیں۔“

وہ گاڑی سے اترے۔ عمارت کا صدر دروازہ کھلا ہوا ملا تھا۔

”تم دونوں یہیں اسی جگہ ٹھہرو۔“ فریدی نے صدر دروازے کے قریب رکتے ہوئے  
 کہا۔ ”میری واپسی سے پہلے اندر نہ جانا خواہ کچھ ہو۔ ریوالور ہاتھ میں رکھو۔“

پھر وہ برآمدے سے اتر کر پائیں باغ کی قد آدم باڑھوں کے درمیان گم ہو گیا تھا۔  
 ”کیا خیال ہے۔“ حمید آہستہ سے بولا۔ ”کیا انہوں نے دلاور کو مار ڈالا۔“

”خدا جانے..... اب تو میرے اعصاب جواب دے رہے ہیں..... وہ بیچارہ بوڑھ  
 آدمی..... آلہ سماعت کے بغیر کسی قسم کی بھی آواز نہیں سن سکتا۔“

”مجھ پر بھی تو ترس کھاؤ..... کل سے دھکے کھاتا پھر رہا ہوں۔“

”کوئی فلرٹ لڑکی ساتھ ہوتی تو آپ خاصے مگن نظر آتے کپتان صاحب۔“

”ہائے..... تم یہ بھی جانتی ہو۔“

”میں تو شاید یہ بھی جانتی ہوں کہ بھوک کے مارے آپ کا معدہ بالکل خشک ہو چکا ہوگا۔“

”نہر کیا یاد دلا کر.....!“ حمید نے کھلے ہوئے دروازے سے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

پھر اس کی طرف مڑ کر رازدارانہ لہجے میں بولا۔ ”اگر دلاور سچ مار ڈالا گیا ہو تو سید

بادرچی خانے میں چلی جاتا۔“

”کتنے بے درد ہیں آپ لوگ۔“ اس نے نہر اسامہ بتا کر کہا۔

”بے دردی ہمارے نصاب تعلیم میں شامل ہوتی ہے۔ کسی لاش پر آنسو بہانے کے

”تم نے اچھا کیا۔“ فریدی بولا۔ اس کے بعد وہ زخمی کی مرہم پٹی میں لگ گیا تھا۔  
 حمید نے اس کمرے کی دیوار پر بھی اپنی ایک تصویر دیکھی۔ لڑکی جو اسی کی طرف دیکھ  
 رہی تھی جلدی سے بول پڑی۔ ”دیوان خانے میں ایک قد آدم تصویر بھی ہے۔“  
 ”آؤ..... میں پوری مارت دیکھنا چاہتا ہوں۔ کرنل صاحب زخمی کو سنبھال لیں گے۔“  
 فریدی کچھ نہ بولا۔ سر جھکائے اسکا زخم صاف کرتا رہا اور یہ دونوں کمرے سے نکل آئے۔  
 ”بہت بڑی عمارت تھی۔ دونوں منزلوں پر ستائیس کمرے تھے اور ان ستائیس کمروں  
 میں شاید ہی کوئی کمرہ ایسا ہو جس میں حمید کے ایک دو پوز موجود نہ ہوں۔“  
 حمید تہ خانوں کی موجودگی کے امکانات کا بھی جائزہ لیتا جا رہا تھا۔ لیکن اس لڑکی سے  
 اس کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ البتہ اس نے ریت کے دیوتا کی بات چھیڑ دی۔  
 ”میں بالکل نہیں جانتی کہ وہ کیا بلا ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”راستے میں ٹرانسمیٹر پر اس کی  
 آواز اور گفتگو سن کر دم بخود رہ گئی تھی۔ چودھری بابا نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ ان کے دشمن کس قسم  
 کے لوگ ہیں اور دشمنی کی وجہ کیا ہے۔“  
 ”اب اس زخمی لڑکے کے بارے میں بتاؤ کرنل صاحب کہہ رہے تھے کہ تم اسے جانتی ہو۔“  
 ”اس کی بیوہ ماں اور دو بہنوں کی کفالت بھی چودھری صاحب ہی کرتے تھے۔ لیکن  
 انہوں نے مجھے یہ نہیں بتایا کہ یہ لڑکا بھی۔“  
 وہ جملہ پورا کئے بغیر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ ”نہیں یہ کسی طرح بھی ممکن  
 نہیں۔ انہوں نے میرے اور شاہد عزیز کے علاوہ اور کسی پر کبھی اتنا اعتماد نہیں کیا تھا۔“  
 ”ہوں..... اچھا اب دلاور صاحب کے درشن بھی کرادو..... لیکن ٹھہرو..... یہ بتاؤ کہ  
 جب میرے ماموں صاحب نے انتقال ہی نہیں فرمایا تو پھر لاش کس کی دفن کی گئی تھی اور  
 دلاور سے یہ بات کیونکر چھپائی گئی تھی۔“  
 ”دلاور کو ان دنوں چھٹی دے دی گئی تھی اور وہ اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔ واپسی پر کیسی  
 کیسی بچھاڑیں کھائی ہیں اس نے، ہم تو سمجھتے تھے شاید وہ روتے روتے مر جائے گا۔“  
 ”دلاور سے کیا کہا گیا تھا.....؟“  
 ”یہ تو میں بھی نہیں جانتی۔“

”جب وہ دلاور نہیں ہو سکتا..... جوان آدمی ہے۔ گولی ران میں لگی ہے اور وہ یہ  
 پڑا ہے۔ شاید تم اسے پہچان سکو۔“  
 پھر اس نے حمید کو وہیں ٹھہرنے کا مشورہ دیا اور لڑکی کو ساتھ لے کر چلا گیا۔  
 دو یا تین منٹ بعد وہ واپس آ گئے۔ لڑکی کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا  
 اب وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔  
 ”کیا شناخت ہو سکی۔“ حمید نے پوچھا۔  
 ”ہاں۔“ فریدی نے کہا۔ ”اب تم آؤ..... اسے اٹھا کر اندر لے چلیں گے۔“  
 ”ایسا رشتہ دار ثابت ہوا ہے۔“ حمید نے لڑکی کی طرف دیکھ کر طنزیہ لہجے میں کہا  
 کچھ نہ بولی۔  
 زخمی کی عمر بیس سال رہی ہوگی۔ خوش شکل نوجوان تھا۔ لباس سے خوش سلیقہ بھی  
 ہوتا تھا۔ انہوں نے اسے اٹھایا اور برآمدے تک لائے۔ پھر اس کے کمرے تک لڑکی  
 رہنمائی کی تھی جہاں اسے لٹاتا تھا۔  
 گولی ران کا گوشت پھاڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی تھی۔ زخم سے خون رس رہا  
 لڑکی فرسٹ ایڈکس لینے چلی گئی تھی۔  
 ”لڑکی کا کہنا ہے کہ یہ بھی انہیں خاندانوں میں سے ایک کا فرد ہے جن کی کفالت  
 چودھری صاحب نے اپنے ذمہ لے رکھی تھی۔“ فریدی بے ہوش زخمی پر نظریں جمائے ہوئے  
 ”ہوں..... لیکن مجھے آپ کے اطمینان پر حیرت ہے۔ نہ آپ کو فائر کرنے والے  
 ہے اور نہ دلاور کی۔“  
 ”فائر کرنے والا نکل گیا ہوگا..... اور مجھے یقین ہے کہ دلاور سو رہا ہوگا۔ لڑکی  
 ہے کہ چودھری صاحب نے دلاور کو اپنے راز میں شریک نہیں کیا تھا۔“  
 ”اور شاید یہ لڑکا شریک راز ہو.....!“ حمید نے فریدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ”وہ اس پر روشنی نہیں ڈال سکی۔“  
 حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ لڑکی فرسٹ ایڈکس سمیت واپس آ گئی۔  
 ”دلاور سو رہا ہے..... میں نے ابھی اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔“ اس نے کہا۔

”قبر معلوم ہے؟“

”کیوں نہیں؟“

دلاور بیدار ہو چکا تھا۔ لڑکی نے اسے حمید سے ملایا۔ پہلے تو چند ہیائی ہوئی آنکھوں حمید کو دیکھتا رہا پھر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے پیروں سے چٹ گیا اور اس طرح دہا مار مار کر رویا کہ فریدی کو بھی اسی جگہ پہنچ جانا پڑا۔

بڑی مشکل سے اس کا رونا تھا تھا۔ فاروؤں سے متعلق پوچھا گیا۔ تو اس نے بتایا کہ سماعت کے بغیر بجلی کا کڑا کا بھی نہیں سن سکتا۔

”یہ بہت اچھی بات ہے کہ اللہ پاک نے اسے بہرہ کر دیا ہے۔“ حمید ٹھنڈی سا لے کر بولا۔ ”ورنہ یہ فاروؤں کے سلسلے میں اتنا بور کرتا کہ پھر ناشتہ کرنے کی ہمت بھی مجھ باقی نہیں رہتی۔“

”حد کردی آپ نے بھی۔“ لڑکی پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی۔ ”جاری ہوں باور خانے میں۔ آدھے گھنٹہ میں ناشتہ آپ کو مل جائے گا۔“ وہ دلاور کو اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی۔ فریدی کے چہرے پر گہری تشویش کے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ دوسری طرف مڑ گیا۔

حمید اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ پھر اسی کمرے میں آئے جہاں زخمی لیٹا تھا۔ لیکن یہاں تو اب کوئی بھی نہیں تھا۔ بستر خالی نظر آیا۔ فریدی کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف جھپٹا۔

پھر حمید باہر نکلا تو فریدی اسے کہیں دکھائی نہ دیا۔ لہذا وہ برآمدے ہی میں رک کر باغ میں نظر دوڑاتا رہا۔ جیسے اس کا خیال تھا کہ زخمی بے ہوش ہی رہا ہوگا ورنہ فریدی اسے چھوڑ کر اُن تک نہ پہنچتا۔

اچانک اسے ایسا محسوس ہوا جیسے صدر دروازے سے کوئی اسکی نگرانی کر رہا ہو۔ وہ غم سے مڑا۔ لیکن دوسرا اس سے بھی زیادہ پھر تیزا ثابت ہوا۔ بس حمید اسکی ہلکی سی جھلک دیکھ کر وہ دوڑتا ہوا صدر دروازے سے گزرتا چلا گیا۔ راہداری کے سرے پر پھر وہ صرف اس کے لباس کی جھلک دیکھ سکا تھا۔

وہ بھی اسی طرف مڑا جہاں اس نامعلوم آدمی کی جھلک دکھائی دی تھی۔ آدمی تھا یا چھلا وہ..... راہداری کے اس بازو میں بھی صرف اس کے لباس کی جھلک ہی دی۔ وہ ایک کمرے میں داخل ہوا تھا۔

لیکن جب حمید کمرے میں داخل ہوا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ ”سنو دوست۔“ اس نے بہ آواز بلند کہا۔ ”تم خواہ فضا میں تحلیل ہو جاؤ میں تمہیں ت بجھنے پر تیار نہیں۔“

”کمرے سے نکاسی کا کوئی اور دروازہ بھی نہیں تھا جس کی بناء پر سوچا جاسکتا کہ وہ ادھر کسی دوسری طرف جانکا ہوگا۔“

وہ چاروں طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ راہداری سے فریدی کی آواز آئی۔ ”حمید..... تم اس ہو؟“

حمید جھپٹ کر دروازے پر پہنچا تھا اور فریدی کو اُس طرف آنے کا اشارہ کیا تھا۔ ”کیا بات ہے۔“ اس نے قریب پہنچ کر اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پھر حمید کی زبانی صورت حال کا علم ہوتے ہی وہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔ دس پندرہ منٹ کی تلاش و جستجو کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس عمارت میں تہہ خانے کی موجود ہیں۔

”دروازہ بند کر کے بولٹ کر دو۔“ اس نے حمید سے کہا۔

حمید دروازہ بند کر کے پھر اس کے پاس آکھڑا ہوا۔

”آپ کس نتیجے پر پہنچے؟“ اس نے فریدی سے پوچھا۔

”حقائق کی سی باتیں نہ کرو۔ اگر یہاں تہہ خانے نہیں ہیں تو پھر وہ کوئی بھوت تھا۔“

”لیکن میری دانست میں داخلے کا راستہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ پلک جھپکتے غائب ہو سکے۔“

”ایسا ہی ہے حمید صاحب! تم یہ نہ سمجھو کہ تہہ خانے میں داخل ہونے کیلئے تمہیں فرش پر ہونا پڑے گا۔ یہ ملبوساتی الماری دیکھ رہے ہو۔ اسکے بائیں جانب ڈھائی فٹ بڑا فریم جسمیں تمہارے مختلف پوز نیچے سے اوپر تک جڑے ہوئے ہیں بالکل غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ ساری تصویریں کمرے میں مختلف جگہوں پر لگائی جاسکتی تھیں۔ خیر..... دیکھو۔“

”تم یہاں کس طرح پہنچے۔“ فریدی نے اسے مخاطب کر کے پوچھا۔  
 ”مم... میں نہیں جانتا۔ کسی نے پائیں باغ میں مجھ پر فائر کیا تھا۔ پھر کچھ یاد نہیں۔“  
 ”تم مجھے بے ہوش ملے تھے۔ اٹھا کر اندر لایا تھا۔ تمہارے زخم کی ڈریسنگ کی تھی اور

تم وہاں سے غائب ہو گئے تھے۔“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھے تو یہیں ہوش آیا ہے۔“

”تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو۔“

وہ کچھ نہ بولا۔ فریدی نے حمید سے کہا۔ ”اُسے فرش سے اٹھا کر کرسی پر بٹھا دو۔“

کرسی پر بیٹھ کر اس نے پشت گاہ پر گردن ڈال دی۔ آنکھیں بند تھیں اور وہ رک رک کر سانس لے رہا تھا۔

”میں نے تم سے تمہارا نام پوچھا تھا۔“ فریدی نے اسے پھر مخاطب کیا اور اس نے  
 ”نصیح کھول دیں۔ چند لمحے پلکیں جھپکا تا رہا پھر بولا۔ ”پپ پہلے..... آپ بتائیے کہ آپ  
 کون ہیں۔“

”انہیں تو تم پہچانتے ہی ہو گے۔ اگر پہلے بھی حویلی میں آتے رہے ہو۔“ اس نے حمید  
 کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”جج... جی ہاں..... یہ چودھری بابا کے بھانجے ہیں۔“

”بس پھر مطمئن رہو۔ اگر تم چودھری صاحب کے ہمدردوں میں سے ہو تو تمہیں زیادہ  
 شوش نہیں ہونی چاہئے۔“

”مم... مجھے عاقل خان نے بھیجا تھا۔“ زخمی بولا۔

”شمشاد کا ملازم..... عاقل خان۔“ حمید نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”جج... جی ہاں۔“

”کیوں بھیجا تھا؟“

”شمشاد صاحب کو چودھری بابا کی موت پر گہری تشویش ہے۔ انہوں نے اُن کے کچھ  
 دشمنوں کا پتہ لگایا ہے۔ جنہیں حویلی میں کسی چیز کی تلاش ہے۔ یہاں ہم بھی چودھری بابا کے  
 باشندوں میں سے ہیں لہذا میں اُن کے لئے جان دینے پر تیار ہو گیا۔“

فریدی نے الماری کے قریب پہنچ کر اس فریم کے اوپری حصے پر لگے ہوئے  
 آہنی گرپ کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ فریم سرک کر الماری کے پاٹ کے نیچے غائب ہو گیا  
 اس کی جگہ ڈھائی فٹ چوڑا اور چھ فٹ اونچا خلاء نظر آ رہا تھا۔

”تشریف لے چلے۔ یہی ہے تہہ خانے کا راستہ۔“ اس نے پیچھے ہٹ کر فرید

اس خلاء سے گزرتے ہی فریم پھر اپنی جگہ واپس آ گیا تھا۔ فریدی نے مڑ کر

آہستہ سے بولا۔ ”اس طرح وہ چشم زدن میں تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا ہو گا۔“

نکال لو۔“

گیارہ زینے ملے کر کے وہ نیچے پہنچے۔ یہاں کئی بلب روشن تھے اور کہیں سے

ہلکی سی آواز آرہی تھی۔ تہہ خانے کے اس حصہ میں کچھ ایسا سامان نظر آیا جیسا سائینس

گاہوں میں عام طور پر دکھائی دیتا ہے۔

حمید کا ریوالور ہاتھ میں تھا اور وہ فریدی کے پیچھے اس طرح چل رہا تھا جیسے اس

خصوصی ہو۔ عقابانی نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔

”اوہو.....!“ دفعتاً فریدی بولا۔ ”یہاں تو آٹھ ملی میٹر کا پروجیکٹر بھی موجود ہے۔“

حمید بائیں جانب والے دروازے کو دیکھنے لگا تھا جس میں اس نے ہلکی سی جنبش

کی تھی۔ اس نے فریدی کی توجہ بھی اس طرف مبذول کرائی۔

”فکر نہ کرو۔ یہاں پہنچے ہیں تو سب کچھ دیکھیں گے۔“ فریدی بولا۔

لیکن حمید نے جھپٹ کر دروازے پر ٹکر ماری۔ دروازہ کھل گیا اور ساتھ ہی کوئی

دوسری طرف فرش پر جا پڑا۔

یہ وہی زخمی تھا جو کچھ دیر پہلے اوپر والے ایک کمرے سے غائب ہو گیا تھا۔

اس نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی تھی لیکن حمید کے ہاتھ میں ریوالور

جہاں تھا وہیں رہ گیا۔

”اٹھو.....!“ حمید ریوالور کو جنبش دے کر بولا۔

اتنی دیر میں فریدی بھی وہیں پہنچ چکا تھا۔

زخمی اٹھا تو لیکن شاید اس کا زخم کھڑے رہنے میں مزاحم ہو رہا تھا لہذا پھر گر پڑا۔

”آخر..... وہ کہاں گیا جس نے ان تہہ خانوں تک ہماری رہنمائی کی تھی۔“ حمید کچھ دیر بعد بڑا یا۔

”فکر نہ کرو..... آؤ اسی کمرے میں چلیں جہاں پروجیکٹر دیکھا تھا۔“ فریدی نے کہا۔  
 ”خوب یاد آیا۔“ حمید چونک کر بولا۔ ”آپ نے شاہد عزیز کے فلیٹ سے اچانک وہ فلم کیسے برآمد کر لی تھی۔“

”یہی بتانا چاہتا تھا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب تم گھر آئے تھے تو میں تجربہ گاہ میں تھا اور اس وقت تجربہ گاہ میں اندھیرا تھا۔“

”جی ہاں..... مجھے یاد ہے۔ لیکن میں وجہ نہیں دریافت کر سکا تھا۔“  
 ”شاہد عزیز کے بستر کے نیچے سے مجھے آٹھ ملی میٹر فلم کا ایک فریم ملا تھا۔ میں نے اسے پروجیکٹر پر دیکھا تو اس میں صرف اسی بک شیلف کی تصویر نظر آئی جسے توڑ کر میں نے فلم برآمد کی تھی۔“

”اوہو..... تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خود اسے بھی اپنے قتل کر دیئے جانے کا خدشہ لاحق ہوگا۔ اسی لئے اس نے وہ فریم بستر کے نیچے رکھا ہوگا تاکہ اس کی عدم موجودگی میں بھی کوئی اس فلم کو حاصل کر سکے۔ مگر کون؟“

”یہی تو دیکھنا ہے..... آؤ۔“

وہ دونوں پھر اسی کمرے میں آئے جہاں اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں تھیں۔ فریدی نے وہ فلم پروجیکٹر پر چڑھائی جو شاہد عزیز کے بک شیلف سے برآمد ہوئی تھی۔

حمید نے سوئچ آف کر کے وہاں کے بلب بجھائے اور پروجیکٹر کی روشنی چھوٹے سے اسکرین پر پڑنے لگی۔ پروجیکٹر کے متحرک ہوتے ہی اسکرین پر ایک دشوار گزار راستے کے پیچ و خم نظر آنے لگے۔ چاروں طرف اونچی نیچی چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ پانچ منٹ کی اس فلم میں دیرانوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ اختتام ایک بہت بڑے بت پر ہوا جسے ایک چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا۔

”یہ کیا ہوا ہے؟“ حمید بڑا یا۔  
 ”پتھر کا دیوتا۔“ فریدی نے طویل سانس لی۔

”تمہیں یہاں کرنا کیا تھا.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”بس یہی دیکھنا تھا کہ وہ لوگ کون ہیں جو چوری چھپے حویلی میں داخل ہو کر کرتے ہیں۔“

”تم پر فائر کس نے کیا تھا.....؟“

”میں نہیں دیکھ سکا تھا..... کک..... کئی فائر کئے تھے۔ ایک گولی ران میں لگی مگر کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا..... اور جب ہوش آیا تو میں یہاں فرش پر پڑا تھا۔“

”شاہدہ کو جانتے ہو.....؟“

”کک..... کون شاہدہ..... اوہ..... اچھا..... شاید آپ کی مراد شاداں سے ہے۔“

حمید نے شاہدہ کا حلیہ بیان کرنے کی کوشش کی اور وہ سر ہلا کر بولا۔ ”جی ہاں شاداں ہی تو ہے۔“

”اُس کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”وہ چودھری بابا کو باپ سمجھتی ہے۔ ہم سب پر اُن کے بڑے احسانات تھے۔“

”کیا تم اُن کے جنازے میں شریک ہوئے تھے۔“

”جی ہاں۔“

”اندازاً کتنے لوگ رہے ہوں گے جنازے میں۔“

”بے شمار لوگ تھے۔“

”شمشاد اور شاہدہ عزیز کہاں تھے۔“

”وکیل صاحب تو تھے لیکن شمشاد صاحب دو دن بعد پہنچے تھے۔ اُنکے انتقال کا

کر۔ اوہ..... میرے خدا! اب مجھ سے بیٹھا بھی نہیں جا رہا۔ پوری ٹانگ مفلوج ہوتی جا رہی

”انہیں اٹھا کر صوفے پر لٹا دو.....!“ فریدی نے حمید سے کہا۔

لیکن لیٹتے ہی ایک بار پھر اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔

اسے وہیں چھوڑ کر وہ پورے تہہ خانے میں مختلف زاویوں سے چھان بینا

پھرے تھے۔ یہ تہہ خانے بھی اتنے ہی وسیع تھے جتنی بڑی اوپر کی عمارت تھی۔ چند

بڑے کمرے حمید نے شمار کئے۔



”لل..... لیکن..... وہ ریت کا دیوتا۔“

”احتمالاً سوالات نہ کرو..... دیکھنا یہ ہے کہ یہ فلم بندی کس علاقے میں کی گئی تھی۔“

”کیا آپ میرے ماموں کی قبر نہیں کھدوائیں گے۔“

جواب میں فریدی نے اونچی آواز میں کہا ”تمہارے ماموں کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اب وہ سامنے آ جائیں۔ یہ دیکھنا میری ذمہ داری ہے کہ کسی کے خلاف لگائے جانے والے الزامات میں کس حد تک صداقت ہے اور میں انکی حفاظت کی ذمہ داری بھی قبول کرتا ہوں۔“

”کیا یہ آپ شیر علی کو سنا رہے ہیں۔“ حمید نے آہستہ سے پوچھا۔

”ہاں..... میں چودھری صاحب ہی تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں اس تہہ خانے تک رہنمائی کرنے والے وہی ہیں۔ زخمی لڑکے کو چودھری صاحب ہی بحالت بیہوشی تہہ خانے میں منتقل کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ کہیں نہ کہیں سے میری بخوبی سن رہے ہوں گے۔ تہہ خانے کی بناوٹ ہی بتاتی ہے؟“

”تو پھر آجائیے ناماموں جان..... میں آپ کو دیکھنے کے لئے بُری طرح تڑپ رہا ہوں۔“ حمید نے بھی ہانک لگائی۔

”دھننا بائیں گوشے سے شاہدہ کی آواز سنائی دی۔“ آپ لوگ کہاں سے بول رہے ہیں براہ کرم ڈانٹنگ روم میں تشریف لائیے۔ ناشتہ تیار ہے۔“

حمید حیرت سے فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔ فریدی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نظر آئی اور پھر اس نے ہونٹ سکڑ کر شانوں کو جنبش دی تھی۔

”کیا قصہ ہے؟“

”قصہ یہ ہے حمید صاحب کہ آپ کے ماموں خواہ مخواہ نہ اسرار بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لڑکا انہی کی گولی سے زخمی ہوا ہے۔ وہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ لڑکا حویلی میں کیوں ہوا تھا۔ سوانہوں نے معلوم کر لیا اور مجھے یقین ہے کہ اب وہ وہاں نہ ہوگا جہاں ہم آئے تھے۔“

”میں دیکھتا ہوں۔“ حمید جلدی سے بولا۔

”ضرور دیکھو۔“

بندہ 38

حمید اس کمرے میں آیا جہاں لڑکے کو چھوڑا تھا۔ لیکن وہ اب بھی وہیں موجود تھا اور اس نے انہیں بدستور بند تھیں۔ البتہ اس کے سر ہانے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ رکھا ہوا نظر آیا جو پہلے وہاں نہیں تھا۔ حمید نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔

بہت جلدی میں کسی نے لکھا تھا۔

”لڑکا یہیں رہے گا۔ ورنہ وہ اسے موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ اسے محض اس لئے نوٹس میں بھیجا گیا تھا کہ خود اندازہ کر سکیں کہ وہ بھی اس طرح حویلی میں داخل ہو سکیں گے یا نہیں۔ اس لڑکے کو قانون کا تحفظ حاصل ہونا چاہئے اور اس شخص پر نظر رکھی جانی چاہئے جس نے اسے حویلی میں بھیجا تھا۔“

حمید نے طویل سانس لی اور بے ہوش لڑکے کی طرف دیکھنے لگا۔

## تعاقب

کچھ دیر بعد وہ ڈانٹنگ ہال میں ناشتہ کر رہے تھے۔ لڑکی بھی موجود تھی۔

”آپ لوگ کہاں گفتگو کر رہے تھے۔ دلاور نے پوری عمارت چھان ماری تھی۔“ لڑکی نے حمید کو مخاطب کر کے کہا۔

”کیا یہاں کی جانے والی گفتگو ہر کمرے میں سنی جاسکتی ہے۔“ حمید نے سوال کیا۔

”جی ہاں..... لیکن آپ لوگ کہاں تھے؟“

”تہہ خانے میں۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”کیا مطلب.....؟“ لڑکی چونک پڑی۔

”تہہ خانے میں۔“ فریدی نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ“

”بڑا اچھا دوسری طرف دیکھنے لگی۔“

”مم..... میں نہیں جانتی کہ یہاں تہہ خانے بھی ہیں۔“

”سک..... کیوں؟“

”سنو! تمہارے چودھری بابا یا تم نے جو کچھ بھی کیا ہے اسے کہتے ہیں قانون کو ہاتھ لینا۔ لہذا میرا مشورہ ہے کہ چودھری صاحب کو اب سامنے آنا چاہئے اور تم سے جو کچھ کہا ہے کرو۔“

”میں نہیں جانتی چودھری بابا کہاں ہیں؟“

”خیر! اسے میں دیکھوں گا..... لیکن کیمرہ اسی فلم سمیت مجھے چاہئے جو کل اس میں موجود تھی۔ مجھے یقین ہے کہ تم ابھی اسے ڈیولپ نہ کر سکی ہوگی۔“

”آخر آپ کیمرہ کیوں طلب کر رہے ہیں۔“

”تم نے اس لاش کی تصویر ضرور لی ہوگی۔“

”اوہ.....! لڑکی نے طویل سانس لی پھر آہستہ سے بولی۔ ”بہت بہتر..... میں کیمرہ

لاتی ہوں۔“

وہ چلی گئی اور حمید نے فریدی سے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آتا کہ اسے تمہارے کانوں کا علم نہ ہوگا۔“

”بالکل غیر ضروری سوال ہے۔“ فریدی نے کہا اور سگار سلگانے لگا۔ کچھ دیر بعد شاہدہ واپس آگئی۔

”یہ لیجئے!“ اس نے ننھا سا مناس کیمرہ فریدی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”جی

ہاں۔ میں نے لاش کی تصویر لی تھی۔ فلم اس میں موجود ہے۔“

”شکریہ۔“ فریدی نے کیمرہ لے کر جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہیں واپس کر دیا ہے گا اور ہاں ایک آدمی کے لئے ناشتہ اور چاہئے۔“

”کک..... کس لئے۔“

”اس بحث میں نہ پڑو۔“

”اگر آپ لوگوں نے یہاں تہہ خانہ دریافت کیا ہے تو مجھے بھی دکھائیے۔“

”فی الحال یہ ناممکن ہے۔ لیکن تم کسی سے بھی اس کا ذکر نہیں کرو گی۔“

”میں سمجھتی ہوں۔“

”اگر تم نہیں جانتیں تو پھر ایک کمرے کی آواز دوسرے کمرے تک کیسے پہنچتی ہے

”الیکٹریٹی پیدا کرنے والا جزیئر یہاں موجود ہے۔ ڈیزل سے چلایا جاتا ہے

”جزیئر کہاں ہے؟“

”پائیں باغ میں۔“

”اوہ..... اچھا.....! فریدی نے کہا اور کپ میں کافی انڈیلنے لگا۔

”تم اس طرح چونکی تھیں جیسے تمہیں یہاں تہہ خانوں کی موجودگی کا علم ہی نہ ہو۔“

نے لڑکی سے کہا۔

”یقین کیجئے۔ مجھے علم نہیں تھا۔“ لڑکی نے فریدی کی طرف دیکھ کر کہا جو سر جھکا کر

پی رہا تھا۔

”تمہارا نام شاہدہ ہے یا شاداں۔“ حمید نے پوچھا۔

”میں دونوں ناموں سے پکاری جاتی ہوں۔“

”تمہارے پاس آٹھ ملی میٹر کا اسپائی کیمرہ ضرور ہوگا۔ اگر تمہیں سراغ رسائی کا

ہے۔“ دفعتاً فریدی نے شاہدہ سے سوال کیا۔

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“ شاہدہ پھر چونک پڑی۔

”میرا خیال ہے.....! چودھری صاحب کے پاس آٹھ ملی میٹر کا مودی کیمرہ تھا۔“

”جی ہاں..... اُن کے پاس تو ہے۔ لیکن آپ میری بات کر رہے تھے؟“

”تمہارے پاس آٹھ ملی میٹر کا مثل کیمرہ ہے۔“

”اوہو! تو کیا چودھری بابا سے ملاقات ہوگئی آپ کی۔“ وہ پُرسرت لہجے میں بولی۔

لیکن فریدی جواب دینے کی بجائے اسے جواب طلب نظروں سے دیکھتا رہا۔

”جی ہاں..... میرے پاس آٹھ ایم ایم کا مناس کیمرہ ہے۔“

”اور وہ کیمرہ اس وقت بھی تمہارے پاس رہا ہوگا جب حمید کو شمشاد کی حویلی میں

گئی تھیں۔“

”جج..... جی ہاں۔“

”وہ کیمرہ میرے حوالے کر دو۔“

فریدی نے لڑکی کی طرف دیکھا۔  
 ”وہ آتے رہے ہیں یہاں۔“ اس نے کہا۔ پھر حمید سے بولی۔ ”آپ نے شاہد فاروقی

شاہدہ فاروقی کا ذکر ان سے ضرور کیا ہوگا۔ لہذا محتاط رہئے گا۔ ان پر یہ نہ ظاہر ہونے پائے  
 کہ وہ لڑکی میں ہی تھی۔“  
 ”میں اتنا احمق نہیں ہوں۔“

”کسی قدر ضرور ہو۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔ ”تم خود جاؤ اور اسے یہیں لانا۔“

حمید اٹھ گیا۔ شمشاد کی جیب کے پیچھے اس کی گاڑی کھڑی نظر آئی۔

”اوہ..... آئیے..... آئیے۔“ حمید پر تپاک انداز میں آگے بڑھتا ہوا بولا۔ ”مگر آپ کو  
 کیسے معلوم ہوا کہ ہم لوگ یہاں ہیں۔“

”قیاساً! پہلے حویلی گیا۔ آپ کی گاڑی کے وہیل ٹھیک کرائے اور ادھر لیتا چلا آیا  
 اور پھر ایک ضروری بات بھی گوش گزار کرنی تھی۔“

”چلئے..... اندر تشریف لے چلئے۔“

حمید اسے ڈانٹنگ روم میں لایا۔

”آہا... شادو بنی بھی موجود ہے۔“ شمشاد نے کمرے میں قدم رکھتے ہی خوش ہو کر کہا۔

”آئیے چچا جان.....!“ لڑکی اٹھتی ہوئی بولی۔ ”کھانے میں شریک ہو جائیے۔“

”ضرور، ضرور..... میں بہت بھوکا ہوں۔ باہر میرے دو آدمی بھی ہیں۔“

”آپ تشریف رکھئے۔ ان کے لئے بھی انتظام کراتی ہوں۔“

فریدی نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا تھا۔

شاہدہ کھانے کے دوران ہی میں اٹھ گئی اور شمشاد فریدی کی طرف دیکھ کر بولا۔

”کپتان صاحب کے چلے آنے کے بعد میری حالت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ صبح چار

بجے کے قریب کسی قدر سنبھلی تو میں نے آپ کی کونھی پر فون کیا۔ معلوم ہوا کہ آپ لوگ

تشریف نہیں رکھتے۔ فوراً خیال آیا کہ سعد آباد گئے ہوں گے۔ کپتان صاحب کی گاڑی بھی یاد

آئی میں نے سوچا اسے سعد آباد ہی پہنچا دوں۔ شاید کسی اور سے بھجوا دیتا لیکن ایک اہم

”اچھا..... بس اب جا کر آرام کرو۔ جس کمرے میں قیام کرو اس سے باہر نہ  
 اسے بند ہی رکھنا۔“

”میرے اٹن کوئی کام ہو تو.....!“

”دوپہر کا کھانا۔“ منید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”شام کی چائے اور رات کا کھانا۔“

”جی بہت بہتر۔“ وہ براہمان کر غرائی۔ ”عورتوں کو صرف چولہے ہانڈی تک

چاہئے۔“

”اور نہیں تو پھر کیا کرنل صاحب کھانا پکائیں گے۔“ حمید آنکھیں نکال کر بولا۔

”اونہہ ہوگا..... ہاں وہ کہاں گیا حنیف۔“

”تم اس الجھن میں نہ پڑو۔ ایک آدمی کے لئے ناشتہ حمید کے سپرد کر دینا۔“

نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔ لڑکی حمید کو گھورے جارہی تھی۔ حمید پائپ میں  
 بھر رہا تھا۔

”تمباکو کب سے پی رہے ہو۔“ دفعتاً اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”پہلا سگریٹ والدہ صاحبہ کی گود میں پیا تھا پھر پانچ سال۔“

تمباکو سے اس نے پھر حنیف پر چھلانگ لگائی۔

”دیکھو بی شاہدہ! فادر ہارڈ اسٹون نے جو بات مناسب نہیں سمجھی اس کے سلسلے

میری زبان کس طرح کھلوائی جاسکتی ہے۔ تم فی الحال اپنے کام سے کام رکھو۔ ہاں چلو۔

جلدی سے ایک آدمی کے لئے ناشتہ۔“

وہ براہمانہ بنا کر اٹھ گئی۔ پندرہ منٹ بعد ناشتے کی ٹرے اٹھائے ہوئے

کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

”اب کرنل صاحب کی ہدایت کے مطابق اپنے کمرے میں جاؤ۔“ حمید نے کہا۔

”میں اپنے گھر جارہی ہوں..... یہاں تو نہیں رہتی۔“ وہ سرد لہجے میں کہتی

دروازے کی طرف مڑ گئی۔

حمید ناشتے کی ٹرے وہیں چھوڑ کر اسے پائیں باغ کے پھانک تک پہنچانے گیا تھا۔

دوپہر کا کھانا وہ اپنے گھر سے پکوا کر لائی تھی۔ کھانے کی میز پر پھرتیوں اکٹھے ہو

”جیت..... تو..... آپ جانتے ہیں کہ عاقل خان۔“

”میں آپ کی زبان سے بھی سنتا چاہتا ہوں۔“

”کیا آپ میری اور میرے خاندان والوں کی زندگیوں کا تحفظ کر سکیں گے۔“

”حتی الامکان۔“

”وہ اس علاقے میں موت کا فرشتہ مشہور ہے۔ یہاں کے سربراہ آدرہ لوگ بھی اُس کی

خوشی میں ہیں۔ لیکن کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔“

”اگر وہ اس علاقے میں اتنا ہی مشہور ہے تو شاداں نے کبھی اس کا نام کیوں نہیں سنا۔“

”شاداں کیا جانے گی..... وہ بیچاری اس کے لئے کیا کر سکے گی۔ اس کے شکار تو ہم

ہیے لوگ ہیں جن سے وہ بڑی رومات حاصل کر سکتا ہے اور آلہ کار بنا کر سرکار دربار سے بھی

پنے کام نکال سکتا ہے۔“

اوه..... تو آپ نے اب تک اس کے لئے کیا کیا ہے؟“

”مم..... میں نے..... میں نے اس کی بات نہیں مانی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ میں چودھری

ثیرلی کی قبر کھود کر دیکھوں کہ حقیقتاً انہی کا مردہ دفن کیا گیا ہے یا کوئی اور۔ لیکن میں نے آپ

کو بتایا تھا کہ کچھ لوگ اس لئے میرے پیچھے لگ گئے ہیں کہ میں نے چودھری کی قبر کھودنے

کی کوشش کی تھی۔ میں نے یہ غلط بیانی اس لئے کی تھی کہ آپ شہود سے ان لوگوں کی تلاش

شروع کر دیں۔ یقین کیجئے یہ ریت کا دیوتا..... بارڈر ایریا کے لوگوں کے لئے مصیبت بنا ہوا

ہے۔ میری حویلی میں پائی جانے والی لاش اس کی طرف سے میرے لئے ایک دھمکی تھی اسی

کے آدمیوں میں سے کسی نے کپتان صاحب کو اس لاش تک پہنچایا تھا اور آج یہ ثابت ہو گیا

کہ عاقل خان جو ہر وقت میری گردن کاٹ سکتا ہے، اسی کے کارندوں میں سے ہے۔“

”وہ اب کہاں مل سکے گا؟“

”تراب نگر میں میرے فارم میں..... وہیں ہوگا..... میں نے آپ کے گوش گزار کر دیا۔“

اب میں اپنا اور اپنے خاندان والوں کا تحفظ چاہتا ہوں۔“

”اُس کے افراد خاندان کہاں رہتے ہیں۔“

”بشمالی سرحد کے قریب کسی علاقے میں۔ میں نے ان میں سے کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔“

اطلاع نے خود مجھے ہی آنے پر مجبور کر دیا۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ شمشاد چند لمحے خاموش رہا

”جب میں کپتان صاحب کے ٹائروں کی مرمت کر رہا تھا ایک آدمی نے مجھے بتایا

سے پٹرول کے ٹن نکال کر اندر لے جانے والا میرا میجر عاقل خان ہی تھا۔“

”اچھا.....!“ فریدی نے تقہمی انداز میں سر کو جنبش دی۔

”اور اب وہ سرے سے غائب ہے۔“

”غالباً آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی حویلی میں آگ لگا کر لاش کو مٹا کر دیا

عاقل خان ہی تھا۔“

”اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے۔ اگر یہ حرکت اسی کی ہے تو پھر یقین کے ساتھ

جاسکتا ہے کہ وہ اس شخص سے واقف تھا جس کی لاش میں نے حویلی میں دیکھی تھی۔“

”کل حویلی میں پہنچنے سے قبل آپ دونوں کتنے عرصہ تک ساتھ رہے تھے۔“

”میں یہاں تنہا تھا، وہ زمینوں پر تھا۔ کل صبح یہاں میرے پاس آیا تھا۔ کچھ کاغذات

ضرورت تھی۔ لہذا میں اسے ان کاغذات کے لئے اپنے ساتھ حویلی لے گیا تھا۔“

وہ خاموش ہو گیا اور فریدی پر تفکر انداز میں سر ہلا کر بولا۔ ”تب تو بہت کچھ سوچا

ہے۔ اس کے بعد کمرے کی فضا پر گہرا سکوت طاری ہو گیا تھا۔“

”کھاتے رہئے۔“ حمید نے شمشاد سے کہا۔ ”باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔“

”میں بہت پریشان ہوں کپتان صاحب۔“

”اللہ فضل کرے گا۔ یہ لیجئے..... کباب بہت لذیذ ہیں۔“

دفعۃ فریدی نے اسے مخاطب کر کے کہا۔ ”کیا آپ کا خیال ہے کہ عاقل خان

ریت کے دیوتا کے پیاریوں میں سے ہے۔“

شمشاد کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ پڑا۔

”ررر ریت کا دیوتا..... کک..... کیا مطلب؟“

”مطلب آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔“ فریدی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا

ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

برآمدے میں آئے۔

”اوہ..... یہ ی گاڑی۔“ فریدی بولا۔

واقعی اس دھوئیں کی اوٹ سے کوئی فریدی کی لنکن لے بھاگا تھا۔

کپاؤنڈ میں شمشاد کی جیب اور حمید کی گاڑی موجود تھی اور شمشاد کے دونوں ملازم بھی

جیب ہی میں بیٹھے دکھائی دیئے۔ پھر یہ کون تھا۔ لنکن لے گیا۔

بہر حال انہیں اس کے پیچھے جانا پڑا تھا۔ حمید اپنی گاڑی اسٹارٹ کر رہی رہا تھا کہ شمشاد

بھی کچلی سیٹ پر آ بیٹھی۔

”تم کہاں..... جاؤ..... اندر بیٹھو۔“

”بس چپ چاپ چلے چلے..... میں ایسی ڈرپوک نہیں ہوں۔“

فریدی شمشاد کی جیب میں تھا اور خود ہی اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔ شمشاد اس کے برابر بیٹھا تھا اور اس کے دونوں ملازم کچلی سیٹ پر تھے۔

وہ پھانک سے گزر گئے۔ فریدی شمشاد اپنی گاڑی کے ٹائروں کے نشانات پر جیب دوڑا رہا تھا۔ گاڑی تو نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

”وہ کون ہو سکتا ہے؟“ حمید بڑبڑایا۔

”خدا جانے..... لیکن وہ دھماکہ۔“

”دھوئیں کا ایک چھوٹا سا بے ضرر بم۔“

”مقصد.....؟“

”مقصد یہی کہ اسے لنکن لے بھاگنے کا موقع مل جائے۔ اگر ہم برآمدے میں نہ بیٹھے

ہوتے تو شمشاد وہ بم نہ پھینکتا۔“

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی رہیں۔ مگر لنکن ابھی تک تو دکھائی نہیں دی تھی۔ پتہ

نہیں تھی تیز رفتاری سے لے جانی گئی تھی۔ کچے راستے کے اختتام پر جیب رک گئی۔ حمید نے

جیب اپنی گاڑی کی رفتار کم کی اور اسے جیب کے قریب روک دیا۔

فریدی اور شمشاد کو نیچے اترتے دیکھ کر خود بھی اُترا اور ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔ لنکن

سے نشانات کچی سڑک پر دائیں جانب گھومے تھے۔ یعنی مشرق کی سمت۔

عاقل خان تین سال پہلے میرے پاس ملازمت کے لئے آیا تھا اور اپنی کارکردگی کی عرصہ میں منیجر کے مہدے تک پہنچ گیا۔“

حمید خاموشی سے ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ اتنے میں شمشاد آگئی۔

”کچھ اور چاہئے۔“ اس نے حمید سے پوچھا۔

”چورن.....!“

”بھینس کے سری پائے نہیں کھائے آپ نے۔“

حمید کھانا ختم کر چکا تھا۔ فریدی نے اسے اشارہ کیا کہ شمشاد کو وہاں سے ہٹالے جائے۔

حمید اٹھتا ہوا ہوا۔ ”اچھا تو شادو جی اب چل کر رات کے کھانے کی تفصیل سن لیجئے۔“

لڑکی نے اسے بے اعتباری سے دیکھا اور دروازے کی طرف مڑ گئی۔

کمرے سے نکل کر وہ بیرونی برآمدے میں آ بیٹھے۔ دھوپ کی تیش کے باوجود

کیوں حمید وہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔

”آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔“ شمشاد نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

”زرگی کو فتنے، گلابی قورمہ، نیلا اسٹو، کالا پلاؤ، بنفشی روٹیاں۔“

”حمید صاحب؟“

”کھل کر بات کرو..... کیا تم شمشاد کو اچھا آدمی نہیں سمجھتیں۔“

”جب تک کسی کی کوئی بُرائی سامنے نہ آجائے میں اسے اچھا ہی سمجھتی رہتی ہوں۔“

”کبھی چودھری صاحب سے اس کا جھگڑا بھی ہوا تھا۔“

”میرے علم میں تو ایسی کوئی بات نہیں۔“

”شماد عزیز سے۔“

”اس کا بھی علم نہیں۔“

”تمہاری اعلیٰ مجھے پاگل کر دے گی۔“

دفترا کیوں سے دھماکے کی آواز آئی اور وہ دونوں اچھل پڑے۔ پائیں باغ کے

کے قریب کثیف دھوئیں کے سرغولے اٹھ رہے تھے۔

حمید واقعے کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ فریدی اور شمشاد دوڑتے ہوئے

یہ وہی سڑک تھی جس سے وہ سعد آباد تک پہنچے تھے اور اب سعد آباد سے مشرق کی طرف سرحدی علاقے میں داخل ہو رہے تھے۔ شمشاد کی جیب آگے تھی اور حمید محسوس کر رہا تھا کہ فریدی شمشاد سے آگے نکل جانے کی کوشش نہیں کر رہا۔

”کیا خیال ہے؟“ حمید آہستہ سے بولا۔ ”وہ عاقل خان تو نہیں ہے۔“

”میں غیب دان نہیں ہوں۔“ فریدی نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ پھر اونچی آواز میں

شایدہ کو مخاطب کر کے پوچھا۔ ”کیا تم عاقل خان کے بارے میں مجھے کچھ بتا سکو گی۔“

”جی نہیں! میں نے صرف اس کا نام سنا ہے۔ کبھی شکل بھی نہیں دیکھی۔“

”کیا وہ شمشاد کے بہت اہم ملازمین میں شمار کیا جاتا ہے۔“

”اہم ترین۔ شمشاد کی بہت سی زمینیں جو دوسروں کے قبضے میں تھیں محض اسی کی حکمت

نہی کی بناء پر اسے واپس مل گئی ہیں۔“

”تو گویا وہ ان اطراف میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔“

”جی ہاں۔“

فریدی نے پھر کچھ نہیں پوچھا تھا۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی رہیں کچھ دیر بعد وہ ایسے علاقے میں داخل ہوئے جہاں سڑک کی دونوں اطراف میں اونچی نیچی چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔

”کیا بارڈر تک جانے کا ارادہ ہے؟“ حمید نے تھکی تھکی آواز میں پوچھا۔

”ہو سکتا ہے۔“

”فرض کیجئے ہم غلط سمت جا رہے ہوں۔ اس نے ہمیں غلط راہ پر ڈالنے کیلئے کچھ زمین

پراس قسم کے نشانات ڈالے ہوں اور سڑک پر پہنچنے کے بعد مخالف سمت میں موڑ لی ہو۔“

فریدی کا جواب سننے سے پہلے ہی شایدہ نے قہقہہ لگایا۔

”اس میں ہنسنے کی کیا ضرورت ہے؟“ حمید جھلا گیا۔

”آپ کی سادگی پر ہنسی آئی کپتان صاحب..... یا کھٹل صاحب نے اس کے امکان پر

پہلے ہی نظر نہ رکھی ہوگی۔“

”زیادہ قابلیت بگھا روگی تو گاڑی سے اتار دوں گا۔“

”حمید کی گاڑی میں فیول پوزیشن کیا ہے؟“ فریدی نے شمشاد سے پوچھا۔

”ٹینک فل تھا..... اور ڈگی میں بھی زائد پٹرول موجود ہے۔ میں نے کپتان صاحب خسارہ پورا کر دیا تھا۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ ہم جائیں گے کہاں۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔

”وہ کون ہو سکتا ہے۔“ حمید فریدی کی طرف دیکھ کر بڑبڑایا۔

”تم تو باہر ہی تھے..... تم ہی بتاؤ۔“

”دھوئیں کی آڑ میں لے بھاگا۔ میں نہیں دیکھ سکا تھا؟“

”ہوگا کوئی..... لیکن وہ میری گاڑی اتنی آسانی سے تو نہیں لے جاسکتا۔ شمشاد صاحب

آپ چاہیں تو واپس جاسکتے ہیں۔“

”نہیں صاحب، یہ کیسے ممکن ہے۔“ شمشاد حمید کی گاڑی کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”لیکن یہ بیوقوف لڑکیوں چلی آئی ہے۔“

فریدی نے جواب طلب نظروں سے حمید کی طرف دیکھا۔

”میں کچھ نہیں جانتا۔ زبردستی بیٹھ گئی تھی۔“

”تم نے منع کیوں نہیں کیا.....؟“

”کیا آپ نہیں جانتے کہ وہ آدھی پاگل معلوم ہوتی ہے۔ کچھ دیر پہلے مجھ سے کہہ رہا

تھی کہ میرا گلا گھونٹ دو اور مجھے بھی چودھری بابا کی قبر میں دفن کر دو۔“

”یہ کہہ رہی تھی۔“ شمشاد نے متحیرانہ لہجے میں کہا۔

”یقین کیجئے اور سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔“

”بہت چاہتی تھی چوہدری صاحب کو۔“ شمشاد نے مغموم آواز میں کہا۔

”اچھی بات ہے تو میں تمہاری ہی گاڑی میں چلوں گا۔“ فریدی حمید کو مخاطب کر کے بولا۔

شمشاد کے چہرے پر ایسے تاثرات نظر آئے جیسے فریدی کی بات سمجھ میں نہ آئی ہو لیکن

وہ کچھ بولا نہیں تھا۔

فریدی حمید کی گاڑی میں جا بیٹھا اور اسٹیرنگ بھی خود ہی سنبھالتے ہوئے شمشاد کو آگے

بڑھ جانے کا اشارہ کیا۔

فریدی نے پھر گاڑی روک دی۔ حمید دروازہ کھول کر نیچے کودا۔ لٹکن خالی تھی۔  
فریدی اور شاہدہ بھی گاڑی سے حمید کے پاس آکھڑے ہوئے تھے لیکن فریدی بغور  
رودیش کا جائزہ لے رہا تھا۔

دفعۃ فریدی نے ان سے کہا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“  
وہ ایک چٹان کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ دونوں نے اس  
کی تقلید کی۔

تھوڑی سی جدوجہد کے بعد وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سے دونوں گاڑیوں پر نظر بھی رکھ  
سکتے تھے اور خود ان کے دیکھ لئے جانے کا امکان نہیں تھا۔

”اب یہاں کیا کر رہے ہیں۔“ شاہدہ حمید کے کان کے قریب منہ لا کر آہستہ سے  
بولی۔ ”گاڑی سنبھالنے اور واپس چلئے۔“

دفعۃ فریدی نے حمید سے کہا۔ ”تم دونوں بیٹھو اور یہ لو۔“  
اس نے لٹکن کے مختلف خانوں کی کنجیاں اسے دی تھیں پھر حمید نے اسے دوبارہ نیچے  
جاتے دیکھا۔

وہ حمید کی گاڑی پر بیٹھا تھا اور اسے آگے بڑھاتا چلا گیا تھا۔ بالآخر وہ بھی نظروں سے  
اوجھل ہو گیا۔

”آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ شاہدہ بولی۔

”آہستہ..... تمہاری آواز اونچی نہ ہونی چاہئے۔ اب تم ہمارے ساتھ آنے کی سزا بھگتو گی۔“  
”کک..... کیا مطلب؟“

”مطلب کشت و خون کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ شی.....!“ وہ دونوں پر انگلی رکھ کر  
خاموش ہو گیا اور کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ کسی وزنی گاڑی کی آواز تھی جو بتدریج قریب  
ہوتی معلوم ہو رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے شمشاد کی جیب وہیں آ رہی جہاں لٹکن کھڑی تھی  
وہ اور اس کے ساتھی جیب سے کودے اور لٹکن کے قریب پہنچ گئے۔ شمشاد نے گاڑی میں سر  
ڈال کر کچھ دیکھا تھا اور پھر جیب کی طرف پلٹ گیا تھا۔

وہ تینوں دوبارہ جیب میں بیٹھے اور جیب بھی ادھر ہی چل دی جدھر فریدی گیا تھا۔

”سچ سچ بچوں کی سی باتیں کرنے لگے آپ.....!“

اچانک فریدی نے گاڑی روک دی۔ شمشاد کی جیب اگلے موڑ پر نظروں سے  
ہو چکی تھی۔

فریدی کھڑکی پر جھکا ہوا بائیں جانب والی چٹانوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ حمید بھی ادھر  
متوجہ ہو گیا اور پھر ایک بیک چونک پڑا۔ دو چٹانیں اس طرح کھڑی تھیں جیسے دو تلواریں کو  
کر کے محراب بنائی گئی ہو۔

”کیا خیال ہے۔“ فریدی حمید کی طرف مڑ کر مسکرایا۔

”گاڑی ان چٹانوں کے درمیان سے گزر سکتی ہے دور تک راستہ ہموار نظر آ رہا ہے  
حمید نے کہا۔

فریدی نے گاڑی بیک کی اور پھر اسے چٹانوں کی طرف موڑ دیا۔ شمشاد کی جیب کا  
دور تک پتا نہیں تھا۔

گاڑی چٹانوں کی محراب سے گزرنے لگی تو شاہدہ نے کہا۔ ”ضروری نہیں کہ وہ آپ  
گاڑی ادھر ہی لے گیا ہو۔“

اس بار حمید نے کچھ ایسے انداز میں قہقہہ لگایا کہ شاہدہ سچ سچ بگڑ گئی۔

”آپ ہنسے کیوں؟“

”تمہارے اسی احمقانہ اظہار خیال پر..... کرنل صاحب اس زمین کی مخلوق نہیں ہیں  
بیرونی خلاء کے کسی گم نام سیارے سے ہماری زمین پر نزول اجلال فرمایا ہے۔ اگر یہ بات  
ہوتی تو اب تک کئی شادیاں کر چکے ہوتے۔“

”کیا بکو اس ہے۔“ فریدی غرایا۔

گاڑی ڈھلان میں اتر رہی تھی اور اب اس کے سڑک پر سے دیکھ لئے جانے کا امکان  
نہیں تھا۔

”یہاں تو کسی دوسری گاڑی کے نشانات بھی نہیں دکھائی دیتے۔“ شاہدہ پھر بولی۔  
بہت زیادہ مضطرب نظر آ رہی تھی۔

ڈھلوان کے اختتام پر جیسے ہی راستہ بائیں جانب مڑا فریدی کی لٹکن کھڑی نظر آئی۔



”ارے تو وہ بھی یہیں کہیں ہوں گے۔ لیکن یہاں چھوڑ کر پیدل نہ گئے ہوں گے۔“

”کچھ بھی ہو..... میں بھی چلوں گی۔“

”اللہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”کیا مطلب.....؟“

ابھی تک مجھے شادی کی توفیق نہیں دی۔

”باتیں نہ بنائیے چلتے۔ میں بھی خطرہ محسوس کر رہی ہوں۔ کرئل صاحب اکیلے گئے ہیں۔“

”وہ دونوں چنانوں سے نیچے اترے اور لیکن میں جا بیٹھے۔ حمید نے بڑی پھرتی سے

اپنی طرف کے دروازے کا خانہ کھول کر ٹامی گن نکالی تھی اور اسے گود میں رکھتے ہوئے شاہدہ

سے کہا ”آج تمہیں شاہدہ ایڈونچر کا عملی تجربہ ہو جائے۔ ابھی تک تو صرف خواب دیکھے ہوں گے۔“

”آپ نے کس نے بناء پر کہا تھا کہ چودھری بابا گاڑی لے بھاگے تھے؟“

”پھر کان کھانے لگیں خود دیکھ لیتا۔“

شاہدہ کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ حمید نے اسے کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے گاڑی اشارت

کی۔ اس جگہ سے بہتے ہی حمید نے محسوس کیا کہ لیکن وہیں کیوں چھوڑ دی گئی تھی۔ راستہ ایسا تھا

کہ جیپ کے علاوہ اور کسی گاڑی کا ادھر سے گزرنا ناممکن ہی تھا۔

گاڑی کو دوبارہ بیک کر کے اسی جگہ پر واپس لانا پڑا۔ اب سوچ رہا تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔

ٹامی گن ایک طرف رکھ کر باہر نکلا دوسرے دروازے کا خانہ کھولا اور جیکٹ نکالی جس

کے اسٹر میں ریوالور کے کارتوس لگے ہوئے تھے۔

جیکٹ پہن کر باہر نکلا اور شاہدہ سے بھی اترنے کو کہا۔

”ہمیں بیدل ہی چلنا پڑے گا۔“ اس نے ٹامی گن اٹھاتے ہوئے اس سے کہا۔

”مگر کچھ کیجئے بھی تو.....!“ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

”تم آخر یہیں کیوں نہیں ٹھہرتیں۔“

”میں کہہ چکی ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔“

دفعۃً دور سے کئی فائروں کی آوازیں آئیں اور وہ دونوں چونک کر چاروں طرف دیکھنے لگے۔

”دوسری بار حمید سمت کا تعین کر۔ کا اور پھر اس نے بے تحاشہ اسی سمت دوڑ لگائی تھی۔ مڑ کر

سید نے طویل سانس لی۔

## دیوتا خاک پر

”آپ بتاتے کیوں نہیں کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ شاہدہ اس کا شانہ جھنجھوڑتی ہوئی بولی۔

حمید نے اتنی تیزی نظر سے دیکھا۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔

لیکن کی کنجیاں فریدی اسے دے گیا تھا۔ مقصد اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

مردوت پڑنے پر وہ اپنی عقل استعمال کر سکے۔

دفعۃً اس نے شاہدہ سے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا کیا کروں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”اب جو کچھ ہو نیوالا ہے..... وہ کم از کم شوقیہ ایڈونچرز کے بس کا روگ نہیں ہوگا۔“

”میں کچھ نہیں سمجھی۔“

”آپ کے چودھری بابا اعلیٰ پیمانے پر کشت و خون کرنے والے ہیں۔“

”کک..... کیسے.....؟“

”میرا دعویٰ ہے کہ لیکن وہی لے بھاگے تھے۔“

”نہیں..... یہ ناممکن ہے؟“

”دیکھ لیتا..... جاسوسی ناول پڑھ پڑھ کر سراغ رساں بن بیٹھنے والے ایسی ہی حقائق

کرتے ہیں۔“

”آپ ان کی شان میں گستاخی کر رہے ہیں۔“ شاہدہ بگڑ گئی۔

”میں بحث کے موذ میں نہیں ہوں..... تم یہیں ٹھہرو..... میں جا رہا ہوں۔“

”یہ ناممکن ہے..... میں بھی چلوں گی۔ اگر وہ چودھری بابا ہیں تو میں یہاں بیٹھ کر تمہارا

ایسی کا انتظار نہیں کر سکتی۔“

یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ وہ اس کے پیچھے آرہی ہے یا نہیں۔

نامی گن بغل میں دبائے دوڑا جا رہا تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد اسے اپنی گاڑی کی  
ی جوراستے سے ہٹ کر ایک چٹان کی اوٹ میں کھڑی تھی۔ جھپٹ کر اسکے قریب پہنچا۔  
اس نظر دوڑائی لیکن فریدی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پھر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ شاہدہ بھی پہنچ گئی  
”اچھی بات ہے..... آؤ۔“ حمید بھنا کر بولا۔

کچھ دور چلنے کے بعد پھر رکنا پڑا کیونکہ شمشاد کی جیب بھی کھڑی نظر آئی تھی لیکن وہ  
اس کے ساتھی غائب تھے۔

اس جگہ سے فائروں کی آوازیوں کا رخ بدلا ہوا لگا تھا۔ وہ بائیں جانب کے تنگ  
رے میں داخل ہو گیا۔

شاہدہ اس کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے پیچھے چل رہی تھی۔ حمید کا دل چاہ رہا تھا کہ  
اس کو کسی اونچی چٹان سے نیچے پھینک دے۔ پچھلی زندگی میں کوئی ایسا موقع یاد نہ آیا کہ وہ  
کسی لڑکی پر اس شدت سے جھلایا ہو۔

وہ پھر کھلے میں نکل آئے۔ لیکن اب سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرف جائے۔ فائر  
کی آوازیں اب نہیں سنائی دے رہی تھیں۔

”پتہ نہیں..... کہاں کیا ہو رہا ہے؟“ شاہدہ بڑبڑائی۔

اچانک پھر تین فائر ہوئے۔ یہ اتنے قریب کے تھے کہ حمید کو بڑی پھرتی سے ایک  
کی اوٹ لینی پڑی تھی۔ پھر وہ دانت پیس کر بولا۔ ”اب بتاؤ! میں تمہیں کوٹ کی جیب  
رکھوں یا پیس کر پی جاؤں۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ مشکلات میں پڑ کر آپ جیسے مرد عورتوں سے بدتر ہو جاتے  
ہیں۔“ وہ ہانپتی ہوئی بولی اور پھر اس نے زبردستی ہنسنے کی کوشش کی تھی۔

اس ریمارک پر حمید بور ہو کر خاموش ہی ہو گیا۔ فائر ہوتے رہے۔ گولیاں ان کے سر  
پر سے گزر رہی تھیں لیکن فائر کرنے والے نظر نہیں آرہے تھے۔

ان کی دونوں جانب اونچی اونچی چٹانیں تھیں اور دونوں ہی اطراف سے فائر  
ہو رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا مقابلہ..... فریقین ایک دوسرے پر گولیاں برسا رہے تھے۔

اندازہ لگانا محال تھا کہ وہ کون ہوں گے۔

شمشاد اور لنکن لے بھاگنے والے کے درمیان بھی ٹھن سکتی تھی۔ حمید سوچ رہا تھا۔ ممکن  
ہے فریدی بھی فی الحال محض ایک تماشائی کی حیثیت سے حالات کا جائزہ لے رہا ہو۔  
”کچھ سمجھو!“ شاہدہ مضطربانہ انداز میں بڑبڑائی۔

”چپ چاپ بیٹھی رہو۔“

”میرا دعویٰ ہے کہ کرنل صاحب خطرے میں ہیں۔“ شاہدہ نے کہا۔

”کیا تم بتا سکو گی کہ کرنل صاحب کس طرف ہوں گے۔“

”نہیں.....؟“

”تو کیا میں پھر کھلے میں نکل کر ناچنا شروع کر دوں۔“

شاہدہ پھر کچھ کہنے والی تھی کہ اچانک بائیں جانب سے ایک چیخ فضا میں ابھری اور کوئی  
اوپر سے لڑھکتا ہوا ایک بڑے سے پتھر کی اوٹ میں جا گرا۔

”پتہ نہیں کون ہے۔“ شاہدہ ہلکائی۔

حمید کچھ نہ بولا۔ اس نے گرنے والے کی بس ایک جھلک دیکھی تھی۔ دائیں جانب  
سے پھر فائر ہوئے اور اس کے بعد سناٹا چھا گیا۔

اب حمید دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں سن رہا تھا۔ دائیں جانب کی چڑھائی سے  
تین آدمی نیچے اتر رہے تھے۔ اس نے انہیں خاصے فاصلے سے بھی پہچان لیا۔ یہ شمشاد اور اس  
کے دونوں ساتھیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتے تھے۔ شمشاد کے ہاتھ میں رائفل تھی۔

وہ دوڑتے ہوئے اس پتھر کے قریب جا پہنچے جسکی دوسری طرف غالباً انہی کا شکار گرا تھا۔  
”چلو.....!“ حمید شاہدہ کو دوسری طرف دھکیلتا ہوا بولا۔ ”باہر نکل کر اسے آواز دو.....“

بلکہ دوڑتی ہوئی اس کی طرف جاؤ۔“

”لگ..... کیوں.....؟“

”کام بتایا تو ہکلانے لگیں بی شیرنی۔“

”اچھا.....!“ کہتی ہوئی وہ اچھل کر پتھر کی اوٹ سے نکل گئی اور قلع چھاڑ کر شمشاد  
کو آوازیں دینے لگی۔

دوس کہ دیکھ کر شاہد عزیز نقلی ڈاڑھی لگائے پھرتا تھا اور شیر علی کی قبر میں انہی کا ہم شکل کا مجسمہ فن کیا گیا تھا۔“

دفعۃً شاہد داہنی جانب دیکھ کر چیخا۔ ”بابا.....!“

جس تک سے درے سے گزر کر وہ دونوں کچھ دیر پہلے یہاں پہنچے تھے اسی سے ایک آدمی برآمد ہوا تھا۔ قابل رشک حد تک توانا اور صحت مند تھا۔ شاہد اس کی طرف تیزی بڑھی تھی اور اسکے شانے سے لگ کر کسی ننھی سی بچی کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ حمید نے اس موقع پر خود کو بڑی مشکل سے سنبھالا۔ ورنہ شاہد نامی گن اس کے ہاتھ پھوٹ پڑی ہوتی۔

”اچھا تو خود..... یہی حضرت تھے۔“ شمشاد نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”کرل صاحب ری شیر علی خان سے ملے..... اور ان سے پوچھئے کہ یہ ڈرامہ کیوں اسٹیج کیا گیا تھا۔“

بوڑھے نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے شاہد کو الگ ہٹایا اور پُر وقار انداز چلتا ہوا قریب آ گیا۔

”ہاں..... کرل کی گاڑی میں ہی لے نکلا تھا۔“ اس نے گونجیلی آواز میں کہا۔ ”اس لئے میں اس طرف ان کی رہنمائی کرنا چاہتا تھا۔“

”میں کہتا ہوں اس شخص کو قابو میں کیجئے۔“ شمشاد نے فریدی سے کہا۔ ”ورنہ ہم سب مازندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔“

”خوب.....!“ بوڑھا دفعۃً مسکرا کر بولا۔ ”ایسی سینہ زوری کی مثال شاید کہیں نہ مل سکے۔“

”اب مجھ سے صاف صاف سنئے۔“ شمشاد نے غصیلے لہجے میں فریدی سے کہا۔ ”میرا غم عاقل خان بھی اس کے ساتھیوں میں سے ہے۔“

”ہے نہیں بلکہ تھا۔ شمشاد صاحب۔“ بوڑھے نے پُر سکون لہجے میں کہا۔ ”اور سچ مجھ وہ میرا ساتھی تھا۔ اسی نے تمہاری غیر قانونی حرکتوں کی اطلاع مجھ تک پہنچائی تھی..... لیکن بیچارہ۔“

”آپ سن رہے ہیں۔“ شمشاد نے پھر فریدی کو مخاطب کیا۔

بوڑھے نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکالی اور حمید کے قریب پہنچ کر بولا۔ ”ذرا اسے تو دیکھنا کیا تم اسے پہچانتے ہو۔“

شمشاد مڑا تھا اور پھر اپنے دونوں ساتھیوں سمیت دوڑ لگائی تھی۔ ان کا رخ تبدیل ہوتے ہی حمید نے بھی اپنی پوزیشن بدل لی۔

شمشاد رانفل کی نال شاہد کے سینے پر رکھتا ہوا دھاڑا۔ ”بتاؤ..... شیر علی کہاں ہے؟“

”انکل، انکل یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”بکواس بند کرو..... اس کی قبر میں پلاسٹک کا ایک مجسمہ فن کیا گیا تھا۔“

ٹھیک اسی وقت ایک فائر ہوا اور شمشاد کے ہاتھ سے رانفل چھوٹ پڑی۔ اسکے بعد حمید نے اپنی پھرتی دکھائی تھی۔ نامی گن سنبھالے ہوئے اسکے سامنے آ گیا۔

”خبردار..... کوئی اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرے۔“

تینوں نے بے ساختہ ہاتھ اٹھا دیئے اور شاہد اچھل کر پیچھے ہٹ گئی۔

”آپ مجرموں کی حمایت کر رہے ہیں۔“ شمشاد غرایا۔

”وہ کس طرح جناب عالی!“ حمید نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

”میں بتاتا ہوں۔“ دفعۃً بائیں جانب سے آواز آئی۔ فریدی اس پتھر کی اوٹ سے باہر آ رہا تھا جس کے پیچھے شمشاد کا شکار گر رہا تھا۔

شمشاد کے چہرے پر ہوا یاں اڑنے لگیں۔

فریدی نے قریب پہنچ کر تینوں کی جامہ تلاشی لی۔ شمشاد کے ساتھیوں سے خنجر برآہ ہوئے اور شمشاد سے اعشاریہ تین دو کا پستول۔

”آپ لوگ میری بات نہیں سن رہے..... پچھتانا پڑے گا۔“ شمشاد نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”تم نے مجھ پر کیوں فائرنگ کی تھی۔“ فریدی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”محض غلط فہمی کی بناء پر۔“

”میں نے آواز دے کر تمہیں آگاہ بھی کر دیا تھا۔“

”میں نے آواز نہیں سنی تھی..... میں سمجھا تھا وہی ہے جو آپ کی گاڑی لے بھاگا تھا۔“

”کچھ اندازہ ہے کون لے بھاگا ہوگا۔“

”آپ چودھری شیر علی کی حویلی میں مقیم تھے۔ میں کیا بتا سکتا ہوں۔ لیکن اتنا ضرور“

”افنی کے اس پار..... جہاں اس قسم کے فراڈ نہ ہوتے ہوں..... اور اس لڑکی سے تو خدا نے گا۔“ بوڑھے نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا ہی تھا کہ حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”بس کچھ نہ فرمائیے گا۔“

”کیوں بروردار.....!“

”شیر علی خان کی کہانی آپ نے کس سے سنی تھی؟“

”اچھا..... سمجھا۔ یقین کرو کہ تم میرے بھانجے ہو اور میرے مرنے کے بعد ہی تمہیں طلاق ملے گی اگر اس فتنے کا خاتمہ نہ کرنا ہوتا۔ اب آؤ..... میرے سے لگ جاؤ میرے بچے۔“

”لا حول ولا قوۃ.....!“ حمید آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”کیا میں کوئی روائتی فلم دیکھ رہا ہوں۔“

”نہ نامی گن فریدی کو تھائی تھی اور بیہوش شمشاد کے پاس جا بیٹھا تھا کیونکہ اسے اس کے

س میں جنبش سی نظر آئی تھی اور پھر دوسرے ہی لمحے میں اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شمشاد

بیٹھا۔ حمید اس کا داہنا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے چیخا۔ ”یہ کچھ کھالینے کی

ش کر رہا تھا۔“

حمید سے اپنا ہاتھ چھڑانے کیلئے وہ بائیں ہاتھ سے اس پر گھونے برسائے جا رہا تھا۔

فریدی تیزی سے آگے بڑھا اور نامی گن ایک طرف پھینک کر شمشاد کی مٹھی کھولنے لگا۔

اسے سفید رنگ کی ایک ٹکیہ برآمد ہوئی تھی۔ شمشاد ایک بار پھر فریدی سے لپٹ پڑا اور حمید

، جھٹ کر نامی گن اٹھالی۔

”فائر کر دینے کی دھمکی کارگر نہیں ہوگی۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”یہ اب مرنا ہی تو چاہتا ہے۔“

پھر بڑی دشواری سے اس کے دونوں ہاتھ پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ وہ بالکل خاموش

اور بڑی خوفناک نظروں سے ایک ایک کو دیکھنے جا رہا تھا۔

پھر چودھری شیر علی خان ان قیدیوں سمیت انہیں اپنی ایک کمین گاہ تک لے گیا۔ یہاں

اس کے دو مسلح آدمی موجود تھے۔ قیدیوں کو ان کی تحویل میں دیتے ہوئے اس نے شاہدہ سے

کہا۔ ”تم بھی یہیں ٹھہرو گی۔“

”لعل..... لیکن.....!“

”خدا نہیں..... جو کہہ رہا ہوں وہی کرو۔“

حمید چونک پڑا۔ یہ تصویر اس آدمی کی تھی جس کی لاش اس نے شمشاد دیکھی تھی اور جسے بعد میں جلا کر ناقابل شناخت بنا دیا گیا تھا۔

”یہ وہی ہے جس کی لاش میں نے شمشاد کی حویلی میں دیکھی تھی۔“

”یہ عاقل خان کی تصویر ہے.....!“ بوڑھے نے کہا۔

اچانک شمشاد نے ان دونوں پر چھلانگ لگائی لیکن فریدی غافل نہیں تھا۔ اس

درمیان ہی سے روک کر دوسری طرف اچھال دیا تھا۔

وہ دوبارہ اٹھا اور دیوانوں کے سے انداز میں فریدی پر ٹوٹ پڑا۔

”تم دونوں اپنی جگہ سے ہلے بھی تو دھجیاں اڑ جائیں گی۔“ حمید نے

ساتھیوں کو وارننگ دی۔

شمشاد پاگلوں کی طرح لڑ رہا تھا۔ بھیڑیے کی طرح غرار رہا تھا۔ جسمانی قوت

نہیں معلوم ہوتا تھا اور اب حمید کو اندازہ ہوا کہ اپنی حویلی میں اس نے محض اداکاری کی

ظاہر کیا تھا کہ وہ لڑائی بھڑائی والے آدمیوں میں سے نہیں ہے اس لئے اتنی آسانی

ہو گیا تھا۔ اچانک وہ اپنی رائفل پر جاگرا۔ پھر اٹھا تو رائفل اس کے ہاتھ میں تھی۔

”رائفل زمین پر ڈال دو۔“ حمید دہاڑا۔

لیکن اس نے تو رائفل لٹھ کی طرح چلائی تھی۔ فریدی اچھل کر پیچھے ہٹا اور

ہی زور میں رائفل سمیت منہ کے بل زمین پر چلا آیا۔

پھر دوبارہ اٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ فریدی نے گرتے ہی سر پر ٹھوکر بھی رسید

اس کے دونوں ساتھیوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے۔ وہ بالکل خاموش

”آپ کو اپنی پوزیشن صاف کرنی ہے چودھری صاحب۔“ فریدی نے شیر علی

دیکھ کر کہا۔

”یقیناً میں آپ کو مطمئن کر دوں گا۔“

حمید نے نامی گن فریدی کی طرف بڑھاتے ہوئے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”سنبھالئے..... میں چلا۔“

”کہاں.....؟“

گا۔ اس طرح رنگے ہاتھوں پکڑ لیا جائے گا۔“  
 ”پیارے ماموں جان..... مجھے بھی کچھ عرض کرنے دیجئے۔“ دفعتاً حمید بولا۔  
 ”کہو کیا کہنا چاہتے ہو.....؟“

”اگر وہ ہم دونوں کو ٹھکانے لگا ہی دیتا تو کیا ہوتا۔“  
 ”برخوردار میں غافل تو نہیں تھا۔ میں تو اتنی بلندی پر تھا کہ تم سب مجھے صاف نظر آرہے تھے لیکن جب کرنل چیخ مار کر لڑھکتے ہوئے نیچے آئے تھے میں یہی سمجھا کہ خدا خواستہ..... بخدا میں نے ایسی کامیاب اداکاری کبھی نہیں دیکھی.....!“  
 ”لیکن آپ کو اس کا حق کیسے پہنچتا ہے کہ ہینڈ گرنیڈ وغیرہ رکھ سکیں۔“  
 ”بیٹے میں انیس ملٹری آفیسر بھی ہوں اور سرحد کی حفاظت کے لئے بہت کچھ اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔ باقاعدہ اجازت نامہ موجود ہے میرے پاس۔“  
 ”فضول باتوں میں نہ الجھاؤ۔“ فریدی نے حمید کو ٹوکا۔

”خیر..... اب میں اس کا طریق کار آپ کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کروں گا۔“  
 شیرعلی نے فریدی سے کہا۔ ”ڈیڑھ سو سال گزرے ان اطراف میں ایک ڈاکو زین خان ہوا کرتا تھا۔ دن میں ذی حیثیت لوگوں کو لوٹتا تھا اور رات کے اندھیرے میں مفلوک الحال افراد کی مدد کیا کرتا تھا۔ اس لئے غریبوں میں رات کا دیوتا کہلانے لگا تھا۔ جب انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھا کر مارا گیا تو ان اطراف کے غریبوں نے برسوں اس کا سوگ منایا تھا۔ پھر کسی بت تراش نے ایک بہت بڑی چٹان سے اس کا بت تراشا..... وہ بت آپ شاہد عزیز والی فلم میں دیکھ چکے ہیں۔ اسی بت کے نیچے سے ایک خفیہ راستہ پڑوسی ملک تک جاتا ہے۔ آج کل اس کا علم شمشاد کے گروہ کے علاوہ اور کسی کو بھی نہیں۔ ہاں تو اسی رات کے دیوتا کے مقابل انہوں نے ”ریت کا دیوتا“ تخلیق کیا، جو ”پاسورڈ“ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتا ہے۔ عاقل خان کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ گروہ میں شمشاد کی کیا حیثیت ہے..... ہاں..... بس ادھر آجائے بائیں جانب۔“

ہموار راستہ چھوڑ کر وہ بائیں جانب والی ایک تپلی سی دراڑ میں داخل ہوئے جس کا انتقام ایک غار کے دہانے پر ہوا تھا۔ شیرعلی خاں نے دیا سلائی کھینچی اور ہلکی سی روشنی آس

شاہد بڑا سامنہ بنا کر خاموش ہو گئی۔ پھر اس کے بعد وہ فریدی اور حمید کو اس جگہ پہنچا جہاں شمشاد کی جپ کھڑی تھی۔ یہاں سے وہ مغرب کی جانب ہوئے۔ ہموار راستہ اتنا کشادہ نہیں تھا کہ اس پر گاڑی چل سکتی۔

چودھری شیرعلی فریدی سے کہہ رہا تھا۔ ”شمشاد ذی اثر آدمی ہے۔ اگر میرا خلاف شبہ بھی ظاہر کرتا تو خود کسی بڑی مصیبت میں پڑ جاتا۔ لہذا میں نے یہ طریقہ شمشاد عزیز نے اس کے خلاف ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کی تھی اسی دوران میں شروع ہو گئے۔ شمشاد عزیز نے اسی وجہ سے اپنی ڈاڑھی مونچھیں صاف کرا دی تھیں اور کے میک اپ میں رہنے لگا تھا۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ پہلے تو شمشاد پڑوسی ملک اسمگلنگ کا کاروبار کرتا رہا تھا لیکن پھر جب اس نے اس ملک کے لئے جاسوسی شروع اس کا فیجر عاقل خان اس سے بد دل ہو گیا اس سلسلے میں اس نے مجھے اور شاہد عزیز بنایا۔ شمشاد عزیز نے اسی کی مدد سے وہ فلم تیار کی تھی جو آپ نے میری زیر زمین تجربا پرو جیکٹر پر دیکھی تھی اور اب میں آپ کو اسی راستے پر لے چل رہا ہوں۔“  
 ”کیا آپ کو علم تھا کہ وہ لاش عاقل خان ہی کی تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں..... آپ نے شادو کا کیمرا لے کر اس میں سے جو ریل نکالی تھی اسے ہی میں تو ڈیولپ کیا تھا اور خشک ہونے کے لئے اسے وہیں چھوڑ گئے تھے۔ پھر وہ عاقل خان ہی کی لاش تھی۔ میرا خیال ہے کہ شمشاد نے عاقل خان پر تشدد کر کے معلوم کی ہوگی کہ شاہد عزیز نے کوئی فلم تیار کی ہے۔ اس کے بعد اسے مار ڈالا ہوگا۔“  
 ”لیکن لڑکا کہہ رہا تھا کہ عاقل خان.....!“ حمید بولا ہی تھا کہ شیرعلی نے بات کہا۔ ”سنئے جاؤ! ادھر ہی آ رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے عاقل خان نے اسے میری حویلی کی آمادہ کیا ہو۔ لیکن غلط فہمی کی بناء پر وہ میرے ہی ہاتھوں زخمی ہو گیا۔ بہر حال شمشاد کا سن کر کہ وہ ان واقعات کا ذمہ دار عاقل خان کو ٹھہرا رہا ہے میں نے ہینڈ گرنیڈ دھماکا کیا اور آپ کی گاڑی لے بھاگا..... میں جانتا تھا کہ آپ لوگ میرے پیچھے دوڑیں اور شمشاد آپ کا ساتھ دے گا۔ نہ صرف یہ بلکہ آپ لوگوں پر حملہ کرنے کی کوشش بھی

زندہ مال بھی ہاتھ لگا ہے۔“

شمشاد حلق پھاڑ پھاڑ کر اسے گالیاں دینے لگا۔ اسی دوران میں اس زندہ مال کے ہاتھ بھی باندھ دیئے گئے۔

”ہاں تو کرنل صاحب۔“ شیر علی نے فریدی سے کہا۔ ”یہ زندہ مال اسی ملک کا جاسوس ہے جو شمشاد صاحب کے ذریعے ہمارے یہاں کھپایا جاتا۔ اس کا طریقہ شمشاد صاحب ہی انیس گئے۔ اب تک تقریباً سو ایسے جاسوس اس وطن فروش کے توسط سے اندرون ملک پہنچ چکے ہیں۔ یہ لیجئے اس کے کاغذات جو یہ شمشاد کے لئے لایا تھا۔“

دوسرے دن جب فورس کے ساتھ اس جگہ پر چھاپا مارا گیا تو شاہدہ بھی ان کے ہمراہ تھی۔ وہاں سے پندرہ آدمی گرفتار کئے گئے اور لاکھوں کا مال ہاتھ آیا جو پڑوسی ملک سے منسلک کیا گیا تھا۔

شاہدہ نے حید سے کہا۔ ”آپ تو شدت سے بور ہو رہے ہوں گے لاکھوں کی جائیداد کے مالک ہوئے ہوتے رہ گئے۔“

فریدی حید کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور حید تر سے بولا۔ ”آخر کس کس کی جائیدادیں سینٹا پھروں گا۔ کرنل صاحب اسی ڈر سے شادی نہیں کرتے کہ اگر کوئی وارث پیدا ہو گیا تو بیچارہ حید ان کی جائیداد کا مالک کیسے بنے گا..... اور میرے ساتھ یہ پرالم ہے کہ میں اپنا وارث کسے بناؤں گا کیونکہ ابھی تک لاؤلد ہوں اور مرتے دم تک لاؤلد رہنے کا ارادہ ہے۔“

”کیوں بکواس کر رہا ہے۔“ شیر علی آنکھیں نکال کر بولا۔

حویلی میں واپس آ کر جب وہ شام کی چائے پی رہے تھے شیر علی نے فریدی کو مخاطب کر کے کہا۔ ”آپ نے مجھے تہہ خانے میں ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔“

”تلاش کر کے نظر انداز کر دیا تھا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اسلئے کہ میں آپ کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ آپ نے تہہ خانے کے نیچے بھی تہہ خانے بنوائے ہیں۔ کیا اتنا کہہ دینا کافی نہیں۔ بہر حال آپ کو عدالت میں جواب دہی کرنی پڑے گی کہ آپ نے براہ راست انتظامیہ کے ذمہ داروں سے رابطہ قائم کرنے کی بجائے یہ ڈرامہ کیوں کیا؟“

”میں اپنی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کروں گا۔ پھر کہتا ہوں کہ اگر میں باضابطہ طور

پاس پھیل گئی۔ پھر اس نے دو مومی شمعیں روشن کی تھیں۔ یہاں انہیں وائر کول انجن والی موٹر سائیکلیں نظر آئیں۔ اس کے بعد کسی گوشے سے اس نے خاکی رنگ کی کچھ ٹوپیاں کر ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”اپنے ساز کی منتخب کر لیجئے۔“ تھوڑی دیر بعد وہ موٹر سائیکلیں دھکیلتے ہوئے سطح راستے کی طرف چلے جا رہے تھے۔ خاکی ٹوپیاں نے ان کے چہرے بھی ڈھک لئے تھے۔ صرف آنکھیں سوراخوں سے جھانک رہی تھیں۔ راستے پر وہ موٹر سائیکلوں پر بیٹھے اور سفر پھر شروع ہو گیا۔ یہ راستہ اتنا کشادہ بھی نہیں تھا کہ دو سائیکلیں برابر سے چل سکتیں۔

چودھری شیر علی کی گاڑی آگے تھی۔ پندرہ یا بیس منٹ چلنے کے بعد اچانک ایک ایک آدمی راقط تانے ہوئے سامنے آکھڑا ہوا۔ ”ریت کا دیوتا“ شیر علی نے بدلی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا اور اس نے ایک طرف ہٹ کر انہیں سلامی دی۔ موٹر سائیکلیں آگے نکلی چلی گئیں۔ اسی طرح مزید دو جگہ روکے گئے اور پاسورڈ ”ریت کا دیوتا“ انہیں آگے بڑھاتا رہا۔ حتیٰ کہ ”رات کے دیوتا“ کے بت تک آپہنچے۔ موٹر سائیکلیں روکی گئیں اور شیر علی خان نے اس جگہ تک ان کی رہنمائی کی جہاں سے خفیہ راستہ دوسرے ملک تک جاتا تھا۔

یہاں ایک بڑے غار میں انہیں بہت سا تجارتی سامان دکھائی دیا جس کی گمرانی چار آدمی کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”ایک زندہ مال بھی ہے صاحب۔“

”لاؤ.....؟“ شیر علی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اس پر ایک آدمی اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ شیر علی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔

”کاغذات.....!“ باہر نکل کر اس نے اجنبی سے کہا اور اجنبی نے اپنے کوٹ کی اندر لٹا جیب سے ایک لفافہ نکال کر اس کے حوالے کر دیا۔

واپسی کے سفر میں اجنبی اس کی موٹر سائیکل کے کیریئر پر بیٹھا تھا۔

دن رہے ہی وہ اس جگہ واپس آ گئے جہاں شمشاد اور اس کے ساتھی قیدیوں کی حیثیت سے بندھے پڑے تھے۔

”ثبوت مکمل ہو چکا ہے شمشاد صاحب۔“ شیر علی نے زہر آلود لہجے میں کہا۔ ”یہ دیکھتے

پر کوئی کارروائی کرتا تو آپ لوگ شمشاد پر ہاتھ نہ ڈال سکتے۔“

## جاسوسی دنیا نمبر 114

”عاقل خان کے علاوہ اور کسی کے پاس اس کے خلاف ثبوت نہ تھا اور آپ عاقل خان نے اسے کس طرح ٹھکانے لگا دیا۔ نہ صرف ٹھکانے لگا دیا بلکہ آپ لوگوں کو ہمارے پڑاؤ کی کوششیں کر ڈالیں کہ آپ زندگی بھر عاقل خان کو تلاش کرتے ہی رہ جاتے۔“

”پلیز..... پلیز.....!“ شاہدہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”اس مہم کو سر کرنے کا سہرا صرف ہمارے سر ہے..... اگر میں اس لاش کی تصویر نہ لے لیتی تو آپ عاقل خان کو تلاش ہی کر جاتے۔“

”یہ بات تو ہے.....!“ فریدی نے اعتراف کیا۔

”ایک بار پھر مرد بن کر دکھا دو۔“ حمید گھگھکیا یا اور شیر علی خان شاہدہ کی طرف

ہنس پڑا۔

# سانپوں کا مسیحا

تمام شد

(مکمل ناول)



ہوتی۔

ایک صاحب نے کویت سے لکھا تھا کہ پاکستان میں بہت سا کاغذ پرائمری اسکولوں کے ذریعے ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اگر ابتدائی تعلیم کے لئے کاغذ کی بجائے سلیٹ اور بتی سے کام چلایا جائے تو کاغذ کی کتنی بچت ہوگی۔ یہ تجویز بھی معقول ہے لیکن اس میں ایک دشواری ہے، اگر قوم کے بچے سلیٹ اور بتی کے عادی ہو گئے تو پھر یونیورسٹی پہنچ کر بھی سلیٹ اور بتی ہی پر مصر رہیں گے۔ کہ نہایت وضع دار بچے ہیں۔ ماشاء اللہ۔

بہر حال ان صاحب نے کاغذ کی بچت کے سلسلے میں جو شمار یاتی نقشہ بھیجا تھا اس کے تحمل یہ دو صفحات نہ ہو سکیں گے۔ ورنہ اُسے بھی پیش کر دیتا۔  
اُف نوہ..... کہا تھا کہ کاغذ کی بات نہیں ہوگی، لیکن پھر وہی کاغذ۔ ابتداء کاغذ اور انتہا کاغذ کہ کرنسی نوٹ بھی کاغذ ہی پر چھپتے ہیں اور اسی کاغذ کی وجہ سے کاغذ کے دام چڑھتے جا رہے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ کاغذ جیبوں میں پہنچے اور پبلشرز کاغذ کی ناؤ پر سوار اس جہاز کی تلاش میں سرگرداں ہیں، جو کسی دوسرے ملک سے سستا کاغذ لانے والا ہے، اپنے ملک میں بننے والا کاغذ تو کم قیمت کتابیں چھاپنے والے پبلشرز کی قوت خرید سے باہر ہو چکا ہے اور کیوں نہ ہو جائے جب کہ جواہرات اور ریشم کی لگدی سے تیار کیا جاتا ہے۔

والسلام

ابن صفحہ

۷۳/۰۲/۱۹

## پیشرس

”سانپوں کا مسیحا“ حاضر ہے۔ بہت دنوں کے بعد فریدی، حمید اور قاسم سے آپ کی ملاقات ہو رہی ہے۔ انور کی بھی ایک جھلک دیکھ لیجئے اور شکایت کیجئے کہ فریدی بھی محض ایک جھلک ہی بن کر رہ گیا ہے اور پھر یہ کہئے کہ کہانی مزید پھیلاؤ چاہتی ہے اور میں عرض کروں کہ کاغذ.....؟

چلئے نہیں روتا کاغذ کا رونا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اس وقت جب میں سطور لکھ رہا ہوں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کتاب کے لئے کاغذ بھی فراہم کر سکوں گا یا نہیں یا پھر فراہم شدہ کاغذ کی قیمت کتاب کی قیمت کا قیمہ کرتی ہے یا؟ خیر جانے دیجئے۔ اللہ مالک ہے۔ یہ کتاب تو بہر حال اسی قیمت پر آپ تک پہنچے گی۔

ایک صاحب رقم طراز ہیں کہ آپ خود ہی نیوز پرنٹ کا ایک کارخانہ کیوں نہیں قائم کر دیتے؟ تجویز معقول ہے لیکن دشواری یہ ہے کہ آج کل انیون پرمٹ کے بغیر نہیں ملتی ورنہ ضرور قائم کر دیتا۔ بس چھ ماشے یومیہ کافی

نہیں ہوتے۔ اس لئے کبھی کبھی بہت ہی معمولی قسم کے لوگ انہیں پکڑ لیتے ہیں۔ کچھ ہی پہلے کی بات ہے، ایک آدمی شکر وال کے ریلوے اسٹیشن پر بیٹھا ایک مسافر سے کہہ رہا تھا کہ وہ کمرانوالہ کا رہنے والا ہے اور وہیں جا رہا ہے، لیکن جب بنگ شروع ہوئی اور کھڑکی پر ٹپنے پہنچا تو بنگ کلرک کو کمرانوالہ کے ایک ٹکٹ کے لئے دو روپے دیئے۔ تم جانتے ہو شکر وال سے کمرانوالہ تک کے لئے صرف پچھتر پیسے لگتے ہیں۔ بنگ کلرک نے ایک پیسہ پیس پیس اُسے واپس کر دیئے۔ لیکن وہ مسافر جو اس کے پیچھے کھڑا تھا کھٹک گیا کیونکہ اسے بتا چکا تھا کہ وہ کمرانوالہ کا رہنے والا ہے۔ گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی۔ شے میں مبتلا جانے والے مسافر نے ڈیوٹی کانسٹیبل سے اپنے شے کا اظہار کر دیا۔ بس بھائی دھر لئے..... پوچھ گچھ ہوئی تو اعتراف کرنا پڑا کہ فوجوں کی نقل و حرکت کی جاسوسی کرنے کے لئے رحد پار سے تشریف لائے تھے۔ تم نے دیکھا کہ بنگ کلرک نے اس پر توجہ نہیں دی تھی کہ اس نے کمرانوالہ کے ایک ٹکٹ کے لئے دو روپے دیئے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ جلدی میں رہا ہو لیکن ایک مسافر نے اس کی غلطی کی بناء پر اُسے گھر تک پہنچا دیا۔“

”ہاں چودھری..... ہمیں ہر وقت چوکس رہنا چاہئے۔“

”ہوں..... مگر چوکس رہنے کے لئے بھی عقل چاہئے۔ اب یہی دیکھو کہ ہم نہیں جانتے آخر یہ ڈرم حقیقتاً کہاں جائیں گے۔“

”بھلا اس کا اس بات سے کیا تعلق چودھری۔“

”بالکل تعلق ہے استاد۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔“

”کس پر.....؟“

”اسی پر کہ تم ان ڈرموں کو ایک ویران جگہ پر اتارتے ہو اور وہیں سے واپس چلے جاتے ہو۔ کس کے لئے لاتے ہو، تم نہیں جانتے۔ دور دور تک کسی کا پتہ نہیں ہوتا۔“

”کیونٹی جانے، میری بلا سے۔ ہم تو حکم کے بندے ہیں۔ ادھر کے پھیرے پر بھتہ بھی نہیں ملتا ہے۔“

”دیکھو استاد! یہ سرحدی علاقوں کے جنگل ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ ڈرم سرحد پار اسمگل ہو جاتے ہوں۔ تم پر صرف تمہارے خاندان ہی کی ذمہ داری نہیں۔ ملک و قوم کا بھی حق ہے تم

## سانپ اور لومڑی

بہت بڑا ٹرک تھا اور اس پر بہت بڑے بڑے سربند ڈرم لدے ہوئے تھے، ان ڈرموں کو رسیوں سے اس طرح باندھا گیا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے کھٹک نہ سکیں۔ ڈرائیور کے علاوہ ایک اور آدمی بھی ٹرک پر موجود تھا۔

ٹرک کی رفتار زیادہ تیز نہ تھی۔ غالباً احتیاط مد نظر تھی، ورنہ سڑک پر تو سناٹا تھا۔ ڈرائیور کو تیز رفتاری کے کمالات دکھانے سے کون باز رکھ سکتا۔

سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔

ڈرائیور کے قریب بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ ”اب یہی دیکھو! ہمیں معلوم نہیں کہ یہ ڈرم کہاں جائیں گے اور ان کا مصروف کیا ہے۔“

”جاننے کی ضرورت بھی کیا ہے چودھری! ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہئے۔ ہاں تو تم مجھے غیر ملکی جاسوسوں کے قصے سنارہے تھے۔“

ارے ہاں..... میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر ہم اپنی آنکھیں کھلی رکھیں تو انہیں بہت آسانی سے پکڑا جاسکتا ہے۔ یہ باہر سے آتے ہیں اور ہمارے یہاں کے حالات سے پوری طرح

... دونوں نیچے اترے اور ڈرائیور بار برداری والے حصے پر چڑھ کر رسیاں کھولنے لگا۔  
چودھری جھاڑیوں کے قریب بھاڑا تھا۔ ڈرائیور نے ڈرم نیچے لڑھکانے شروع کئے جن  
بازوں سے جنگل کا شائلرز نے لگا تھا۔  
بہت جلد ڈرائیور نے چودھری کی چیخ سنی اور خود گرتے گرتے بچا۔ چودھری اپنی داہنی  
ہاتھوں سے دبانے بیٹھانے کی طرح چیخ رہا تھا۔  
”سک... کیا ہوا چودھری؟“

”سک... کاٹ لیا... ہائے سانپ... اب نلک... کیا ہوگا۔“  
”سک... کاٹ لیا؟“ ڈرائیور پر مزید بوکھلاہٹ جاری ہو گئی۔  
دو چودھری کے گرد ناچ رہا تھا۔

”ارے... کچھ کرو... ہائے میں مرا۔“  
”سک... کیا کروں... مم... میں کیا کروں۔“  
چودھری نے پاگلوں کی طرح چیخنا شروع کر دیا۔ ”بچاؤ... بچاؤ۔“  
”کون ہے؟ کہاں ہے... کیا ہے؟“ کسی قدر فاصلے سے آواز آئی۔  
”سانپ... سانپ...!“ ڈرائیور حلق پھاڑ کر چیخا۔

پھر ایسا معلوم ہوا جیسے بائیں جانب والی جھاڑیوں میں بھونچال آ گیا ہو۔  
”کیا ہوا؟“ جھاڑیوں سے ایک چہرہ برآمد ہوا۔

”سک... سانپ نے ڈس لیا۔“ ڈرائیور چودھری کی طرف ہاتھ اٹھا کر چیخا۔  
”جتنی جھاڑیوں سے باہر آ گیا تھا۔ ادھیڑ عمر کا ایک تو منہ آدمی تھا۔ خاکی کوٹ اور خاکی  
میں ملبوس تھا۔ پنڈلیوں تک چرمی رائیڈنگ بوٹ چڑھے ہوئے تھے۔“

”چودھری پر جھک پڑا۔“  
”مزید پتلی پر پھوٹ آنے والی خون کی بوند اجنبی کی آنکھ پر منتقل ہو چکی تھی۔ اس  
نے آنکھوں سے اس کی سونٹھ اور منہ پر اس کی پناہ۔“

”سک... چودھری بھی چونک کر اسے گھورنے لگا تھا۔“  
”کیا ہوا؟“ اس نے اجنبی چپکا۔ ”وہ سانپ اتنی دیر میں مر چکا ہوگا۔ تم

پر۔ پھیرے لگا کر بھتہ بھی بناتے رہو اور یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ ان  
مصرف کیا ہے۔“

”اچھا... اچھا... میں سمجھ گیا۔ لیکن منیجر صاحب کا حکم ہے کہ ڈرم اتار کر فوراً  
چل دوں۔“

”مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ کبھی ٹرک اشارت ہی نہ ہو سکے۔ مطلب یہ کہ جب  
اتار چکو۔“

”لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔“  
”پھر وہی بے عقلی کی بات۔ بھلا کس طرح چوکس رہو گے۔“

”میں نہیں سمجھا چودھری۔“  
”ڈرم اتار دینے کے بعد یہ ظاہر کرو کہ ٹرک اشارت ہی نہیں ہو رہا۔ ڈسٹری بیوٹر  
کھول ڈالو۔“

”ہاں... یہ ہو سکتا ہے۔“  
”تو پھر آج ہی... کم از کم آدھے گھنٹے تک رک کر دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔“

”وہاں سانپ بہت ہیں چودھری۔“  
”ہاتھی تو نہیں ہیں، جنہیں ہم پیروں سے کچل نہ سکیں۔“

”رات ہو جائے گی۔“  
”پرواہ نہ کرو۔“ چودھری بولا۔ ”ہم اُجالے ہی اُجالے وہاں پہنچیں گے اور ظاہر  
آدھے گھنٹے میں رات نہیں ہو جائے گی۔“

”اچھا دیکھیں گے۔“ ڈرائیور نے طویل سانس لی۔  
کچھ دیر بعد ٹرک ایک کچے راستے پر مڑ گیا جس کے دونوں اطراف میں قد آدم  
جھاڑیوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا تھا۔ ادھر شیشم کے درختوں کی بہتات تھی۔

”بھلا بتاؤ... سرحد یہاں سے کتنی دور ہے؟“ چودھری بڑبڑایا۔  
ڈرائیور کچھ نہ بولا۔ بالآخر وہ اس جگہ جا پہنچے جہاں ڈرم اتارنے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کام کیلئے قریباً سو مربع گز کا کھڑا خاص طور پر صاف کیا گیا

چودھری بوکلا ہٹ میں پیچھے ہٹ گیا۔

”ڈر لگتا ہے صاحب۔“ ڈرائیور بولا۔ ”آپ ہی پھینک دیجئے۔“

”خیر..... خیر.....!“ اجنبی نے سانپ کو ایک طرف ڈالتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اسے

بیش یاد رکھنا کہ تم بے حد زہریلے ہو۔ تمہارے خون کا ایک قطرہ کسی بھی جاندار کو پل بھر میں موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے لیکن افسوس کہ میں صرف سانپوں کا معالج ہوں۔ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

”صص..... صاحب..... کہیں کچھ دیر بعد نہ کوئی گزربز ہو جائے۔“ ڈرائیور نے کہا۔

”کچھ بھی نہ ہوگا۔ یہ زندہ رہیں گے۔ ویسے اگر تم ڈر رہے ہو تو میری قیام گاہ پر چل

سکتے ہو۔ رات وہیں گزارنا۔“

”آپ کہاں رہتے ہیں؟“

”ریلوے اسٹیشن کے قریب۔ یہاں سے صرف ایک میل کے فاصلے پر۔ میری گاڑی

کھڑی ہے۔ میری دانست میں یہی مناسب ہوگا کہ میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔“

”چلے جاؤ چودھری۔“ ڈرائیور نے کہا۔ ”صبح والی گاڑی سے واپس چلے آنا۔“

”اچھا..... مگر صاحب کو بڑی تکلیف ہوگی۔“ چودھری نے نحیف آواز میں کہا۔

”نہیں مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“ اجنبی بولا۔ ”تم بے تکلفی سے چلو۔ بہت سے لوگ

نقص گھبراہٹ کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ ہر سانپ زہریلا نہیں ہوتا۔“

”لہل..... لیکن..... میرا زہر۔“

”اس کی تدبیر بھی ہو جائے گی۔ تم فکر نہ کرو۔“

اندھرا پھیلنے لگا تھا۔ ڈرائیور نے چودھری کو اجنبی کی گاڑی تک پہنچنے میں مدد دی۔

”چودھری.....!“ اس نے رخصت ہوتے وقت کہا۔ ”صاحب بہت اچھے آدمی معلوم

نہتے ہیں۔ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“

نہیں مر سکتے۔ بے فکر رہو۔ تم اس سانپ سے بھی زیادہ زہریلے ہو۔ تمہیں ڈس کر گا۔“

ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔“

”صاحب یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔“ ڈرائیور رو ہانسا ہو کر بولا۔

”نہ مذاق نہیں کر رہا۔“ اجنبی نے نہایت لہجے میں کہا۔ ”اسے ثابت کرنا

آسان ہے۔ سانپیں بلکہ وہ بیچارہ خود ہی ڈسا گیا ہے۔ اسے تم سیدھے کھڑے ہو۔“

اس نے چودھری کو قہقہے لہانے پر زبردستی کھڑا کر دیا۔ ڈرائیور کی زبان کنگ ہو کر رہی

”یقین کرو میرے دوست تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔“ اجنبی نے چودھری کا

ہوئے کہا۔ ”لیکن نہیں..... ٹھہرو..... میں اسے تلاش کرتا ہوں۔ وہ زیادہ دور نہ جاگا،

پھر اس نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ چودھری کو آرام سے ٹرک پر بٹھادے۔ اس

ڈرائیور ہی کی مدد سے اس نے سانپ کی تلاش شروع کی تھی۔

”کیا وہ یہاں کھڑا تھا.....؟“ اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

”جج..... جی ہاں..... اسی جگہ۔“

”ٹھیک! تو تم یہیں ٹھہرو..... میں جھاڑیوں میں ہٹتا ہوں۔ تم مت آنا..... کچھ

نہ ڈے جاؤ۔ اس قسم کے جوتے میں اسی لئے پہنتا ہوں۔“

اجنبی جھاڑیوں میں گھستا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ڈرائیور نے اس کا قبضہ سنا تھا۔

وہ سازبازوں سے برآمد ہوا تو اس کے دانستے ہاتھ میں ایک بڑا سا مردہ سانپ تھا۔ ”لو!

یہ..... یہ رہا تمہارا شکار۔“

اس نے مار زہریدہ چودھری کو مخاطب کیا۔

چودھری خوفزدہ نظروں سے سانپ اور اجنبی کو دیکھنے جا رہا تھا۔

”میری شکل یاد کیج رہے ہو۔ نیچے آؤ۔“ اجنبی نے چودھری سے کہا۔

چودھری نے نہایت بے انداز میں اس کے مشورے پر عمل کیا تھا۔

”اب اسے اپنے ہاتھ سے دور پھینک دو۔“ اجنبی نے مردہ سانپ اس کا

برحالتے ہوئے کہا۔



”بھائی فرماتے ہیں کہ میرے فون پر کتنا بھونکتا ہے۔“  
 ”ہوسکتا ہے کہ فون پر تمہاری آواز ایسی ہی لگتی ہو۔“  
 ”دیکھو..... میں جیتا ہوں..... مجھے غصہ نہ دلاؤ۔“

”کیوں صاحب؟“ آپ ہی کچھ بتائیے۔“ حمید نے آفیسر کو مخاطب کیا۔  
 ”آپ ہی سے پوچھ لیجئے۔“ کہتا ہوا آفیسر اپنے اسکوتر کی طرف بڑھ گیا۔  
 قاسم حمید کی طرف مڑا اور اسے اس طرح گھورتا رہا جیسے مار ہی بیٹھے گا۔  
 ”اگر یہ بات ہے تو میں واپس جا رہا ہوں۔“ حمید نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔  
 ”نہیں! قیامت جروت ہے۔ ہمیشہ کیلئے سبیں ڈیرہ ڈال دو اور میری ناک کاٹتے رہو۔“  
 ”اے..... کیا تم مجھ پر ادھار کھائے بیٹھے رہتے ہو۔“ حمید نے بھی آنکھیں نکالیں۔  
 ”تو پھر قون بھونک رہا تھا فون پر۔ قوتی میرے یہاں کتے پلے ہوتے ہیں۔“  
 ”اوہ..... اب سمجھا..... تو یہ ٹیلی فون کے محکمے کا کوئی آدمی تھا۔“

”مجھے کس کا آدمی تھا۔“ کہتا ہوا قاسم آگے بڑھ گیا۔

”اچھی بات ہے..... میں جا رہا ہوں۔“

”تم نہیں جاسکتے..... تمہیں بتانا پڑے گا۔“ قاسم پلٹ پڑا۔

”کس لوٹڈیا کے باپ پر بھونک رہے تھے۔“

”واقعی تمہارا دماغ چل گیا ہے۔“

”پھر وہ خامخاہ آیا تھا۔“

”کبھی کبھی غلط فہمی بھی ہو جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کسی اور کے فون سے یہ حرکت ہوئی ہو۔“

”تم قیوں آئے تھے؟“

”میں ایک فلم بنانا چاہتا ہوں۔ لیکن بزنس تمہارے نام سے ہوگا۔“

”قیما مطلب.....؟“

”سرکاری ملازم ہوں نا..... اس لئے اپنے نام سے بزنس نہیں کر سکتا۔“

”ذہری فارم کیوں نہیں کھولتے۔ فلم بنا کر قیام کرو گے۔ فلاپ ہو غمی تو۔ بھینس دودھ نہ

سنا تو ذبح کر کے کھائی جائے غی۔“

”نیشنل حمید نے فون پر کسی کے نمبر ڈائل کئے اور ماؤتھ پیس میں کتے کی طرح بھونک کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔“

آدھے گھنٹے بعد دسویں بار اس نے یہ حرکت کی تھی اور یہ فون قاسم کا تھا۔  
 قاسم گھر پر موجود نہیں تھا۔ اس کی بیوی بھی کہیں گئی ہوئی تھی۔ حمید نے ملازموں سے  
 تھا کہ وہ دیں بھنہ کر قاسم کا انتظار کرنا چاہتا ہے۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ حمید  
 کے لئے اجنبی تو تھا نہیں کہ وہ اس کی نگرانی کی غرض سے بار بار ڈرائنگ روم میں آتے۔  
 بہر حال حمید نے اب تک ہر تین منٹ کے بعد کسی نامعلوم آدمی کے نمبر ڈائل  
 تھے اور بڑے سلیقے سے بھونکتا رہا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ قاسم اور ٹیلی فون کے محکمے کا ایک آفیسر ساتھ ہی ساتھ وہاں آچھا  
 کمپاؤنڈ میں اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔

”آپ کا فون کاٹ دیا جائے گا۔“ آفیسر نے سخت لہجے میں کہا۔

”ذرا کاٹ کر تو دیکھو..... پورے محکمے کو الٹ دوں گا۔“

حمید نے یہ آوازیں سنیں اور باہر نکل آیا۔ قاسم مزید کچھ کہنے والا تھا لیکن حمید کو دیکھا  
 منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”کیا قصہ ہے؟“ اس نے ان کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

”تم یہاں کب سے ہو؟“ قاسم نے اسے گھورتے ہوئے الٹا سوال جڑ دیا۔

”بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تمہاری مسز بھی تشریف نہیں رکھتیں۔“

”اب میں قچھ نہیں کہہ سکتا۔“ قاسم نے آفیسر کی طرف مڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”بہر حال۔“ یہ تحریری وارنگ رکھنے۔“ آفیسر نے قاسم کی طرف ایک لفافہ بڑھانے

ہوئے کہا۔ ”دوسری شکایت پر فون کاٹ دیا جائے گا۔“

”بات کیا ہے؟“ حمید نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”میں گھر نہیں تھا اور یہ دگا باز یہاں میرا انتظار کر رہا تھا۔“ قاسم نے حمید کو ٹھونسہ دے کر کہا۔  
 وہ قہر آلود نظروں سے حمید کی طرف دیکھنے لگی۔  
 ”یہ کتنا بڑا کمینہ پن ہے۔“ حمید قاسم کو مخاطب کر کے بولا۔ ”تم مجھے محض اس لئے  
 دے رہے ہو کہ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ لعنت ہے اگر اب کبھی تمہاری طرف رخ  
 نہ تھوڑوں بھی۔“

”بے حد عقل مند ہوتے جا رہے ہو۔ مگر میں فلم ہی بنانا چاہتا ہوں۔“  
 ”آ خر قیوں.....؟“  
 ”ایک لڑکی کو ہیروئن بنانا ہے۔“  
 ”میرا کیا فائدہ ہوگا۔“  
 ”مفت کی تقریح۔“

”نہیں چلے گی۔ میں نے آج تک قویٰ لمبی ترنگی اور موٹی تازی ہیروئن نہیں دیکھی۔“

”ہیروئن کے علاوہ اور بھی تو کردار ہوتے ہیں۔ ہیروئن کی ماں لمبی ترنگی، ہیرو کی بہن فخر  
 نگڑی سی، ہیروئن کی بہن بھی تمہارے ہی معیار کی۔ ان سب کرداروں کیلئے تم ہی انتخاب کرنا۔“  
 ”نہیں بیٹا..... ہمیشہ میں ہی مارا جاتا ہوں۔ اپنی ایسی کی تہی میں جائے۔ میں تو اپنا  
 چپاتی بیغم کے ساتھ مل قراب سوشل ورک کروں گا..... اس میں بھی تو لونڈیوں سے ملا کر  
 ہوتی ہے۔“

”بہر حال میں جا رہا ہوں۔ اب کبھی نہ آؤں گا۔“ حمید نے کہا اور گاڑی موڑ دی۔ قاسم  
 بوی اسے آوازیں ہی دیتی رہ گئی تھی۔

”ہاں..... ہاں..... دیکھیں گے۔ چلتے پھرتے نجر آؤ۔“  
 ”اچھا..... ناٹا.....!“ حمید نے کہا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔

لیکن ابھی انجن بھی اسٹارٹ نہ کر پایا تھا کہ ایک لمبی سی سیاہ گاڑی کمپاؤنڈ میں داخل  
 ہوئی اور سیدھی پورچ میں چلی گئی۔ قاسم پورچ کے قریب پہنچ چکا تھا اور سیاہ گاڑی سے ”چپا  
 بیغم“ اتری تھیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گاڑی کی بجائے سچ مچ جلتے توے پر سے اتری ہوں۔  
 حمید نے گاڑی اسٹارٹ کی اور سیدھا پورچ کی طرف لیتا چلا گیا۔

”لو..... دیکھو بیٹا۔“ قاسم غصیلے لہجے میں دباڑا۔ ”تم مجھے زندہ رہنے دو گے یا نہیں۔“  
 ”کو اس بند کرو۔“ اس کی بیوی دباڑی۔ ”تمہیں اس حرکت کا مقصد بتانا پڑے گا۔“  
 ”کیا قصہ ہے.....؟“ حمید گاڑی سے اترتا ہوا بولا۔

”قصہ ان کے والد صاحب کے کان میں بھونک رہا تھا۔ سالے بیٹا!“ قاسم جلتے  
 لہجے میں بولا۔

”یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہمارے ہی فون سے کالیں ہوتی رہی تھیں۔“ اسکی بیوی غرائی۔

”حقیقتاً میں نہیں سمجھ سکا کہ بات کیا تھی۔“ حمید نے قاسم کی بیوی سے کہا۔  
 ”بٹھ جائیے..... میں بتاتی ہوں۔ ابا جان کے فون پر کوئی کال کرتا تھا اور کتے کی طرح  
 منہ لٹاتا تھا۔ انہوں نے دوسری لائن پر ایک پیج کو مطلع کیا تھا۔ پھر پندرہ منٹ کے اندر اندر  
 فون بٹک کر لیا گیا جس سے کال آرہی تھی۔“  
 ”اور فون آپ کا تھا۔“

”اب تو بڑگئی قلبے میں ٹھنڈک۔“ قاسم ہاتھ نچا کر ہوا۔ ”جو تمہارے ابا جان کے قان میں بھونک رہا تھا، اب وہی میرا مغز چاٹ رہا ہے۔“

”بہر حال..... اب میں چلا..... اور کبھی تمہاری شکل نہیں دیکھوں گا۔“

”ٹھہر جاؤ..... سوشل ورک کی ایسی کی تیسی۔ میں تمہارے ساتھ فیم بناؤں گا۔“

فون کی گھنٹی پھر بجی..... قاسم اور اس کی بیوی صرف دیکھ کر رہ گئے۔ حمید نے ریسور اٹھایا۔ دوسری طرف سے کتے کی آواز سنائی دی تھی۔

”یار جو کوئی بھی ہو اب معاف ہی کر دو۔“ اُس نے ماؤ تھ پیس میں کہا۔

”واقعی۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

غالباً حمید کی آواز دوسری طرف پہچان لی گئی تھی۔ حمید نے ”واقعی“ کا جواب دیئے بغیر ریسور رکھ دیا۔



میز پر رکھے ہوئے انسٹرومنٹس میں سے ایک کی گھنٹی بجی اور فریدی نے فائیل سے توجہ بنائے بغیر ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھالیا۔

”انفارمرون تھری سکس آپ سے ملنا چاہتا ہے۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”روم نمبر گیارہ میں بٹھاؤ۔“ فریدی بولا۔

”وہ سول ہسپتال میں ہے جناب۔ چل پھر نہیں سکتا۔“

”تھری سکس کے بارے میں تفصیل۔“

”اے آپ نے اشار آئرن ورکس کی سپلائیز کے بارے میں.....!“

”ٹھیک ہے۔“ فریدی بات کاٹ کر بولا۔ ”ہسپتال کے کس وارڈ میں ہے۔“

”ایمرجنسی وارڈ میں۔“

”جی ہاں۔“

”اور اس دوران میں یہاں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔“

”غلط نہ سمجھئے۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ یہاں تین انسٹرومنٹ میں اور ابا جان سے کیوں مذاق کرنے لگے۔“

”کوئی..... نوکر بھی قریب تھا۔“ قاسم دہاڑا۔ ”نہ وہ آپکے ابا جان کا سالا ہے اور نہ پھر اپنا پھوپھا کہئے۔ ان کا بہنوئی نہ کہئے۔“ قاسم کی بیوی جل کر بولی۔

”چلو یہی سہی۔“

پھر وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ قاسم کی بیوی نے لپک کر ریسور اٹھا لیا۔

”ہیلو..... اوہ..... یو شٹ اپ.....!“ اس نے ریسور کریڈل پر پینچ دیا اور تیزی باہر نکل گئی۔

قاسم ہونٹوں کی طرح حمید کو دیکھے جا رہا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب وہ کتا کہیں اور سے بھونک رہا ہے۔“ حمید نے خشک لہجے میں کہا۔

”تو پھر کوئی نوکر ہی ہو سکتا ہے۔“ قاسم بولا اور پھر دہاڑا ہوا کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں کی بیوی بھی آ گئی۔ اس کے پیچھے ایک ملازم بھی تھا جس کے ہاتھوں میں عمارت کے دونوں انسٹرومنٹ تھے۔

فون کی گھنٹی پھر بجی اور اس بار سم نے ریسور اٹھالیا۔

”ہیسو..... اچھا..... اچھا..... سالے بھونکے جاؤ..... میں تمہیں وینچ لوں گا..... اے اے..... سالے تو اب قیاد رہا ہے، میرے پاس تو بھیج دیا تھا نوٹس۔“

”چھوڑو..... مجھے دو..... ریسور.....!“ حمید اس کے قریب پہنچ کر ہوا۔

”اب کھاموش ہے۔“

حمید نے فوراً ہی ایکسیج کے نمبر ڈائیل کئے اور شکایت درج کرا کے ریسور رکھ دیا۔

بار پھر کتا بھونکا تھا اور چوتھی بار ایکسیج سے اطلاع ملی تھی کہ اس کے لئے شہر کا ایک پبلک فون بوتھ استعمال کیا گیا تھا۔

”آخر کیا چکر ہے؟“ قاسم کی بیوی نے پرتشویش لہجے میں کہا۔



”اچھا.....!“ کہہ کر فریدی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

سول ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں بستر نمبر سات کا مریض بے سدھ پڑا تھا۔

”چودھری.....!“ فریدی نے اس کے سر ہانے جھک کر نرم لہجے میں آہستہ سے آواز دی۔

اس نے آنکھیں کھولیں اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھنا چاہا۔

”لینے رہو۔“ وہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”تمہیں کیا ہوا، بالکل پیلے پڑے ہو۔“

”پر سوں ہی تو ہم ملے تھے۔“

”بس زندگی تھی.....“ فح گیا کرنل صاحب۔ ”مریض نے گلوگیر آواز میں کہا اور پھر

چودھری نے اپنی کہانی شروع کر دی۔

”ذرا ایک منٹ۔“ فریدی نے ایک مرحلے پر ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”کیا اس اجنبی نے ٹرک

ان لوڈ کئے جانے سے متعلق بھی کوئی سوال کیا تھا۔“

”جی نہیں..... بالکل نہیں..... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔“ چودھری نے کہا اور پھر چند

لمحے خاموش رہ کر بولا۔ ”وہ مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر اس جگہ لے گیا تھا جہاں وہ بیمار

سانپوں کا علاج کرتا ہے۔ رات گئے تک مجھے سمجھا تا رہا تھا کہ میں نہیں مروں گا۔ پھر اس نے

مجھے کوئی دوا پلائی تھی۔ اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا۔ بہر حال آج صبح جب میری آنکھ کھلی تو میں

نے ایسا محسوس کیا جیسے چھ ماہ سے بیمار پڑا رہا ہوں۔ زبان بلانے سے چکر آتے تھے۔“

”شہر کس طرح پہنچے؟“ فریدی نے سوال کیا۔

”اس کے ایک آدمی نے ٹرین پر سوار کر دیا تھا۔ یہاں اسٹیشن پر اترا تو دو قدم بھی نہ

چل سکا۔ شاید مجھ پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ دوبارہ ہوش میں آیا تو خود کو اس ہسپتال میں پایا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رات بھر میں صحت اس طرح کیسے گر سکتی ہے۔“

”فکر نہ کرو..... تمہارے گروپ کا خون فراہم کر لیا گیا ہے۔“

”اُدہ..... تو کیا خون چڑھایا جائے گا۔“

”ہاں..... اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ خون غیر معمولی طور پر

ضائع ہوا ہے۔“

”لیکن..... دو یا تین قطروں سے زیادہ خون نہیں نکلا تھا۔“ چودھری نے بھرائی ہوئی

از میں کہا۔

”ہوں..... ذرا اپنا ہاتھ ادھر لاؤ۔“ فریدی نے کہا۔

پھر وہ اس کی دونوں کلاسیاں دیکھتا رہا۔

”کرنل صاحب! یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ سانپ کسی آدمی کو کاٹے اور خود مر جائے۔“

”فکر نہ کرو..... سب دیکھ لیا جائے گا۔ میں رات کو پھر آؤں گا۔“

پھر فریدی ڈاکٹر کے کمرے میں آیا تھا۔

”جی ہاں..... میرا خیال ہے کہ اس کے جسم سے سائمنٹینک طور پر خون نکالا گیا ہے۔“

”میں بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”لیکن اس کے خون میں کسی قسم کے بھی

برکاسراخ نہیں مل سکا۔“

”براہ کرم خون کے تجزیے کی رپورٹ میرے محکمے کو بھیجوا دیجئے گا۔“

”بہت بہتر جناب۔“

فریدی ہسپتال سے نکلا تو پانچ بج رہے تھے۔ اس کی گاڑی اب گھریا دفتر کی بجائے

نیوگرا ہوٹل کی طرف جارہی تھی۔ شہری آبادی سے کچھ دور نکل آنے پر اس نے گاڑی ایک جگہ

رک دی اور ڈیش بورڈ کے بائیں جانب والے خانے سے لاسکی فون کا ریسیور نکالا۔

”ہیلو.....!“ اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”میں فریدی بول رہا ہوں۔ دیکھو..... سول

ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں بیڈ نمبر سات کے مریض پر کڑی نظر رکھو۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس

سے متعلق ہسپتال کے عملے سے کسی قسم کی پوچھ گچھ تو نہیں کی جارہی۔“

ڈیش بورڈ کے خانے میں ریسیور رکھ کر اس نے گاڑی دوبارہ اشارت کیا اور نیا گرا

ہوٹل کی طرف بڑھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے گہرے فکر کا اظہار ہو رہا تھا۔



مید اور قاسم نیوگرا کی ایک میز پر اس طرح قابض ہو گئے تھے جیسے اسی پر شب ببری کا

بھی ارادہ رکھتے ہوں۔

قاسم چمک رہا تھا اور حمید کے قبضے رکھنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

”دیکھا..... اسے کہتے ہیں مقدر.....!“ اس نے قاسم کے چہرے کے قریب ہاتھ نہ کہا۔ ”کسی بھونکنے والے نے ہمیں اس قدر قریب کر دیا ہے کہ ہم اس وقت..... وقت..... کیا معلوم ہو رہے ہیں؟“

”ایک دوسرے کے والد صاحب۔“ قاسم کے ہونٹوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ تھی۔

”میں نے تمہیں ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا ہے۔“

”قیام طلب.....؟“

”تمہاری چپاتی نیگم بہت چالاک ہوتی جا رہی ہیں۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”سوشل ورک کی تجویز کس کی تھی؟“

”اسی قی۔“

”ہوں..... اور تم سمجھتے تھے کہ سچ سچ عیش کرو گے۔“

”ابے ہاں..... بہت لونڈیاں ہوتی ہیں۔“

”ہوتی ہوں گی..... لیکن تم اپنی چپاتی نیگم کی موجودگی میں کچھ نہیں کر سکتے۔ مقصد.....“

”ہے کہ وہ ہر وقت تمہارے سر پر مسلط رہے۔“

”یہ بات تو ہے..... اس قی وجہ سے قس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اب بھوتے.....“

بھائی وہ واقعی اُلو بنا رہی ہے مجھے۔“

”لیکن جب تک میں زندہ ہوں تم اُلو نہیں بن سکتے۔“ حمید اپنے سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

”مگر یہ فلم دلم کا قیا چکر ہے۔ پیسہ قون لگائے گا۔“

”اپنے کرئل صاحب۔“

”نہیں..... جھوٹ۔“

”کیوں؟“

”لیکن نہیں آتا..... کرئل صاحب اور فلم۔“

”تمہیں یقین کرنا پڑے گا..... نہ اداوں کو انڈسٹری کی سوجھتی ہے تو فلم انڈسٹری کے

مادہ اور کچھ نہیں سمجھائی دیتا۔“

”قیوں مذاک ازار ہے ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ کرئل صاحب۔“

”شاید وہ نئے چہروں کی تلاش میں اس وقت بھی بیٹیں موجود ہوں۔“

”ٹھیک ہے..... جلدی کچھ اور منگواؤ..... بھونگ لگ رہی ہے۔“

”تین بجے سے اس وقت تک چار بار کھا چکے ہو۔“

”بس اسی بات پر تم سے ہڈی جلتی ہے میری۔ میرے خانے میں خیر نہ لگایا کرو۔“

حمید نے ویٹر کو باکر ایک بار پھر قاسم کے لئے آرڈر پلیس کیا۔

”ہوں..... یار سچ بتاؤ کیا چقر ہے۔“ قاسم اسے بے اعتباری سے دیکھتا ہوا بولا۔

”کیسا چکر.....؟“

”تم آخر اتنی خاطر قیوں کر رہے ہو۔“

”واقعی بڑے ذلیل ہو۔ یہ میرے خلوص کی توہین ہے۔ اچھا میں چلا..... پانچوں آرڈر

نے بل تم ہی ادا کرنا۔“

حمید نے اٹھنا چاہا لیکن قاسم نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”پچاس

نہیں.....“ قاسم نے کہا۔ ”تم کب سے لونڈیوں کی طرح بدکنے لگے۔“

حمید برا سا منہ بنائے ہوئے بیٹھ گیا۔ ویسے قاسم کے اس طرز تنطاب پر ہنسی آتے

تے.....“

”نہیں..... جب مجھ پر اعتبار نہیں تو وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔“ اس نے

”نہیں.....“ قاسم نے کہا۔

”اچھا..... تو پوچھو کرئل صاحب سے؟“ قاسم کی آنکھوں میں شرارت آمیز مسکراہٹ

سجی رہی تھی۔

”اجازت ہے؟“

”نہیں اسی وقت فریدی بھی ڈانٹنگ ہال کے صدر دروازے میں دکھائی دیا۔“

”وہ دیکھو.....“ حمید نے اشارہ کیا۔ ”آگئے۔“



کرئل فریدی نے ہاتھ اٹھا کر حمید کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سامنے پھیلے ہوئے نقشے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اس پر پرنسپل سے نشانات اگاتا جا رہا تھا۔ چھ دیر بعد نقشے کو رول کر کے ایک طرف رکھ دیا اور حمید کی جانب دیکھنے بغیر کہا۔ ”ہاں..... اب سو..... کیا کہہ رہے تھے۔“

”سب سے پہلے تو یہ عرض کروں گا کہ آپ کئی دن سے آنکھ ماما کر بات نہیں کر رہے۔“

حمید اسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

”اس کے بعد۔“

”پہلے اس رویے کی وجہ معلوم کرنا چاہوں گا۔“

”اس رویے کی وجہ..... بہتر ہوگا کہ اس سلسلے میں کچھ نہ پوچھو۔“

”ہو سکتا ہے اس دن ناراضگی کی وجہ کوئی غلط فہمی ہو۔“

”نہیں..... غلط فہمی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“

”تو یہ.....“

”منت پاپ..... ورنہ پھر تمہیں سزا بھگتنی پڑے گی۔“

”میرے..... اس سے بڑی سزا اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ آپ دن میں کم از کم ایک بار

میں سزا کر میہ کی طرف نہ دیکھیں۔“

فریدی اس کی خاموشی نظروں سے دیکھتا ہوا مسکرایا۔

”یہ بھی گوارا ہے شعر سنئے۔“

وہ مسکرائے تو جاتے ہیں عذر پیچہم پر

پر اس ادا میں بھی جھلکیاں عتاب کی ہیں

”کیا پر پر لگا رکھی ہے۔ یہ بھی کوئی شعر ہوا۔ اظہار خیال کے لئے محض الفاظ کا انتخاب

نہ کافی نہیں ہوتا۔ مناسب نشست الفاظ کے بغیر اچھے سے اچھا خیال بھی مسخ ہو کر رہ جاتا ہے۔“

”اسے صنعت.....“

”اوہ..... ہو..... واقعی۔“ قاسم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کیونکہ فریدی نے

ایک مشہور فلم ڈائریکٹر بھی تھا۔

”یہ..... تت..... تو..... واقعی..... فلم۔“ قاسم دوبارہ ہکلا کر رہ گیا۔

فریدی ان کی طرف توجہ دیے بغیر بال روم کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔

”نہیں دیکھا۔“ قاسم نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔

”بہر حال اب تو تمہیں یقین آ گیا۔“ حمید بولا۔

”بلکل..... بلکل.....!“ قاسم کے لہجے میں تشویش تھی۔

حمید پھر اُسے گھورنے لگا۔ چند لمحوں خاموش رہ کر بولا۔

”میں تمہیں فکر مند دیکھ رہا ہوں۔“

”ہاں..... ہے ہی فکر والی بات..... وہ میرا دقیانوس باپ۔“

”اوہ..... کسی کو پتہ ہی نہ چلے گا..... سب کاغذی باتیں ہیں۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”مطلب یہ کہ کاغذات تمہارے نام سے ہوں گے اور بس۔ اعلان نہیں کیا جائے

ایک مولے کا مزید موٹا بیٹا فلم انڈسٹری سے منسلک ہو گیا ہے۔“

”دیکھو..... دیکھو..... جہاں سنبھال کے..... ہاں۔“

”تم باتیں ہی ایسی کرتے ہو کہ مجھے غصہ آ جاتا ہے۔“

”نھیگے سے..... ہاں تو قیسی فلم بنے گی۔“

”جنگل فلم..... سرمایہ دار کی لڑکی اور غریب لڑکا دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھر اگتی ہیں۔“

”غریب کی لڑکی اور سرمایہ دار کا لڑکا بھی تو ہوتا ہے۔“

”ہاں..... ہاں..... بہ حال بوریٹ ہی ہے۔ لڑکا اور لڑکی ہی سرے سے بوریٹ؟“

”ہائے..... تو قیاب فرشتہ اور فرشتی پر فلم بناؤ گے۔“

”بکرا اور بکری پر بھی ایسی فلم دے سکتا ہوں کہ یہاں سے ہالی وڈ تک دھوم مچ جائے

”ہاں..... یہ میں کر سکتا ہوں۔“

”کون ہے؟“

”بس دیکھ لینا..... نام نہیں بتاؤں گا۔“

”کب دیکھ لوں گا.....؟“

”ابھی چلو.....“ فریدی گھڑی پر نظر ڈالتا ہوا بولا۔

دونوں آفس سے نکل کر پارکنگ شیڈ میں آئے تھے اور لنکن شہر کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔

”قاسم کا کیا قصہ تھا.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں..... بیوی نے راہ پر لگانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے ساتھ سوشل ورک

کرتا پھرتا رہا تھا۔ میں نے سوچا دونوں میں جھگڑا کرائے بغیر کام نہیں چلے گا۔“

”ہوں.....!“

”کیا ہوں.....؟“ حمید بھنا کر بولا۔

”آج کل اتنے چڑچڑے کیوں ہو رہے ہو۔“

”اپنے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔“

”ہمیشہ یکساں روش۔“

”میں یکسانیت کو موت سمجھتا ہوں۔“

”تم صرف بکواس کرتے ہو۔ یکسانیت کو ناپسند کرنے والے تو سمندر میں چھلانگ لگا دیا کرتے ہیں۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میں تنہا سمندر میں چھلانگ نہیں لگا سکوں گا۔“

”فلم کی ہیروئن بھی تمہارے ساتھ ہوگی۔“

”اوہ.....! مجھے دلچسپی نہیں۔ خواہ مخواہ اشتیاق بڑھانے کی کوشش نہ کیجئے۔“

”کچھ بھی کہو..... ابھی نام نہیں بتاؤں گا۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اب وہ خود ہی اس موضوع پر گفتگو کرنے سے احتراز کر رہا ہو۔

گازی کچھ دیر بعد ان کی کونٹھی کی کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی اور حمید پھر بھنا کر بولا۔

”بس.....! فریدی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”تم ادب کے پروفیسر نہیں ہو اور میں شعر کہنے کے موڈ میں کبھی نہیں ہوتا۔ تمہیں اس سلسلے میں بہ ابدی رتی ہے کہ تم نے اپنے کسی دانشور کے تصدیق کے حصول کے لئے نئے آدمی کو کیوں استعمال کیا.....؟“

”مہم..... میں نہیں سمجھتا۔“

”بیرونی کوفٹوں پر ہونے کے لئے تم نے ہی تو کہا تھا۔“

”وہ ذاتی نوعیت کا نام نہیں تھا۔“

”ہوں..... تو پھر.....؟“

”قاسم اس کے بغیر ہاتھ نہ آتا۔ میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہونا ضروری تھا۔“

”میں نے اس کا نام یونہی لیا تھا، ضروری نہیں تھا کہ تم اس کیلئے جھگڑا کرانے بیٹھ جاتے۔“

”بہر حال..... میں یہی سمجھا تھا کہ آپ خصوصیت سے اس کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔“

”خیر..... پروڈیوسر کی حیثیت سے وہ بھی بُرا نہ رہے گا۔ لیکن اسے سمجھا دینا کہ کچھ دنوں

کے لئے گھر چھوڑنا پڑے گا۔“

”آخر چکر کیا ہے؟ کیا آپ مجھے کونفیڈنس میں نہیں لیں گے۔“

”فلم بنائیں..... جیسی۔“

”آپ.....؟“ یہ انداز میں بولا۔

”فضول باتوں میں مت پڑو۔“

”لیکن آپ تو فلم بنانے کے لئے کہہ رہے تھے۔“

”تم نے کس سے کہا ہے کہ یہ رانا بھنا رہا ہوں۔“

”لیکن آپ نے ساتھ ہوا اور بیٹھ تھا وہ تو صرف پریم کہانیاں ہی فلماتا ہے۔“

”حمید صاحب! وہ صرف تکنیکی مشین کی حیثیت سے کام کرے گا۔ فلم تو آپ ڈائریکٹ

فرمائیں۔“

”اسکرپٹ کون لکھنے کا.....؟“

”اس کی فکر نہ کرو۔“

”ابھی بات نہ ہے۔ آپ فی الحال ہیروئن کو میرے حوالے کر دیجئے۔“

”یہاں آپ مجھے ہیروئن دکھائیں گے۔“

”کئی دن سے یہیں مقیم ہے۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ آپ مزاحاً بھی جھوٹ نہیں بولتے۔“

”قدر افزائی کا شکریہ حمید صاحب..... ہاں میں مزاحاً بھی جھوٹ نہیں بولتا۔“

اترے گاڑی سے۔ ہیروئن خود چل کر آپ تک نہیں آئے گی۔“

گاڑی سے اتر کر وہ اُسے عقبی پارک کی طرف لے چلا تھا اور پھر وہاں پہنچ کر حمید جھلاہٹ اپنی آخری حدیں چھونے لگی۔

وہ ایک بڑے سے پتھر کے قریب کھڑے تھے جس میں ایک لومڑی بند تھی۔

حمید اوپری ہونٹ بھینچنے اُسے دیکھتا رہا۔

”کسی جنگل فلم کی ہیروئن صرف لومڑی ہی ہو سکتی ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”ہو سکتا ہے۔“ حمید نے سر دلچے میں کہا اور دوسری طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

”جس طرح میرا دل چاہے گا۔“

”نہیں..... میں بتاتا ہوں..... اپنی امی جان سے قہو اسی طرح تمہارا مغز چائیں جس طرح ارے باوا کا چاٹتی ہیں۔ تمہارا قام تمام ہو جائے گا..... باوا جان تو بے حیا ہو گئے ہیں۔“

”خبردار جوان کا نام لیا۔“

”ہائے..... تو پھر قس کا نام لوں۔“

”خاموش رہنے۔“

”سامنے سے ہاٹ جاؤ۔“

”باہر نہیں جاسکتے۔“

”اچھا تو پھر یہیں بلواتا ہوں ایکسٹرا لوڈ یوں کو۔“

”ضرور..... ضرور..... یہیں فلم بنا کر رکھ دوں گی۔ ضرور بلوایئے۔“

”دیکھو..... غصہ نہ دلاؤ..... ورنہ بلوایں لوں گا۔“

”بلوایئے..... مجھے منظور ہے۔“

قام بھنا کر مڑا اور سیدھا ڈرائیونگ روم میں چلا آیا۔

## فلم یونٹ

قاسم نے فون پر کسی کے نمبر ڈائل کئے اور ماؤتھ پیس میں بولا۔ ”ہیلو..... میں ہا“

بول رہا ہوں۔ کھوسٹ بھائی..... تم نے ابھی تک نہیں بتایا کہ کتنی اکسٹرا لوڈ یاں سپلائی کر کے ہو۔ بارہ..... ٹھیک ہے۔ قام بن جائے گا..... اور دیکھو..... فرسٹ کلاس ہونی چاہئیں۔“

ریسیور رکھ کر مڑا تو بیوی کی شکل نظر آئی۔ وہ اس کے پیچھے کھڑی دانت پیس رہی تھی۔

قاسم اس کی پرواہ کئے بغیر وہاں سے ہٹ گیا۔ لیکن بیوی پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔

برآمدے ہی میں جالیا۔

”آپ گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتے۔“

”ارے واہ..... جراثیم تو دیکھو۔“

برآمدے میں حمید کھڑا نظر آیا۔

”آپ سے بھی خدا ہی سمجھے حمید بھائی۔“ اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”کیا ہوا؟“

”آپ نہیں جانتے؟“

”جانتا ہوں لیکن قاسم نہیں جانتا۔“

”تو تو نہیں جانتا قاسم؟“ پشت سے آواز آئی اور حمید اس کی طرف مڑے بغیر بولا۔

”غلط فہمی ہوئی تھی۔“

”کچھ بھی ہو۔“ قاسم کی بیوی نے سخت لہجے میں کہا۔ ”آپ انہیں فلسفہ سازی کے چکر

نہیں ڈال سکیں گے۔“

”یہ بھی میری والدہ صاحبہ ہو گئی ہیں۔“ قاسم طنزیہ انداز میں بولا۔ ”آج ہی قیامت ہے۔“

”فضول باتیں نہ کیجئے۔“

”آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ سرمایہ قاسم کا نہیں لگے گا۔“

”لگے تو ٹھیکے سے نہ لگے تو ٹھیکے سے..... میں تو فلم پروڈیوسر ضرور ہوں گا۔“

”بات نہ بڑھاؤ۔“ حمید بولا۔

”اچھا تو یہ میرا قیام کر لیں غی؟“

”دو چپاتیاں اور پرہیزی شور بہ مقرر کر دیں گی۔“

”بس کھا موش..... زبان تو لگام دو..... تم سالے اور شہہ دیتے ہو۔“

”سالا جو ظہر اور تم پھر گالیوں پر اتر آئے۔ کچھ دنوں پہلے کی بات ہے تم نے کہا تھا کہ

مالا کی بجائے برادران لا کہا کرو گے۔“

”ایتنے دن مہتر کو کہہ دیا تھا تو یہ بُرا مان گئی تھیں۔“

”خیر چھوڑو..... میں تو تمہیں یہ بتانے آیا تھا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی۔“

”کس بات کی غلط فہمی؟“

”مطلب یہ کہ جنگل فلم کا وہ مطلب نہیں تھا جو ہم دونوں سمجھے تھے۔“

”قیام سمجھے تھے ہم دونوں۔“ قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

اب وہ پھر فون پر ایکسٹرا سپلائر کھوسٹ بھائی کے نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ ”یہ تو کون ہے..... میں کھوسٹ بھائی سے بات کرتا چاہتا ہوں..... نہیں ہیں..... جہنم میں جا

پھر اتنے زور سے ریسور کر ڈیل پر پٹخا کہ کمرہ گونج اٹھا۔

”توڑ ڈالو..... توڑ ڈالو۔“ عقب سے بیوی کی آواز آئی۔

قاسم جھلا کر مڑا۔ چند لمحے خاموشی سے اُسے گھورتا رہا پھر نرم لہجے میں بولا۔

”بتاؤ۔“

”دس پوچھئے۔“ جواب ملا۔

”صرف ایک بات..... وہ یہ کہ کس ترقیب سے میرا پیچھا چھوڑو گی۔“

”مجھے زہر دے دیجئے۔“

”تل کر نہ کھا جاؤں..... اتنی سی کوزہ ہر کیا دوں غا۔“ وہ کلے کی انگلی کے پچا

انگوٹھا رکھ کر بولا۔

”کھا نہیں سکے اسی کا تو افسوس ہے۔“

”الاقسم..... بڑی کچھ ہوئی..... اتنی دہلی پتلی ہو کہ بڑی کڑکری تلی جاؤ گی۔

مُر..... مُر..... ہائے ہائے۔“ وہ منہ چلاتا ہوا بولا۔ پھر پیچ سے تھوک کا

قالین پر ماری۔

”ارے..... ارے..... قالین پر تھوک دیا، حواس ٹھکانے ہیں یا نہیں۔“

”سوچ قر منہ میں پانی آغیا۔“ وہ اپنی آنکھیں نشلی بنا کر اُسے دیکھتا ہوا بولا۔

پہواؤں مرجع مسالا۔“

”آپ کچھ بھی کریں، اس وقت گھر سے باہر نہیں جاسکتے۔“

”اور اگر..... میں تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں تو.....؟“

اس کا جواب دینے ہی والی تھی کہ ایک ملازم کسی کا ملاقاتی کارڈ لے کر کمرے میں

ہوا۔

”تو آہرا.....! قاسم بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

اس کی بیوی نے کارڈ ملازم سے لے لیا اور باہر نکلی چلی آئی۔

”ہاں..... ہاں..... تم بھی جلاؤ۔“ وہ اُسے گھونسا دکھا کر بولا۔  
 ”اگر اب یہ ریکارڈ بجایا تو ریڈیو گرام کی ایسی تیسری قریے رکھ دوں گا۔“  
 ”اس کا بابو رنگ رنگیلا ہے تو آپ کو کیوں جلن لگتی ہے۔“ وہ ہنسی ضبط کرنے کی کوشش

کرتی ہوئی بولی۔

”میرے ٹھیکے سے۔“

”اب ختم کر دیو یہ بکواس اور چلو میرے ساتھ۔“ حمید نے کہا۔  
 ”جی نہیں..... معاف کیجئے..... اللہ آپ سے بچائے ہی رکھے۔“  
 ”تو پہلے کیوں وعدہ کر لیا تھا۔ اب تو کاغذات بھی تیار ہو گئے ہیں۔“  
 ”آپ آخر مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ کیا بات ہے۔“ قاسم کی بیوی نے شکایت آمیز

لہجے میں کہا۔

”کچھ جانوروں پر ایک تجرباتی فلم ہے۔ جنگل میں فلمائیں گے۔“  
 ”تو اس میں ان کا کیا کام۔“ قاسم کی بیوی نے مضحکہ اُڑانے کے سے انداز میں سوال کیا۔  
 ”اچھا..... اچھا.....!“ قاسم سر ہلا کر بولا۔ ”خوب بے وقوف بنا لو تم لو۔“ میں بھی سمجھ

لوں گا۔

”پروڈیوسر کی حیثیت سے کاغذات پر ان کا نام رہے گا۔ ہم اپنے نام سے کاروباری

نوعیت کی کوئی حرکت نہیں کر سکتے۔“ حمید قاسم کی طرف توجہ دیے بغیر بولا۔

”کرٹل صاحب بھی شریک ہیں؟“

”بالکل..... ورنہ مجھے ان باتوں سے کیا سروکار۔“

”اگر کرٹل صاحب بھی شریک ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”اے سبحان اللہ۔“ قاسم ہاتھ نچا کر بولا۔ ”گویا میں آپ کی اولاد ہوں کہ آپ تو قویٰ

اعتراض نہیں۔“

”فضول بکواس نہ کیجئے۔“ بیوی کو پھر غصہ آ گیا۔

”اے..... تم ابھی تک گئے نہیں۔“ قاسم نے حمید کو لاکار۔

”تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔ کرٹل صاحب منتظر ہو۔“

”یہی کہ اس میں لڑکیاں وڑکیاں بھی ہوں گی۔“

”اچھا تو پھر.....؟“

”اس فلم کی ہیروئن ایک لومڑی ہے۔“

قاسم کی بیوی نے قہقہہ لگایا اور قاسم پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔ ”تم جھوٹ

رہے ہو۔“

”کرٹل صاحب گھر ہی پر ہیں۔ فون کر کے معلوم کر سکتے ہو۔“

”ابے میں نے تو ایکسٹرا لوٹدیوں کا بھی انتظام کر لیا ہے۔“ قاسم آپے سے باہر

بولا۔

”تو تم الگ سے ایک فلم بنا ڈالو۔“

قاسم کی بیوی مسلسل ہنسنے جا رہی تھی۔

”چوپ رہو۔“ قاسم اس پر الٹ پڑا۔

”میں تو پہلے ہی جانتی تھی۔“

”کیا جانتی تھی.....؟“

”دن رات لوگ آپ کو بیوقوف بناتے رہتے ہیں۔“

”تمہارے باوا جان بھی انہی میں شامل ہیں۔“

”پھر آپ نے ان لوگوں کا نام لیا۔“

حمید نے بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کی اور قاسم پھر اُسی کے سر ہو گیا۔

”سب تمہاری وجہ سے ہوتا ہے۔ اچھا تم ہی میرا پیچھا چھوڑ دو۔“

قہقی اپنی شکل نہ دکھانا اور فلم تو میں اکیلے ہی بناؤں گا..... اس گانے کا ضرور جواب

غا..... جسے سن سن کر میری ہڈیاں سلگتی ہیں۔“

”کون سا گانا پیارے بھائی۔“

”جواب دوں گا..... جواب اس گانے کا..... ہو گا سالارنگ رنگیلا تم قیوں، ناچو گی۔“

قاسم کی بیوی پیٹ دبائے دوہری ہو گئی۔ کیونکہ قاسم نے جھلاہٹ میں گا کر ہی جواب

دیا تھا۔



”ان سے کہہ دینا کہ لومڑی وومڑی کا پروڈیوسر نہیں بن سکتا..... کوئی اور ڈھونڈ لیں۔“ بیوی کی نظر بچا کر حمید نے اسے آنکھ ماری۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے اس کی بیوی سے بیانی کرتا رہا ہو۔

قاسم نے پہلے تو بُرا سا منہ بنایا پھر سنبھالا لے کر بولا۔ ”اچھا..... اچھا..... چلو.....“ ہوں۔ لیکن میں صاف کہہ دوں گا.....!“

”تم خود ہی جو مناسب سمجھنا عذر پیش کر دینا۔ میری اب وہ نہیں سنیں گے۔“ قاسم کی بیوی اندر چلی گئی اور قاسم حمید کو بے اعتباری سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”پتا نہیں!“ چکر ہے۔“

”کیا تم کچھ دنوں گھر سے باہر رہ کر زندگی میں نیا پن پیدا نہیں کرنا چاہتے۔“ ”لوٹنویوں کے بغیر تفریح نہیں..... بیگار ہوتی ہے۔“ حمید اُسے گھر سے تو نکال لایا تھا لیکن وہ حمید کی گاڑی میں نہیں بیٹھا تھا۔ گیراج سے اپنی بیوک نکالی تھی۔ پھر دونوں آگے پیچھے نیا گرا اپنے تھے۔

”اے تم یہ قیاقرتے پھر رہے ہو۔“ قاسم نے نیا گرا کے ڈائمنگ ہال میں داخل ہونے وقت حمید کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔

”راوی عیش لکھتا ہے۔“ ”قیامطلب.....؟“

”آج رات بھر جشن آزادی منائیں گے۔“ ”ابے ابھی پچھلے ہی مہینے تو منائے چکے ہیں جشن آزادی۔“

”یہ ملک کی نہیں..... میری آزادی کی رات ہے۔ کل سے میری ایک ماہ کی چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں۔“

”ہم سارے سرمایہ دار غالیاں کھاتے ہیں اور تمہیں توئی کچھ نہیں کہتا۔“ ”کیا کہنا چاہتے ہو۔“ حمید چلتے چلتے رک کر اُسے گھورنے لگا۔

”اور قیام..... خود فلم بنانی ہوگی تو اسٹنٹ کو ایک ماہ کی چھٹی دلوادیں گے۔ کیا یہ قانونی بات ہے کہ سرکاری ملازم فلم بنانے نہیں۔“

”فلم تم بنا رہے ہو۔ چلو آگے بڑھو۔“

”ہاں..... ہاں..... یہی ہوتا ہے۔ خیر اب تو پھنس ہی گیا ہوں۔ مگر بیٹا وہ ڈائریکٹر تقصیر میں دن قرض صاحب کے ساتھ تھا وہ تو چو ما چاٹی والی فلمیں بناتا ہے۔“

”اسی لئے تو اسے لومڑی کے پلے باندھ رہے ہیں۔ ساری چو کڑی بھول جائے گا۔“ انہوں نے ایک ایسی میز پر قبضہ کیا جسکے قریب والی میز تین مہ رنوں سے آباد تھی۔

قاسم نے بغور ان کا جائزہ لیا اور صورت پر قیمتی طاری کر کے ٹھنڈی سانس لی۔ پھر اپنی ہوتی آواز میں بولا۔ ”پتہ نہیں کس کے مقدر کی ہیں۔“

”اپنے والد صاحب کا پتا بتا دو۔“ ”قیوں..... قیامطلب.....!“ قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

”مطلب یہ کہ تم تو اپنے مقدر کا فیصلہ کر نہیں سکتے۔ وہی کیا کرتے ہیں۔“ ”دیکھو..... طعنہ نہ دو..... بس ہوئی ایک بار۔“

”اوہو..... تو اس بار تم خود کرو گے۔“ ”ہاں..... ہاں..... جب میرا جی چاہے گا۔“

”ضرور..... ضرور۔“ حمید نے بے اعتباری کا مظاہرہ کرنے کے لئے قہقہہ لگایا۔ ”دیکھو..... مجھے غصہ نہ دلاؤ۔“

”غصہ غیرت مندوں کو آتا ہے۔ تم میں تو اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ بیوی کے کھن گائے بغیر دو چار دنوں ہی کے لئے شہر سے بھی باہر جاسکو۔“

”تم قیام جانو.....؟“ ”میں سب کچھ جانتا ہوں۔“

”تم جھک مارتے ہو۔“ ”میں غلط نہیں کہتا۔“

”بکواس ہے..... میں کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔“ ”کوئی دعویٰ ثبوت کے بغیر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔“

”قیام ثبوت چاہتے ہو.....؟“

”بس.....!“ اجنبی ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں صرف اس لئے آیا تھا کہ آپ کو.....!“  
 ”آگاہ کردوں۔“ فریدی نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔  
 ”جی.....!“

”آگاہ کردوں کہ اس بزنس میں کچھ ذمہ دار ہستیاں بھی شامل ہیں۔“  
 ”آپ خود سمجھدار ہیں۔“

”میں بھی آپ سے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں پوچھوں گا کہ اکیس نمبر کوٹرک نمبری  
 نوٹی فور کہاں ان لوڈ کیا گیا تھا۔“  
 ”میں کیا جانوں۔“

”پھر اس کا جواب کون دے سکے گا۔“

”ایڈمنسٹریٹو آفیسر.....!“

”براہ کرم اس سے معلوم کر کے مجھے مطلع کر دیجئے گا۔“

”اوہ..... تو آپ لوگ اس حد تک جا چکے ہیں۔ یعنی ہماری سپلائیز پر بھی نظر ہے۔“

”سیٹھ صاحب..... بہتری اسی میں ہے کہ آپ صحیح معلومات بہم پہنچائیں۔“

”کیا میں آپ کا فون استعمال کر سکتا ہوں۔“

”ضرور..... ضرور.....!“

اجنبی نے اٹھ کر فون پر کسی کے نمبر ڈائل کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تاریخ اور ٹرک کا نمبر  
 کیا بتایا تھا.....؟“

”اکیس نمبر..... ٹرک نمبری نوٹی فور.....!“ فریدی نے سگار کیس سے سگار نکالنے  
 ہوئے کہا۔

اجنبی نے کسی سے گفتگو کرنے کے بعد ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور جیب سے رومال  
 نکال کر اپنی پیشانی پر پھوٹ آنے والے قطرات خشک کرنے لگا۔

فریدی اُسے جواب طلب نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔

”اس نمبر کا ٹرک پچھلے ایک ماہ سے ناقابل استعمال ہے۔“ اجنبی نے بھرائی ہوئی آواز  
 میں کہا۔

”اپنا سوٹ کیس اور ہولڈال ابھی گھر سے یہاں لے آؤ۔ ایک ہفتے کی آؤٹنگ  
 اس کے لئے صرف ایک گھنٹہ دے سکتا ہوں۔“  
 ”اب تو جرور لاؤں گا..... یہیں بیٹھے رہنا۔“  
 ”بالکل..... فوراً جاؤ۔“

قاسم جھلاہٹ کا مظاہرہ کرتا ہوا اٹھا اور تھلٹھلاتا ہوا صدر دروازے کی طرف بڑھ



کرتل فریدی نے آنے والے کو گھور کر دیکھا۔ پھر سر کی جنبش سے بیٹھنے کا اشارہ کر  
 سامنے رکھے ہوئے کاغذات کی طرف متوجہ ہو گیا۔

آنے والا لباس اور رکھ رکھاؤ سے دولت مند طبقے کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ وہ چند  
 خاموش بیٹھا فریدی کی مشغولیت کو کینہ تو ز نظروں سے دیکھتا رہا پھر کھٹکھار کر بولا۔ ”میں  
 مطلب نہیں سمجھ سکا جناب۔“

”ابھی سمجھا دوں گا۔“ فریدی نے کاغذات سے نظر ہٹائے بغیر خشک لہجے میں کہا۔

اس معاہدے کی کاپی ہے جو آپ کی کمپنی اور ایک جرمن فرم کے درمیان ہوا تھا۔“

اجنبی نے طویل سانس لی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد فریدی نے کاغذات تہہ کر کے بائیں جانب سرکا دیئے اور اجنبی کو بغور

ہوا بولا۔

”پورے جرمنی میں اس نام کی کسی فرم کا وجود نہیں ہے۔“

”سوال تو یہ کہ آخر آپ ہمارے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟“

”ایسے معاملات کی چھان بین میرے فرائض میں داخل ہے۔ ہاں تو فرم کے

میں.....!“

”تو پھر غلط فہمی ہوتی ہوگی۔“ فریدی نرم لہجے میں کہہ کر اس طرح اٹھا جیسے اب اسے رخصت کر دینا چاہتا ہو۔

”میں پھر ایک بار عرض کروں گا۔“ اجنبی اس سے مصافحہ کرتا ہوا بولا۔ ”حالات بدل چکے ہیں۔ کہیں آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔“

”ارے نہیں سیٹھ صاحب۔“ فریدی ہنس کر بولا۔ ”میری کھال بہت موٹی ہے۔“ اگر پر بدلتے ہوئے موسموں کا اثر نہیں ہوتا۔ آپ بے فکر رہیں۔“

اجنبی نے اپنے ہونٹ سختی سے بھیجنے تھے اور دفتر سے باہر نکل گیا تھا۔



سردی بڑھ گئی تھی۔ مسافر نے سفری بیگ زمین پر رکھ دیا اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگائی اور پھر بیگ اٹھا کر اندھیرے میں چلنے لگا۔ انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ یہاں پہلی بار نہ آیا ہو۔ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر تاریک راستوں سے گزرتا ہوا بالآخر ایک بڑی عمارت کے سامنے آکھڑا ہوا۔

عمارت کی متعدد کھڑکیوں میں تیز قسم کی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ ڈاکٹر چنگیزی کی تجربہ گاہ تھی۔ اس علاقے کے لوگ اسے حیرت اور خوف سے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ کم از کم رات کے اندھیرے میں کوئی مقامی آدمی اس عمارت کے قریب سے بھی گزرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

ڈاکٹر چنگیزی ان اطراف میں سانپوں کا مسیحا کہلاتا تھا اور اس کی تجربہ گاہ سانپوں کے ہسپتال کے نام سے مشہور تھی۔

عمارت کی کمپاؤنڈ میں دن رات درجنوں سانپ سرسراتے پھرتے۔ عمارت سے ایک فراگ کے دائرے میں جگہ جگہ ایسے بورڈ نصب کر دیئے گئے تھے جن پر خطرے کی علامات بنی ہوئی تھیں۔ بہر حال اس سلسلے میں پوری پوری احتیاط برتی گئی تھی کہ کوئی اجنبی اچانک کسی خطے سے دوچار نہ ہو سکے، لیکن یہ مسافراتی خود اعتمادی کے ساتھ اس عمارت تک پہنچا تھا جیسے اسے سارے حالات کا علم پہلے ہی سے ہو۔

اس نے جیب سے ایک چھوٹی سی سیٹی نکالی اور اسے غالباً کسی مخصوص انداز میں بجانے لگا۔ پھر ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ پوری کمپاؤنڈ روشن ہو گئی اور ایک آدمی برآمدے سے بھانک کی طرح آتا دکھائی دیا۔

اس پورے علاقے میں بجلی کی روشنی اس عمارت کے علاوہ اور کہیں نہیں دکھائی دیتی تھی۔ بے قوت پیدا کر نیوالا ایک جنرل اس تجربہ گاہ کیلئے حکومت کی طرف سے مہیا کیا گیا تھا۔

عمارت کے اندر سے آنے والے نے مسافر کو ایک محفوظ راستے سے گزار کر اس کمرے میں پہنچا دیا جہاں دیواروں پر بڑے بڑے سانپوں کی کھالیں آویزاں تھیں۔

وہ ایک صوفے پر اس طرح نیم دراز ہو گیا جیسے بہت تھک گیا ہو۔

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر چنگیزی شب خوابی کے لہادے میں ملبوس پائپ سلگاتا ہوا کمرے

یہ سرحدی علاقے کا آخری دیہی ریلوے اسٹیشن تھا۔ رات کو ایک ٹرین یہاں آتی تھی اور بہت سویرے اندرون ملک کے لئے روانہ ہو جاتی تھی۔ نہ یہاں آنے والوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی اور نہ یہاں سے جانے والوں کی تعداد قابل ذکر ہوتی تھی۔

اس وقت بھی صرف ایک مسافر ٹرین سے اتر اٹھا۔ لیکن یہ کوئی دیہاتی نہیں تھا۔ اس کے جسم پر جدید ترین تراش کا لباس تھا۔ ہاتھ میں ایک وزنی سفری بیگ لٹکائے وہ پھانک آیا۔ پھانک پر نکٹ وصول کرنے والا موجود نہیں تھا اس لئے اس نے پھانک سے گزر کر ناکٹ نکٹ آفس کی کھڑکی پر رکھ دیا۔

بگنگ کلرک نے ہنس کر کہا۔ ”آپ کو بڑی تکلیف ہوئی جناب۔ دراصل اس وقت نہ یہاں بالکل اکیلا ہوں۔“

”کوئی بات نہیں۔“ جواباً مسافر مسکرایا اور نیم تاریک مسافر خانے سے گزرتا ہوا باہر آ گیا۔ ابھی رات کے آٹھ ہی بجے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت زیادہ رات گزر گئی ہو۔ جیسے ہی مسافر باہر نکلا نزدیک اور دور سے بے شمار کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں داخل ہوا۔ مسافر اُسے دیکھ کر احتراماً اٹھا تھا۔

”اوہو... تم... کہو کیسے آئے؟“ ڈاکٹر چنگیزی نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”ضرورت... ڈاکٹر...!“

”جلدی سے کہہ جاؤ... میں آرام کر رہا تھا۔“

”مرکزی محکمہ سرانجام نے چھان بین شروع کر دی ہے۔ مجھے سینٹھ اکرم نے بھیجا ہے۔“

”کیوں بھیجا ہے... اور اس اطلاع کا مجھ سے کیا تعلق؟“ ڈاکٹر اسے گھورتا ہوا بولا۔

”دراصل ڈرموں کی سپلائی کا علم کرنل فریدی کو ہو گیا ہے۔“

”کیا سینٹھ اکرم بالکل گدھا ہے۔ آخر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔“

”میں اس کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں ڈاکٹر۔“

”میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم لوگ یہاں آنے کیلئے بہانے تلاش کرتے رہتے ہو۔“

”نن... نہیں تو۔“

”بکواس مت کرو...!“ ڈاکٹر سخت لہجے میں بولا۔

نوادار کے چہرے پر ناگواری کے آثار نظر آئے اور اس نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ”میں اس کی وضاحت چاہوں گا ڈاکٹر۔“

”نینا کو گھورنے کے لئے آتے ہو تم لوگ۔“

”لاحول ولا قوۃ...!“ نوادار بُرا سا منہ بنا کر بولا۔ ”میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا آپ مجھ پر اس قسم کا کوئی الزام عائد کریں گے۔“

”ہوں...!“ ڈاکٹر نے پُر تفکر لہجے میں کہا۔ ”نینا بہت خوبصورت ہے۔“

”یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔ مجھے تو صرف سینٹھ اکرم کا پیغام آپ تک پہنچانا تھا۔“

”اوہو... تو کوئی پیغام بھی ہے۔“ ڈاکٹر چونک کر بولا۔

”جی ہاں... فی الحال وہ ڈرموں کی سپلائی روک رہے ہیں۔“

”آخر کیوں؟“

”کرنل فریدی!“

”کیا بکواس ہے۔ کرنل فریدی کو اس سے کیا سروکار... وہ کیا کر لے گا... کیا میں

میں کوئی غیر قانونی کام کر رہا ہوں۔“

”ڈاکٹر! میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ مجھ سے جو کچھ کہا گیا تھا آپکے گوش گزار کر دیا۔“

”سوال تو یہ ہے کہ اس کی نوبت ہی کیوں آئی۔ کیا اسرار آرن فیکٹری والے کوئی قانونی کام بھی کر رہے ہیں۔“

”میں اس کے بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔“

”اچھا... اب تم ریلوے اسٹیشن ہی واپس جاؤ۔ ویننگ روم میں سو رہنا اور صبح کی گاڑی سے واپس چلے جانا۔“

”مگر... میرے پاس بستر نہیں ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اتنی بے دہی سے پیش آئیں گے۔“

”کیا مطلب...؟“ ڈاکٹر کا لہجہ سرد تھا۔

”کیا میں یہاں رات نہیں گزار سکتا۔“

”جی نہیں... یہ سرائے نہیں ہے۔ تم پہلے بھی یہاں آچکے ہو، کبھی رات بسر کی ہے۔“

”لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں۔“

”خاموش رہو... اس سوٹ کیس میں کیا ہے؟“

”بندوق، کارتوس اور ایک عدد سلپنک سوٹ... خیال تھا کہ دو دن یہاں ٹھہر کر شکار لیں گا۔“

”تمہارے پاس سینٹھ اکرم کی جائیداد ہے نا یہ کہ تم یہاں شکار کھیلو گے۔ خبردار اگر ایک ازمنہ کی کیا میرے جنگلوں میں۔“

”میں آپ کو اتنا بد اخلاق نہیں سمجھتا تھا۔“

”سانپوں کی ہم نشینی نے زہریلا بنا دیا ہے۔“ ڈاکٹر کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”بہتر ہے مجھے غارت سے باہر بھجوا دیجئے۔ کسی نہ کسی طرح رات گزار کر چلا جاؤں گا۔“

”ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔ پھر سنجیدگی اختیار کر کے نرم لہجے میں بولا۔ ”بُرا مان گئے۔“

”ظاہر ہے۔“

نودار کی پلکیں نیند کے دباؤ سے بوجھل ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ بستر پر لیٹ گیا اور اس طرح بار بار آنکھیں پھاڑنے لگا جیسے نیند کے اس اچانک غلبے کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔ پھر وہ گہری نیند سو گیا تھا۔

نیک گیارہ بجے دو آدمی کمرے میں داخل ہوئے جنہوں نے ایک اسٹریچر اٹھا رکھا تھا۔ نیک میں غافل نودار کو انہوں نے بستر سے اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالا اور چلی منزل پر اتار لے

ساڑھے دس بجے ایک خوش شکل ملازمہ کافی لائی۔ نودار نے اسے لپٹائی ہوئی نگاہ سے دیکھا تھا اور وہ اس طرح مسکرائی تھی جیسے اس کے خیالات پڑھ رہی ہو۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ نودار نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”شلیم.....!“ جواب ملا۔

”کیا؟“

”شلیم.....!“

”بہت خوب.....!“ نودار ہنس پڑا۔

لیکن ملازمہ اب بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی تھی۔ اس نے کافی بنا کر پیالی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب مجھے شلیم ہی کہتے ہیں۔“

”مگر تمہارا نام تو جینیلی ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر کی بد اخلاقی پر رونا آ رہا ہے۔“

”آپ جینیلی ہی کہئے۔“

”یقیناً..... یقیناً..... تم کھڑی کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”جی نہیں شکریہ۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہو گیا تو..... میں“

برتن لے کر واپس جاؤں گی۔“

”اچھا..... اچھا..... میں جلد ہی پنے لیتا ہوں۔“

بڑے بڑے گھونٹ لے کر اس نے کپ خالی کر دیا اور اسے لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔

”یہ لو..... شکریہ..... اُوہ..... ایسی تھکن محسوس ہو رہی ہے جیسے سینکڑوں میل پیدل چلے“

ہوں۔“

لڑکی کچھ نہ بولی۔ ٹرے اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

لیکن دوسری صبح وہ اپنے بستر ہی پر بیدار ہوا تھا اور بیداری کا سبب ڈاکٹر چنگیزی کی دباہیز تھیں۔ وہ اس کے بستر کے قریب ہی کھڑا اس لڑکی پر گرج برس رہا تھا جو پچھلی رات اس کے لئے کافی لائی تھی۔

”کتیا کی بچی..... تو یہاں کیا کر رہی تھی۔ بولتی کیوں نہیں۔ میں ابھی کوڑے مار مار کر تیری کھال گرا دوں گا۔“

نودار نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا لیکن ناکام رہا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہاتھ پیروں کو جکڑ کر بند کر دیا گیا ہو۔

”اُدھیل آدمی..... تم پڑے میری صورت کیا تک رہے ہو۔“ دفعتاً ڈاکٹر اُسے گھونٹہ دکھا کر چیخا۔ ”اٹھو اور فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔“

”کک..... کیوں؟“ بدقت تمام اس کی زبان سے نکل سکا اور اُسے اپنی آواز ایسی ہی معلوم ہوئی جیسے کسی گہرے کنوئیں میں بول رہا ہو۔

”ڈھیل آدمی..... پوچھتے ہو کیوں۔ یہ یہاں کیا کر رہی تھی؟“ ڈاکٹر ملازمہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر دبا ہوا۔

”میں کیا جانوں۔“

”گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا اگر جھوٹ بولا۔ ساری رات یہ کتیا اسی کمرے میں رہی ہے..... بولتی کیوں نہیں۔“

ملازمہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے سسکیاں لیتی رہی۔

”مم..... مگر..... ڈاکٹر..... میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں۔“



”کیا چاہتی ہو؟“

”کہ اپنے ہی غصے کی آگ میں جل کر آپ بھسم ہو جائیں اور ہاں آپ اس فلم یونٹ

وہاں سے نہیں ہٹائیں گے۔ میری دلچسپی کی چیز ہے۔“

”تم ہوش میں ہو یا نہیں۔“

”ڈاکٹر! مجھے اس پر مجبور نہ کیجئے کہ کسی دن چپ چاپ یہاں سے چلی جاؤں اور پھر

پہنچے۔“

”جودل چاہے کرو۔“ ڈاکٹر پیر پیٹخ کر چیخا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔



نہ صرف کیپٹن حمید بلکہ قاسم بھی میک اپ میں تھا۔ انہوں نے شیشم کے جنگل میں اپنے

نیچے نصب کئے تھے۔ ان دونوں سمیت یہ فلم یونٹ پچیس افراد پر مشتمل تھا۔ پچھلے دن وہ یہاں

پہنچے تھے اور ابھی تک شوٹنگ کی تیاریاں ہی جاری تھیں۔

قاسم کا ذہن یقین اور بے یقینی کے درمیان ہلکولے کھا رہا تھا۔ یہ بات کسی طرح حلق

سے نہیں اترتی تھی کہ کوئی فلم عورت کے بغیر بھی بنائی جاسکتی ہے۔

”کیا عورت..... عورت کی رٹ لگا رکھی ہے۔“ حمید بھنا کر بولا۔

”شہر ہی میں کوئی نصیب ہو جاتی ہیں۔“

”اب یہاں اس جنگل میں لاقر میری توہین کرو غے۔“ قاسم نے چاروں طرف دیکھتے

ہوئے کہا۔

وہ اس وقت اپنے خیمے کے باہر بیٹھے دھوپ لے رہے تھے۔ پچھلی رات سردی نے

”ناپوچھ لئے تھے۔ قاسم کا برا حال تھا اور رات ہی کو حمید نے اس دشواری پر قابو پانے کی

مہمیں سوچ لی تھیں۔

”میں بہت تھک گئی ہوں۔“ لڑکی نے کہا اور تیزی سے مڑی۔

ڈاکٹر اسے بے بسی سے دیکھتا رہ گیا اور وہ کمرے سے نکلی چلی گئی تھی۔

پھر اچانک ڈاکٹر چنگیزی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ دوسرے

لمحے میں اس کا گھونہ آرام کرسی کے قریب والی چھوٹی میز پر پڑا اور وہ اپنے پایوں پر

نکڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس کے بعد وہ شاید کسی اور چیز پر غصہ اتارنے کا ارادہ کرے

کہ ایک آدمی کمرے میں داخل ہوا۔

”کیا ہے؟“ ڈاکٹر غرایا۔

”شیشم کے جنگلوں میں ایک فلم یونٹ نے ڈیرا ڈال دیا ہے۔ آؤٹ ڈور

کر رہے ہیں۔“

”کس کی اجازت سے؟“

”میری اجازت سے۔“ بائیں جانب سے آواز آئی اور ڈاکٹر جھلا کر پلٹا۔ دروازے

میں نیا کھڑی تھی۔

”کیا مطلب.....؟“

”وہ کوئی جنگل فلم بنا رہے ہیں۔ میں نے بھی انہیں دیکھا تھا۔“

”تم نے کہا تھا کہ تمہاری اجازت سے۔“

”اجازت ہی سمجھئے۔ کیونکہ میں نے انہیں وہاں سے ہٹ جانے کی وارننگ نہیں دئی

”تم جاؤ.....!“ ڈاکٹر نے اطلاع لانے والے کی طرف ہاتھ ہلا کر کہا۔

وہ چپ چاپ کمرے سے باہر چلا گیا اور ڈاکٹر نیا کو گھورتا ہوا بولا۔ ”تم بہت

ہوتی جا رہی ہو۔“

”قدرتی بات ہے۔“ وہ دلاؤ ویز انداز میں مسکرائی۔

”تم بعض اوقات حد سے بڑھ جاتی ہو۔“

”ٹھیک ہے تو پھر مجھے ملازمت سے برطرف کر دیجئے۔“

”مجھے غصہ نہ دلاؤ۔“

”میں یہی چاہتی ہوں۔“

ساتھ بولا۔ ”تم سالے فراڈ ہو۔ یونہی بکواس کر رہے ہو تاکہ میں تمہارا ساتھ دیتا رہوں۔“  
”دیکھ لینا..... تھوڑی دیر بعد پہنچ جائے گی۔“

ٹھیک اسی وقت انہوں نے کسی وزنی گاڑی کے انجن کی آواز سنی، جو لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتی جا رہی تھی اور پھر ایک جیپ خیموں کے درمیان آڑکی۔ قاسم نے تھیرانہ انداز میں پلکیں جپکائی تھیں اور حمید اس کا بازو دبا کر آہستہ سے بولا تھا۔  
”یہ کوئی اور ہے..... بدحواس نہ ہو جانا۔“

”اے یہ تو کسی انگلش فلم کی ہیروئن معلوم ہوتی ہے حمید بھائی۔ ہائے ہائے کیا جین بیٹ ہے۔ ارے باپ رے۔ رائفل بھی ہے۔ اس کے پاس..... ہائے۔“  
لڑکی جیپ سے اتری نہیں تھی۔ اسٹیرنگ کے سامنے بیٹھی گرد و پیش کا جائزہ لیتی رہی۔  
”فرمائیے..... کس کی تلاش ہے۔“ حمید نے آگے بڑھ کر بڑے ادب سے سوال کیا۔  
”اوہ.....!“ وہ چونک پڑی۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“  
”ہم ایک فلم کی شوٹنگ کر رہے ہیں۔“  
”میں یونٹ کے انچارج سے ملنا چاہتی ہوں۔“  
”فرمائیے۔“

”اوہ..... آپ ہی ہیں۔ اچھا دیکھئے۔ سب سے پہلے تو میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ آپ نے غیر قانونی طور پر یہاں کھڑا گ پھیلایا ہے۔“  
”میں نہیں سمجھا محترمہ۔“

”آپ کو ہم سے اجازت لینی چاہئے تھی۔“

”ہمارے پاس محکمہ جنگلات کا اجازت نامہ موجود ہے۔“

”محکمہ جنگلات کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں۔“

”اچھا تو اب آپ ہی اجازت دے دیجئے۔“

”خیر..... خیر.....!“ وہ کسی قدر غصے کا اظہار کرتی ہوئی بولی۔ ”یہاں سانپ بکثرت ہیں۔“

”مجھے علم ہے اور ہم نے اس سلسلے میں احتیاطی تدابیر اختیار کر لی ہیں۔“

”اسکے باوجود اگر مارگزیدگی کا کوئی واقعہ ہو جائے تو آپ فوراً ڈاکٹر چنگیزی کی تجزیہ گاہ

آج خیموں کے اندر بھی الاؤ روشن کرنے کے انتظامات کئے جا رہے تھے۔  
”مگر بیٹا..... وہ..... ڈائریکٹر قنصل کہاں ہے؟“ قاسم نے سوال کیا۔

”فضول پیسے برباد کرنے سے کیا فائدہ جبکہ میں خود فلم ڈائریکٹر کر سکتا ہوں۔“  
”قیام طلب.....؟“

”میں فلم ڈائریکٹر کروں گا اور شاید تمہیں یہ نہیں معلوم کہ تم جنگلیوں کے سردار ادا کرو گے۔“

”اب پھر شروع کی تم نے اپنی چار سو بیس۔“ قاسم آنکھیں نکال کر بولا۔

”کیا مطلب.....؟“

”تم نے تو کہا تھا کہ میں صرف پروڈیوسر رہوں گا۔“

”تم بکواس کر رہے ہو۔ میں نے لفظ صرف، قطعی استعمال نہیں کیا تھا۔“

”میں نہیں بننا جنگلیوں کا سردار۔“

”اچھی بات ہے تو پھر تمہیں اس بکرے میں سے کچھ بھی نہیں ملے گا جو انگاروں

جائے گا۔“

”ہاں ہاں، میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا کہ تم اقلیے میں جردور کمینہ پن کرو گے۔“

”اور تمہیں چھیڑوں گا بھی اکیلے میں۔“

”چھیڑ کر تو دیجو.....!“ قاسم دہاڑتا ہوا اٹھ گیا۔ ”ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا۔“

حمید اسے آنکھ مار کر مسکرایا۔

”دیو! میں سمجھائے دیتا ہوں..... جان نہ جلاؤ۔“

”جنگلی سردار کی مجبوریہ تو ابھی پہنچی ہی نہیں۔“

”سک..... کیا مطلب.....؟“

”وہ ایک خونخوار عورت کا رول ادا کرے گی۔“

”سالے تھوڑا تھوڑا کر کے بتاتے ہو۔“ قاسم کسی قدر ڈھیلا پڑ کر بولا۔ ”تم نے

ایک بالشت چھوٹی ہوگی اور پھیلاؤ تم خود ہی دیکھ لینا۔“

قاسم نے بیچ سے تھوک کی پچکاری ماری اور منہ چلانے لگا۔ پھر کھسیانی سی



سے رابطہ قائم کیجئے گا۔“

”ہم نہیں جانتے کہ ڈاکٹر صاحب کی تجربہ گاہ کہاں ہے۔“

”یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ میں ان کی اسٹنٹ نیا ہوں۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

”یہ کس قسم کی فلم ہے۔“

”جنگل فلم سمجھ لیجئے۔“

”کون ڈائریکٹ کر رہا ہے؟“

”میری پہلی فلم ہے۔“ حمید نے ایسے لہجے میں کہا جس سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا

خود ہی اس فلم کو ڈائریکٹ کر رہا ہے۔

”کیا ابھی کام شروع نہیں کیا.....؟“

”سہ پہر سے شروع کر دیں گے۔“

نیا بار بار قاسم کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ دفعتاً اس نے سوال کیا۔ ”کیا وہ مجھے“

ادا کار ہے؟“

”جی ہاں..... وہ جنگلیوں کے سردار کا رول ادا کرے گا۔“

”شاید یہ بھی نیا ہے۔ اس سے پہلے کسی فلم میں نہیں دیکھا۔“

”جی ہاں، نیا ہی ہے۔ میں دراصل یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ باکس“

پکچر کے لئے ضروری نہیں کہ نامور آرٹسٹ ہی کاسٹ میں شامل ہوں۔ اصل چیز تو کہانی

ٹریٹمنٹ ہوتا ہے۔“

”بڑا نیک قدم ہے۔ پُرانے چہرے دیکھ کر آنکھیں پتھر اگئیں۔ لیکن پریم کہا“

یقیناً ہوگی۔“

”یہی تو خاص بات ہے کہ پوری کہانی میں آپ لفظ محبت سننے کو ترس جائیں گی۔“

”تب تو واقعی آپ قابل مبارک باد ہیں۔“

”شکریہ۔“

”چلئے..... میں آپ کو تجربہ گاہ دکھا دوں تاکہ ضرورت پڑنے پر آپ ہم تک پہنچ سکیں۔“

”بہت بہت شکریہ محترمہ..... میں ضرور چلوں گا۔“

”آئیے۔“ نیما نے اپنے برابر والی نشست کی طرف اشارہ کیا۔

حمید جیب پر بیٹھ ہی رہا تھا کہ قاسم بھی لڑھکتا ہوا قریب آ پہنچا۔

”تہاں چلے؟“ وہ ہاتھ نچا کر بولا۔

”ابھی آیا..... تم وہیں جا کر بیٹھو جہاں بیٹھے ہوئے تھے۔“

”ہرگز نہیں۔ میں بھی ساتھ چلوں گا۔“

”چاروں نائز فلیٹ ہو جائیں گے۔“ حمید نے ایسے انداز میں کہا کہ نیما ہنس پڑی۔

”کیا حرج ہے۔ انہیں بھی لے چلئے۔“ اُس نے جلدی سے کہا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ حمید نے بے دلی سے پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

”شو کریہ۔“ قاسم جیب پر چڑھتا ہوا کرا رہا تھا۔

حمید نے سوچا کہ جلد از جلد قاسم کو اس سچویشن سے آگاہ کر دینا چاہئے ورنہ کہیں وہ اپنی

کسی بکواس سے بھانڈا نہ پھوڑ دے۔

”یہ محترمہ نیا ہیں..... کسی ڈاکٹر چنگیزی کی اسٹنٹ..... ہمیں اپنی تجربہ گاہ دکھانے جا رہی

ہیں اور یہ مایہ ناز ادا کار قاسم قراقرم والا ہیں۔ میری فلم میں جنگلی سردار کا رول ادا کریں گے۔“

”آپ نے اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا۔“ نیا بولی اور جیب اشارت ہو کر آگے بڑھ گئی۔

”ایس۔ ایچ۔ زیو.....“ حمید نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”یہاں آ کر بیچھتا رہا

ہوں۔ ہالی وڈ میں بہت اچھا تھا۔“

”وہاں کیا کرتے تھے؟“

”اُردو کے برّی ادب سے آئیڈیاز پار کر کے وہاں کے فلسفوں کے ہاتھ فروخت

کر دیا کرتا تھا۔“

”تو کیا یہ کوئی اچھی بات تھی؟“ نیما نے کسی قدر ناگواری سے سوال کیا۔

”میلنس برابر کیا کرتا تھا اس طرح آخر اردو والے بھی تو انگریزی ادب پر ہاتھ صاف

کرتے رہتے ہیں۔ اب ان بیچاروں کو اردو تو آتی نہیں کہ وہ خود ہی انتقام لے سکیں۔“

”بہر حال میں اسے اچھا نہیں سمجھتی۔“

”لیکن جہاں آپ لوگوں نے قیام کیا ہے، وہاں دوسری مختلف اقسام کے سانپ بھی بولی۔“ ان میں سے کچھ زہریلے بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔“  
 ”لیکن میں نے سنا ہے کہ بہت زیادہ موٹے آدمیوں کو سانپ نہیں ڈستے۔“ حمید نے اونچی آواز میں کہا اور قاسم ترک کر بولا۔ ”ہاں..... ہاں..... بھانجے لگتے ہیں ناموٹے آدمیوں سے..... وہاں سے اکھاڑو خیمے..... میں اب وہاں نہیں رہوں گا.....!“  
 نیما کو پھر ہنسی آ گئی۔

جیپ ایک بڑی سی عمارت کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہی تھی۔ پورچ میں پہنچ کر نیما نے انجن بند کر دیا۔ ٹھیک اسی وقت صدر دروازے میں ایک قوی ہیکل آدمی کھڑا دکھائی دیا۔  
 ”ڈاکٹر چنگیزی.....!“ نیما آہستہ سے بولی۔  
 ”شاندار.....!“ حمید نے اُسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔  
 ڈاکٹر چنگیزی انہیں ناخوشگوار انداز میں گھورے جا رہا تھا۔

پھر جیسے ہی قاسم جیپ سے نیچے اُترا، ڈاکٹر کی آنکھوں میں پائی جانے والی ناگواری یقیناً تحیر اور دلچسپی کے تاثر میں تبدیل ہو گئی۔

”ویل..... ویل.....!“ کہتا ہوا وہ آگے بڑھا۔  
 ”یہ وہی لوگ ہیں ڈاکٹر۔“ نیما سپاٹ لہجے میں بولی۔  
 ”کون لوگ.....؟“  
 ”قلم والے۔“

”اوہ.....!“ ڈاکٹر نے پھر بُرا سا منہ بنایا۔

”ہمیں بے حد افسوس ہے ڈاکٹر۔“ حمید مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا۔ ”آپ لوگوں سے اجازت حاصل کئے بغیر ہم نے وہاں پڑاؤ ڈال دیا۔ میں ایس ایچ زیٹو ہوں اور یہ قاسم قرقرم والا۔“

”دونوں نام پسند نہیں آئے۔“ ڈاکٹر نے خشک لہجے میں کہا اور نیما سے بولا۔ ”تم انہیں یہاں کیوں لائی ہو۔“

”تجربہ گاہ دکھانا چاہتی تھی تاکہ ضرورت پڑنے پر یہ ہم تک پہنچ سکیں۔“

”اچھا تو میں بھی نہیں سمجھتا لیکن پیٹ کے لئے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔“  
 ”لیکن آپ نے تو ابھی کہا تھا کہ یہ آپ کی پہلی فلم ہے۔“  
 ”بحیثیت ڈائریکٹر..... اس سے پہلے کبھی کوئی فلم ڈائریکٹ نہیں کی۔“

قاسم جو اس دوران میں خاموش بیٹھا ان کی گفتگو سنتا رہا تھا دفعتاً دہاڑا۔ ”ارے..... کتنا بڑا سانپ ہے..... اثر دھا ہے۔“

نیما ہنس پڑی اور حمید نے طویل سانس لی۔ بائیں جانب جھاڑیوں کے قریب ایک گیارہ فٹ لمبا اجگر آہستہ آہستہ ریگ رہا تھا۔

”بھلا آپ جنگلی سرداروں کا رول کس طرح ادا کریں گے۔“ نیما نے قاسم کو ٹھٹھا کرتے ہوئے کہا۔ ”جبکہ سانپ دیکھ کر ڈر جاتے ہیں۔“

قاسم کچھ نہ بولا۔ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ جا رہا تھا۔ اچانک پھر چیخا۔  
 ”اے..... ایک اور..... قیاقصہ ہے۔“

اور پھر کچھ دور چلنے کے بعد نیما نے اچانک بریک لگائے۔ جیپ جھٹکے کے ساتھ گئی۔ قریباً دس گز کے فاصلے پر ایک بہت بڑا اجگر راستہ پار کر رہا تھا۔

”ارے..... ارے..... روک کیوں دیا۔“ قاسم بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔  
 ”غاڑی سے کچل دیجئے۔“

نیما ہنس پڑی اور پھر سنجیدگی اختیار کر کے بولی۔ ”یہ ہمارے سانپ ہیں جناب۔“  
 ”قیام طلب.....؟“

”ہم ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔“

”کیا آپ سچ کہہ رہی ہیں؟“ حمید نے اپنے لہجے سے خوفزدگی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔  
 ”جی ہاں..... اوہ..... آپ ڈر رہے ہیں۔“ وہ ہنس کر بولی۔  
 ”نہن..... نہیں..... ڈر تو نہیں رہا..... لیکن.....!“

”ہم انکی فارمنگ کر رہے ہیں۔ ان کی کھالیں بیرون ملک بھیج کر زر مبادلہ کماتے ہیں۔“  
 ”اوہ..... اچھا.....!“ حمید نے اطمینان ظاہر کرنے کی ایکٹنگ کی۔

”یہ بالکل بے ضرر ہیں۔ ان میں زہر نہیں ہوتا۔ بس گوشت خور جانور سمجھ لیجئے۔“

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک اور لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے بڑی گادٹ کے ساتھ قاسم کو مخاطب کیا۔ ”آپ بلیک کافی پسند فرمائیں گے یا دودھ کے ساتھ؟“

”جی بس..... جیسی بھی مل جائے۔“ قاسم کے دانت نکل پڑے۔

”نہیں آپ بتائیے۔“ وہ پلک کر بولی۔ ”اتنے زبردست ہیں اور اتنی ذرا سی بات نہیں

بتا سکتے۔“

”ہی ہی ہی..... اب میں قیاً عرض قروں۔“

”خیر..... کچھ کھائیے گا بھی..... یا صرف کافی.....؟“

”شش.....!“ حمید قاسم کو دامن گسیدینے کے سے انداز میں بولا۔ ”ذرا محتاط ہو کر..... یہ

تو اس طرح پوچھ رہی ہیں جیسے ہمیں بل بھی ادا کرنا پڑے گا۔“

”جی نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو دراصل یہ چاہتی ہوں کہ یہ بولتے رہیں اور

اور میں سنتی رہوں۔“ وہ قاسم کی طرف اشارہ کر کے اٹھلائی۔

حمید اس غیر متوقع بے تکلفی پر جڑبڑ ہو ہی رہا تھا کہ نیا کمرے میں داخل ہوئی، لڑکی اسے دیکھتے ہی ایسی سنجیدہ بن گئی جیسے اب تک بالکل خاموش کھڑی رہی ہو۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو.....؟“ نیما نے اسے سخت لہجے میں مخاطب کیا۔

”پوچھنے آئی تھی کہ بلیک کافی یا.....!“

”جاؤ.....!“ نیما آنکھیں نکال کر بولی اور وہ لڑکی تیزی سے باہر چلی گئی۔

”کچھ افراد خاص قسم کے لوگوں کے لئے بعض کمزوریاں بھی رکھتے ہیں۔“ نیما نے

مذرت طلب لہجے میں کہا۔ ”یہ لڑکی لمبے چوڑے آدمیوں کو دیکھ کر پاگل ہو جاتی ہے۔“

”اجی..... میں قیاً..... ہی ہی ہی۔“ قاسم نے شرما جانے کی ایکٹنگ کی تھی۔

نیما اس کی مضحکہ خیز حالت دیکھ کر ہنس پڑی اور بولی۔ ”آپ تو فلموں میں بہت لافٹر

لیتے ہوں گے۔“

”اتفاق سے یہ روزمرہ زندگی میں بھی لافٹر ہی لیتے رہتے ہیں۔“ حمید بولا۔

”ہاں..... تو آپ کی فلم کی ہیروئن کون ہے؟“ نیما نے حمید کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے

بوسے پوچھا۔

”سوال سید ہے کہ اس قسم کا خطرہ ہی کیوں مول لیا جائے۔“

”دراصل وہ جلد ہمیں بہت مناسب نظر آئی تھی۔“ حمید بولا۔

”اب نامناسب سمجھ کر وہاں سے ہٹ جاؤ۔“ ڈاکٹر نے جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کر

ہوئے کہا۔

”اگر محتاط رہیں گے تو کسی دشواری میں نہیں پڑیں گے۔“ نیا بول پڑی۔

ڈاکٹر نے اسے غصیلی نظروں سے دیکھا اور تیزی سے مڑ کر اندر چلا گیا۔

حمید کو نیما کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ نظر آئی جیسے وہ ڈاکٹر کے چڑچڑے پن، مظلوظ ہوئی ہو۔

”چلے..... اندر چلے۔“ اس نے ان دونوں سے کہا۔

”مجھے تو خوف معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر سے۔“ حمید بولا۔

”اُدہ..... کچھ نہیں..... وہ تو بس یونہی۔“

”اے ہاں..... چلو تا..... ڈرتے قیوں ہو۔“ قاسم چپک کر بولا۔ ”کوئی شیر تھوڑا ہی ہے

کہ پھاڑ کھائے گا۔“

وہ انہیں نشست کے کمرے میں لائی۔ قاسم نہ جانے کیوں بہت زیادہ خوش نظر آنے لگا۔

”آپ لوگ تشریف رکھئے۔“ نیا بولی۔ ”میں کافی کے لئے کہہ آؤں۔ یا آپ چاہا

پسند کریں گے۔“

”ارے نہیں..... اس کی تکلیف نہ کیجئے۔“ حمید نے کہا لیکن قاسم فوراً ہی بول پڑا۔

”کافی ہی ٹھیک رہے گی۔“

نیا چلی گئی اور حمید اسے گھورتا ہوا بولا۔ ”آخر تم یک بیک اتنے خوش کیوں نظر آنے لگے

ہو۔“

”جین اور جیکٹ میں بڑی اچھی لگتی ہے۔“ قاسم نے آہستہ سے کہا۔ ”ایسا معلوم ہے

ہے جیسے جین اور جیکٹ ہی کے لئے پیدا ہوئی ہو۔“

”جین اور جیکٹ پہنے ہوئے پیدا ہوئی ہوگی۔“

”مگر ڈاکٹر سالہ..... کھتر تاں معلوم ہوتا ہے۔“

”دیکھئے..... قصہ دراصل یہ ہے کہ ہم ایک بالکل ہی نیا تجربہ کرنے جا رہے ہیں  
لئے کوئی معروف ہیروئن اس کے لئے تیار نہیں ہوئی۔“  
”نئے تجربے سے کیا مراد ہے۔“  
”کہانی عام ڈگر سے اتنی ہی ہوئی ہے کہ لوگوں نے ابھی سے میرا مذاق اڑانا شروع  
کر دیا ہے۔“  
”پھر بھی.....!“

”اس فلم کی ہیروئن دراصل ایک لومڑی ہے۔“  
”کیا بکواس کر رہے ہو۔“ پشت سے آواز آئی اور وہ چونک پڑے۔ بائیں جانب  
والے دروازے میں ڈاکٹر چنگیزی کھڑا نظر آیا۔  
”لومڑی کی سی شکل والی کوئی عورت..... میرا مطلب تھا.....!“ حمید نے بڑی مسکراہٹ  
مندی سے کہا۔

ڈاکٹر تیزی سے چل کر ان کے قریب آ کھڑا ہوا۔  
”ہماری فلم بہت نیچرل ہوگی۔“ حمید پُر سکون لہجے میں بولا۔  
”لومڑی کی کیا بات کر رہے تھے؟“  
”آپ تشریف رکھئے تو عرض کروں۔“  
”میں پوچھ رہا ہوں..... لومڑی کی کیا بات تھی۔“  
”کہانی دراصل یوں ہے کہ ایک شکاری یعنی ہیرو ایک لومڑی کا تعاقب کرتا ہے  
لومڑی ایک غار میں داخل ہو جاتی ہے اور جب ہیرو اس غار کے قریب پہنچتا ہے تو لومڑی کی  
سی شکل والی ایک عورت غار سے جھانکتی نظر آتی ہے۔“  
”تم بکواس کر رہے ہو۔“

”ٹلیکویژن چینل.....!“ حمید کو بھی غصہ آ گیا۔  
”لومڑی۔“ ڈاکٹر اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا سانپ کی طرح ہنسنے لگا۔  
”ڈاکٹر.....!“ نیا اونچی آواز میں بولی۔ ”سیریس ہونے کی ضرورت نہیں۔“  
حمید نے محسوس کیا جیسے اس وارننگ پر ڈاکٹر سنبھل گیا ہو۔ پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ

”لیکن یہ کہانی نیچرل کس طرح کہلائے گی۔“  
”اس طرح ڈاکٹر کہ ہیروئن عام طور پر بہت خوبصورت ہوتی ہے لیکن میں ایک ایسی  
نی فٹار ہا ہوں جس کی ہیروئن لومڑی کی شکل کی ہے۔“  
”پھر لومڑی۔“ ڈاکٹر پیر پنچ کر دہاڑا۔  
”اوہ ریٹو صاحب۔“ نیا جلدی سے بولی۔ ”دراصل ڈاکٹر کو لفظ لومڑی سے نفرت ہے۔“  
”لومڑی کو بے گتہہ کہتے ہیں۔“

”اور بے گتہہ کو قیا کہتے ہیں۔“ قاسم نے ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔  
ڈاکٹر نیا کو قہر آلود نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔ پھر وہ تیزی سے مڑا اور بائیں جانب  
لے دروازے سے گزر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔  
”ڈاکٹر صاحب میری سمجھ میں نہیں آئے۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔  
”ہر جینیس کی کوئی نہ کوئی کمزوری بھی ہوتی ہے۔“ نیا نے پُر زور آواز میں کہا۔  
”میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں۔ کیا کبھی ڈاکٹر کی زندگی سے کوئی بہت زیادہ چالاک  
عورت بھی وابستہ رہی ہے۔“

”کمال ہے۔“ نیا تحیر زدگی کے عالم میں حمید کو دیکھتی رہ گئی۔  
”قیاقال ہے۔“ قاسم چڑھ کر بولا۔  
”یہ اتنی جلدی معاملے کی تہہ تک پہنچ گئے۔“ نیا طویل سانس لے کر بولی۔  
”دراصل نفسیات میرا محبوب ترین سبجیکٹ ہے۔“ حمید نے شرمیلی سی مسکراہٹ کے  
ساتھ کہا۔  
قاسم نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ دوسری لڑکی ناشتے کی  
ننان دھلیکتی ہوئی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

حمید نے واضح طور پر دیکھا تھا کہ لڑکی نے ایک بیہودہ سا اشارہ کیا تھا۔ دفعتاً نیا اٹھتی  
نہیں بولی۔ ”آپ لوگ کافی پیچھے۔ میں ابھی آئی۔“  
”چلی گئی اور دوسری لڑکی قاسم کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔“ آپ تو اس طرح شرما  
تے ہیں جیسے کوئی دیہاتی لڑکی۔ یہ سینڈوچ لیجئے نا۔“

”تم چاہو تو لے جا سکتی ہو اور ڈاکٹر سے کہہ سکتی ہو کہ تم خود لے گئی تھیں۔“

”ہوں..... اچھا.....!“ نینا کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ ”چلو۔“

پہلے قاسم بیٹھا تھا اس کے بعد لڑکی بیچی ہوئی جگہ پر نکلتی ہوئی قاسم کے کان میں آہستہ بولی تھی۔ ”مجھے سنبھالے رہنا ورنہ گر جاؤں گی۔“

قاسم کے دانت نکل پڑے اور اس نے تھمبی انداز میں سر کو جنبش دی۔

بیپ نامہوار راستوں سے گزرنے لگی تو ایک بار اس لڑکی نے قاسم پر لدتے ہوئے کہا۔

”میرا نام کلارا ہے۔“

”پپ..... پپ..... پیارا ہے۔“ قاسم ہکھلایا۔

”میں بھی فلم میں کام کرنا چاہتی ہوں۔“

”قریے..... قریے۔“

”آپ کا کیا رول ہے؟“

”مم..... میں جنگیوں کا سردار ہوں۔“

”مجھے سردار بنالو۔“

”ہی ہی ہی..... مذاخ قرری ہیں آپ.....!“

”تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔“

”غغغغغ.....!“ قاسم کے حلق سے بے ہنگم آوازوں کے علاوہ اور کچھ نہ نکل سکا۔

تھوڑی دیر بعد جب ان کے ٹھکانے پر پہنچ گئی۔ نینا نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے

تنبہ سے کہا۔ ”مگر کیا ضروری ہے کہ آپ کو اسی وقت کوئی لومڑی مل ہی جائے جب آپ

ٹھکانے سے اس کا تعاقب کرانا چاہتے ہوں۔“

”ہمارے پاس ایک لومڑی موجود ہے۔“

”ہائے موجود ہے۔“ کلارا اٹھلائی۔ ”مجھے بھی دکھائیے۔ میں نے آج تک لومڑی نہیں

تیبہ اسے چھو لاری میں لایا جہاں لومڑی کا پنجرہ رکھا تھا۔

”ہائے..... کتنی پیاری لگ رہی ہے۔“ کلارا چہکارتی ہوئی آواز میں بولی۔

”ہی ہی ہی..... جی ہاں..... جی ہاں۔“ قاسم نے ہاتھ بڑھا کر ایک سینڈوچ

اور غزاپ سے پورا کا پورا ایک ہی بار منہ میں رکھ لیا۔

حمید نے اپنے لئے کافی انڈیلی لیکن لڑکی نے اُسے سینڈوچ کھانے کی دعوت نہیں تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ لڑکی ذہنی طور پر قاسم پر لدی پڑ رہی ہو۔

”سب کھا لیجئے جناب۔ تکلف کی ضرورت نہیں۔“ اس بار وہ قاسم کے شانے پر رکھ کر اٹھلائی۔

قاسم فخریہ انداز میں حمید کی طرف دیکھتا ہوا اپنی مسکراہٹ کی مٹی پلید کئے جاہا ظاہر ہے منہ تو سینڈوچ سے بھرا ہوا تھا اس پر سے مسکرانے کی کوشش۔

”کیا آپ مجھے اپنی تندرستی کا راز بتا سکتے ہیں؟“ لڑکی نے بڑے پیار سے پوچھا۔

”خوب خاؤ۔“ قاسم منہ چلاتا ہوا بولا۔

حمید خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ یہ لڑکی بھی خوش شکل اور صحت مند تھی۔ قاسم نے کافی بنائی اور پیالی اسکی طرف کھسکاتی ہوئی بولی۔ ”کہئے تو کھانے کو کچھ اور بھی لاؤ۔“

”نہیں.....!“ حمید جلدی سے بولا۔ ”انہیں زیادہ نہ کھائیے۔ ابھی بہت کام پڑے ہیں۔“

اس پر قاسم نے اُسے غصیلی نظروں سے دیکھا تھا لیکن کچھ بولا نہیں تھا۔ کافی ختم ہونے سے پہلے ہی نینا پھر کمرے میں داخل ہوئی۔

”چلئے..... اب میں آپ لوگوں کو وہاں چھوڑ آؤں۔ سہ پہر کو شوٹنگ دیکھنے آؤں گا۔“ اس نے کہا۔

”ضرور..... ضرور.....!“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”مجھے بے حد خوشی ہوگی۔“

قاسم نے جلدی سے بقیہ کافی حلق میں انڈیلی تھی اور اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”میں بھی چلوں؟“ دوسری لڑکی نے نینا سے پوچھا۔

”تم کہاں بیٹھو گی۔“ نینا نے قاسم کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”پچھلی سیٹ پر تو صرف

ساتھیں گے۔“

”میں بیٹھ جاؤں گی کسی نہ کسی طرح۔“

”ڈاکٹر سے پوچھ لو جا کر پہلے..... ورنہ بعد میں۔“

”نہ اپ..... بہت زیادہ دلچسپی ظاہر کرنے کی کوشش مت کرو۔“  
 ”تیوں..... ہو..... ہوپ۔“ قاسم نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔ کیونکہ وہ قریب آ پہنچی تھیں۔  
 ”ارے..... یہ تم ہو۔“ کلارا قاسم کو دیکھ کر ہنس پڑی کیونکہ ۱۰۰ اس وقت جنگلیوں کے  
 ارے لباس میں تھا۔

”م..... میں..... دراصل.....!“ قاسم ہکا کر رہ گیا۔  
 ”فلم کا نام کیا ہوگا.....؟“ قاسم نے حمید سے پوچھا۔

”یہ تم ملتے اگر.....!“ حمید بولا۔  
 ”تو پھر شروع کرا یہ شوٹنگ۔“

”بڑی مصیبت ہے۔ دیکھئے اس وقت ہم شوٹنگ کر بھی سکتے ہیں یا نہیں۔“  
 ”کیوں.....؟“

”بار بار بادل آ جاتے ہیں۔ رفلکٹرز سے بھی کام نہیں چل رہا۔“  
 ”تو اس طرح تو بڑا نقصان ہوتا ہوگا۔“

”جی ہاں..... لیکن فلم دیکھنے والوں کو ان دشواریوں سے کیا سروکار، وہ تو ڈھائی گھنٹے  
 پوری فلم دیکھ کر گالیاں دیتے ہوئے ہال سے رخصت ہو جاتے ہیں۔“  
 ”گالیاں کھانے کا کام ہی کیوں کرتے ہیں۔“ نیا بولی۔

”صاحب! اپنے یہاں کے فلم بین حضرات اب تک میری سمجھ میں نہیں آ سکے۔ فارمولا  
 بناؤ تو گالیاں کھاؤ اور نہ بناؤ تو اس سے زیادہ گالیاں کھاؤ۔ ہیر و ہیر وکن کی شادی کرا دینے  
 بڑے بیٹھے رہتے ہیں۔ پوچھو بھائی اگر شادی ہو گئی تو تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا اور نہ ہوئی تو تم پر  
 ہنس پھینکا برتنے لگی۔“

”سوال یہ ہے کہ آپ فلم ہی کیوں بنانے بیٹھے ہیں۔ کوئی اور کاروبار دیکھئے۔“  
 ”ہاں یہ سوال لاکھ کا ہے۔ لیکن ہیرا پھیری بھی آدمی کی فطرت میں شامل ہے۔ غالباً  
 یہ نتیجہ ہی ہوں گی میرا باپ فلم نہیں بناتا تھا اس کے باوجود بھی خاصا تندرست رہتا تھا۔“  
 ”دیکھا کرتے تھے۔“ کلارا نے مضحکہ انداز میں سوال کیا۔  
 ”مجھے پیدا کرنے کے علاوہ انہوں نے اور کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔“

”واقعی آپ لوگ فلمی روایات سے بیٹے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں۔“ نیا نے کہا۔  
 ”تو آپ سہ پہر کو آ رہی ہیں؟“  
 ”ضرور آؤں گی۔“

”مجھے بھی لانا..... ڈائری تمہاری بات نہیں مالتے۔“ کلارا گھگھکی۔  
 اُن کے چلے جانے کے بعد حمید بقیہ لوگوں سے کٹ کر اس گاڑی میں آ بیٹھا۔  
 لاسکی ٹیلیفون موجود تھا۔

”ہیلو.....!“ اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”چینل سکس پلینز..... تھینکس۔“  
 پھر کسی قدر توقف کے ساتھ بولا۔ ”ہیلو..... ہارڈ اسٹون۔“

”ہارڈ اسٹون.....!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”یور آئیڈنٹی.....؟“  
 ”زیو..... کام بن گیا۔“ حمید بولا۔ ”لومڑی کے نام پر وہ بوکھلا گیا تھا اور۔“  
 ”گڈ..... اور کچھ۔“

”لومڑی دیکھنے کے لئے اس کی دولڑکیاں ہمارے خیموں میں آئی تھیں۔“  
 ”بس آنکھیں کھلی رکھو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔  
 ”سانپوں کی وجہ سے ساتھی پریشان ہیں۔“

”فکر نہ کرو..... میں جلد ہی پہنچوں گا..... اُور اینڈ آل۔“  
 دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سن کر حمید نے ریسپورڈیش بورڈ  
 خانے میں رکھ دیا۔



شوٹنگ شروع ہونے سے قبل ہی وہ دونوں وہاں پہنچ گئی تھیں۔  
 ”اے.....!“ قاسم حمید کا شانہ دباتا ہوا بولا۔ ”دوسری والی بھی آئی ہے۔“

”کیا مطلب.....“

”جاگیردار تھے۔“ حمید شرما کر بولا۔

”آپ بھی دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“

”جی ہاں..... جی ہاں..... بہت دلچسپ۔“ قاسم نے استغناء انداز میں تائید کی۔

”میں دراصل لومڑی والا منظر دیکھنا چاہتی تھی۔“ نینا حمید کو بغور دیکھتی ہوئی بولی۔

”میں سمجھ گیا آپ کا مطلب..... یعنی ہم کس طرح اسے کیمرے کی گرفت میں

گئے۔“

”جی ہاں..... میں یہی دیکھنا چاہتی ہوں۔“ نینا ہنس کر بولی۔ ”وہ تو بیٹھ رہے۔“

ہوتے ہی کسی طرف بھی بھاگ سکتی ہے۔ کوئی تربیت یافتہ کتا تو ہے نہیں کہ آپ کے

پر چلے گا۔“

”دیکھئے گا آپ..... کس طرح میرے اشاروں پر چلتی ہے۔“

”تو پھر شروع کیجئے نا۔“ کلارا اٹھلائی۔

”اس روشنی میں آپ شوٹنگ تو نہ دیکھ سکیں گی البتہ ریہرسل۔“

”چلئے..... ریہرسل ہی سہی۔ لیکن لومڑی والا سین۔“ نینا نے کہا۔

”ریہرسل میں تو وہ نکل جائے گی ہاتھ سے۔“

نینا ہنس پڑی اور ٹھیک اسی وقت خیموں کے پیچھے سے کسی لمبے چہنچے کی آواز آئی۔

بیک وقت کئی آدمی چہنچے۔ ”سانپ..... سانپ..... ڈس لیا۔“

حمید اچھل کر آوازوں کی طرف جھپٹا۔ پھر سبھی اسی جانب دوڑے۔ چلے گئے تھے۔

کا ایک آدمی دونوں ہاتھوں سے اپنی پنڈلی پکڑے بیٹھائیں۔ طرح طرح جیج رہا تھا۔

”پیچھے ہٹو..... پیچھے ہٹو..... اس کے قریب بھیڑ نہ لگاؤ۔“ نینا لوگوں کو دونوں ہاتھوں

دھکیلتی ہوئی آگے بڑھی اور مارگزیدہ کے قریب پہنچ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

”ہاتھ ہٹاؤ..... مجھے زخم دیکھنے دو۔“ اس نے اس سے کہا اور پنڈلی سے اس کے

ہٹانے لگی۔

زخم دیکھ کر اس نے طویل سانس لی اور پھر حمید کی طرف مڑ کر بولی۔ ”اسے جلد“

لیبارٹری کی طرف لے چلے۔“

دو چلے گئے اور کلارا جیب پر جگہ نہ ہونے کی بناء پر وہیں رہ گئی۔ ویسے قاسم نے اسے

نی گازی پر لے جانے کی پیش کش کی تھی۔

”کچھ دیر باہر رہنا چاہتی ہوں۔ اس عمارت میں دم گھٹنے لگا ہے۔“ کلارا نے کہا اور

جلدی سے بول پڑا۔ ”بلقل..... بلقل..... آپ شہر میں ہوتیں تو خوب سیرسپاٹے قراتا۔“

”آپ مجھے اتنے بھولے اور پیارے لگتے ہیں کہ کیا بتاؤں۔“

”ارے میں کیا..... سی سی سی ہی..... بلقل بے وقوف ہوں۔“

”اسی لئے تو اتنے پیارے ہیں۔ عقلمند مرد مجھے بالکل گدھے لگتے ہیں۔“

”ہوتے ہی ہیں سالے گدھے۔ یہ بھی کوئی عقلمندی ہوئی کہ عورتوں کو اچھے نہیں لگتے۔“

”میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟“

”بس قیاتاؤں..... یہی جی چاہتا ہے کہ دیکھتا رہوں۔ دن میں بھی اور رات میں بھی۔“

”رات میں کیسے دیکھ سکیں گے۔“ کلارا مایوسی سے بولی۔ ”میں کونسی میں ہوگی اور آپ یہاں۔“

”ڈاکٹر آپ کا تون ہے؟“

”مالک..... میں اس کی ملازمہ ہوں۔“

”لاہول دلا کوٹ..... یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ نہیں آپ اس کی مالک ہیں۔“

”یقین کیجئے..... ڈھائی سو روپے ماہوار پر ملازم ہوں۔“

”لغت ہے مجھ پر۔“ قاسم غصیلے لہجے میں بولا۔

”ارے آپ اپنے اوپر کیوں لغت بھیج رہے ہیں۔“

”قیوں نہ سمجھوں۔ آپ نوکری قریں اور میں آلو کا پٹھا دیکھتا رہوں..... چلئے میرے

ہاتھ..... شہر چلئے۔“

”ڈاکٹر مجھے گولی مار دے گا..... جلاد ہے۔“

”ایسی کی تیس کر کے رکھ دوں گا۔ آپ قیا سمجھتی ہیں مجھے۔“

”نہہ دیر بعد نینا واپس آ گئی۔ مارگزیدہ کو تجربہ گاہ میں چھوڑ آئی تھی۔ حمید نے ایک بار

”شاکر یہ ادا کیا اور وہ کلارا کو جیب میں بٹھا کر واپس چلی گئی۔“



”کیوں.....؟“ ڈاکٹر چنگیزی اُسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

”میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے میرے آدمی کے ساتھ اتنا بُرا برتاؤ کیوں کیا

اُسے کیا ہو گیا ہے۔“ سیٹھ اکرام کا لہجہ بھی اچھا نہیں تھا۔

”سوال تو یہ ہے کہ وہ آیا ہی کیوں تھا؟“

”میں نے بھیجا تھا تا کہ تمہیں ایک خطرے سے آگاہ کر دیا جائے۔“

”کیسا خطرہ؟ شاید تمہارا دماغ چل گیا ہے۔“

”تمہارے ڈرموں کی سپلائی کے سلسلے میں فریدی چھان بین کر رہا ہے۔“

”کرنے دو۔ کیا میں کوئی غیر قانونی کام کر رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مجھے

میرے کام کے سلسلے میں حکومت سے امداد ملتی ہے۔ میں سرکاری تجربہ گاہوں کے لئے

مافیوں کا زہر اکٹھا کرتا ہوں۔ کیا سمجھے۔ اصل میں غلطی میری ہی ہے کہ تم جیسے لوگوں سے

کاروباری تعلق رکھتا ہوں۔“

”کیا مطلب.....؟“ سیٹھ اکرام کی بھنویں تن کیں۔

”تم شاید اپنی ہی طرح مجھے بھی کوئی اسمگلر سمجھتے ہو۔ اسی لئے خیر خواہی جتانے دوڑے

آئے ہو۔ اے الحق سیٹھ۔ اگر میں اپنے ڈرموں کو ایک ویران جگہ پر ڈلوادیتا ہوں تو اس کا یہ

مطلب نہیں کہ اُن ڈرموں میں کوئی چیز بھر کر سرحد پار بھجوائی جاتی ہے۔“

”مم..... میں تو یہی سمجھتا تھا۔“

”بس جاؤ..... اب میں تم سے اپنا کاروباری تعلق ختم کرتا ہوں۔ مجھے علم نہیں تھا کہ تمہارا

ادارہ پولیس کی بلیک لسٹ پر ہے۔“

”جہنم میں جائے سب کچھ۔“ سیٹھ اکرام بھی گرم ہوتا ہوا بولا۔ ”تم نے میرے آدمی

پاتاقہ الزام کیوں لگایا۔ کہاں ہے وہ لڑکی بلاؤ اُسے۔“

”بہت خوب! اس کے بعد بھی وہ اس چھت کے نیچے رہ سکتی تھی۔“

”کیا مطلب.....؟“

”اُمی دن اُسے بھی نکال باہر کیا تھا۔ میں نہیں جانتا کہ اب وہ کہاں ہوگی۔“

”میرا آدمی قریب المرگ ہے۔“

اس شب کو ڈاکٹر چنگیزی سنگ روم میں نیا سے اُلجھ رہا تھا۔ نیا بہت زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے دونوں میں کسی بات پر شدید ترین اختلاف ہو گیا، اسی وقت ایک ملازم کمرے میں داخل ہو کر بولا۔ ”اطلاعی سیٹی ہے جناب۔“

”اوہ..... اس وقت کون ہے؟“ ڈاکٹر پیر پیچ کر دھاڑا۔

”تم دیکھو! کون ہے۔“ نیانے ڈاکٹر کو گھورتے ہوئے ملازم سے کہا۔ ملازم چلا

”تم حد سے زیادہ بدحواس ہوتے جا رہے ہو ڈاکٹر۔“ نیانے سخت لہجے میں کہا۔

”بکواس مت کرو..... تم مجھ سے زیادہ نہیں جانتیں۔“

”میں پھر کہتی ہوں کہ اس فلم والے کو جوں کا توں نکل جانے دو۔“

”کوئی دلیل.....؟“

”بس یونہی! ہر مارگزیدہ کے ساتھ یکساں ٹریسٹ مناسب نہیں۔“

”اس سے پہلے تو کبھی تم نے اس قسم کا مشورہ نہیں دیا۔“

”اب دے رہی ہوں۔“ وہ اُسے گھورتی ہوئی بولی۔ ”اور اسکی کوئی خاص وجہ نہیں۔“

”نہیں..... اس کی وجہ وہ کھنڈر فلم ڈائریکٹر معلوم ہوتا ہے۔“

”اگر تم نے اس قسم کا کوئی بیہودہ الزام مجھ پر لگایا تو.....!“

وہ جملہ پورا نہیں کر پائی تھی کہ ملازم کمرے میں داخل ہوا۔

”کون ہے.....؟“ ڈاکٹر نے کھا جانے والے انداز میں پوچھا۔

”کوئی سیٹھ اکرام ہیں۔ فوراً ملنا چاہتے ہیں۔“

”اوہ..... یہ مردود پاگل ہو گیا ہے۔ جاؤ بلاؤ۔“ ڈاکٹر غرایا اور ملازم کے چلے

پر نیا سے بولا۔ ”تم اندر جاؤ۔“

نیانے خونخوار نظروں سے گھورتی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد سیٹھ اکرام ملازم کے ساتھ وہاں پہنچا تھا۔



”میں تو سمجھا تھا کہ اب تک مرچکا ہوگا۔“ ڈاکٹر نے لاپرواہی سے کہا۔

”وہ قسمیں کھاتا ہے۔“

”تو پھر کیا ہوا ہے اُسے؟“

”ڈاکٹر کہتے ہیں کہ خون حیرت انگیز طور پر ضائع ہوا ہے۔“

”تو پھر وہی لڑکی اس کا خون بھی پی گئی ہوگی۔ سیٹھ اکرام اب تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔“

”ورنہ کیا ہوگا.....؟“

”میں تمہیں اٹھوا کر باہر پھینکوا دوں گا۔“

”اچھی بات ہے..... ڈاکٹر میں تمہیں دیکھ لوں گا۔ جارہا ہوں۔“

”غصے میں یونہی نکلے نہ چلے جانا۔“ ڈاکٹر چنگیزی نے مضحکہ اڑانے والے انداز میں کہا۔

”ورنہ ڈسے جاؤ گے۔ کسی ملازم کے ساتھ کپاؤنڈ پار کرنا۔“

سیٹھ اکرام کمرے سے نکل گیا۔ ڈاکٹر چنگیزی کے ہونٹوں پر استہزائی سی مسکراہٹ تھی۔

اکرام کے جاتے ہی نیما اس طرح کمرے میں داخل ہوئی تھی جیسے قریب ہی کھینچا

ہوئی اُن کی گفتگو سُنتی رہی ہو۔

”میں نہیں سمجھ سکتی کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“ وہ ڈاکٹر کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولا۔

”اپنے کام سے کام نہ کھو۔“ ڈاکٹر غرایا۔

”اچھی بات ہے..... میں جارہی ہوں۔“

”کہاں.....؟“ ڈاکٹر چونک پڑا۔

”کہیں بھی جاؤں..... لیکن اب تم سے کوئی تعلق نہ رکھوں گی۔“

”اُوہ..... سمجھنے کی کوشش کرو نیما۔“ ڈاکٹر بے بسی سے بولا۔

”سیٹھ اکرام سے تمہارا برتاؤ نامناسب تھا۔“

”اچھا..... تو پھر کیا میں اس کی پوجا کرتا۔“

”نہیں..... کسی دوسری طرح اُسے مطمئن کر کے یہاں سے رخصت کرتے۔“

”تم نہیں سمجھ سکتیں۔ اگر میں ذرا بھی ڈھیلا پڑتا تو وہ میرے سر پر سوار ہو جاتا۔“

اس سے ہمارا تعلق ہی کیا۔“

نیما کچھ نہ بولی۔ وہ کسی سوچ میں پڑ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ ”یہ بات اچھی

حذہن نشین کر لو کہ کرنل فریدی چونک پڑا ہے۔“

”اُوہ..... اُسے بھی دیکھوں گا..... تم فکر نہ کرو۔“

”قلم والے کے بارے میں کیا سوچا.....؟“

”اگر تم اس پر رضا مند نہیں ہو تو وہ صبح کو یہاں سے صحیح و سلامت رخصت ہو جائے گا۔“

باپ زہریلا نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کسی اجگر کے بچے نے کاٹا ہو۔“

”شکریہ..... میں یہی چاہتی ہوں، جب تک فریدی کا خطرہ ٹل نہ جائے ہمیں بہت محتاط

ہونا چاہئے۔ میں یہی معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ یہ قلم والے کہیں پولیس سے تو

تعلق نہیں ہیں۔“

ڈاکٹر اُسے چند لمحے خاموشی سے دیکھتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ بعض

وقات تم کارآمد ثابت ہوتی ہو۔“

”بعض اوقات نہیں ہمیشہ۔“ وہ ڈاکٹر کو گھورتی ہوئی بولی۔ ”لومڑی کے ذکر پر بھی تم

تھکا نہیں ہو سکتے تھے۔“

”اُوہ..... اس کا کیا ہوگا.....؟“ ڈاکٹر کے لہجے میں اضطراب کی آمیزش تھی۔

”یہی تو دیکھنا ہے۔ محض اسی کی بناء پر مجھے شبہ ہے کہ وہ قلم والے نہیں ہیں۔“ نیما نے

بے نظر لہجے میں کہا۔ ”بہر حال اُن کی پوری طرح نگرانی ہو رہی ہے۔“

”لومڑی وہاں سے غائب بھی کرائی جاسکتی ہے۔“ ڈاکٹر بولا۔

”یہ کام مشکل نہیں ہے، لیکن فی الحال صبر کرو۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہی پانچویں لومڑی

ہے جو واپس نہیں آئی تھی۔“

”کیا مطلب.....؟“ ڈاکٹر بوکھلائے ہوئے انداز میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”پانچویں لومڑی۔“ نیا سخت لہجے میں بولی۔ ”کیا تم خوفزدہ ہو۔“

”نکواس مت کرو۔“ یک بیک ڈاکٹر خود پر قابو پاتا ہوا غرایا۔ ”مجھے اس کی پرواہ نہیں

ہے کہ وہ پانچویں لومڑی ہے۔ جو بھی میرے راستے میں آیا مارا جائے گا۔“



”پھر آپ کون ہیں؟“

اس سوال پر قاسم پھر چونکا اور بوکھلائے ہوئے انداز میں ہنس کر بولا۔ ”میں..... میں.....“

”یعنی قاسم قراقرم.....!“

”لیکن ابھی تو آپ نے.....!“

”وہ..... وہ..... بس یونہی..... وہ تو میں سب اس لئے کہتا رہا ہوں کہ آپ صرف میری

بات کریں..... وہ سالہا ہیرو..... بہت زیادہ خوبصورت تو نہیں ہے۔“

”ہائے..... آپ..... تو بس۔“

”ہاں..... ہاں..... قہو قہو.....!“

”آپ تو میری زندگی کے گھنٹہ گھر ہیں۔“

”مذاق اڑا رہی ہو میرا۔“

”ارے نہیں۔ کسی موٹے آدمی کو آج تک میں نے اتنا خوبصورت نہیں پایا جتنے آپ ہیں۔“

”شکریہ۔“ قاسم گلوگیر آواز میں بولا۔ ”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“

کلارا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ واقعی قاسم کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ ساتھ ہی شاید ذہنی

رو بھی بجکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں موٹے موٹے قطرے گالوں پر ڈھلکنے لگے۔

”ارے..... ارے..... یہ کیا ہو رہا ہے۔“ کلارا بوکھلا گئی۔

”بس اب..... مم..... میرے خدا..... میں قیاقروں۔“

”کچھ بولنے نا..... یہ کیا ہو گیا آپ کو۔“

”آج آپ محبت قی باتیں کر رہی ہیں۔ کل میں بلقل اکیلا رہ جاؤں گا۔ مجھے قوی

نہیں لگتا۔“

کلارا کھڑی متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکاتی رہی۔

”مم..... مجھے..... اب مر جانا چاہئے۔“ قاسم نے پھر غوغوں غوغوں کی۔

”ارے..... یہ کیسی مایوسی کی باتیں کر رہے ہیں۔“

”میں یہاں سے واپس نہیں جانا چاہتا۔ قوی سانپ ہی ڈس لے تو اچھا ہے۔“

”آخر آپ کو کیا ہو گیا ہے۔“

حمید نے ہیرو کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ بڑا قد آور اور بھلا جوان تھا۔ جس دن سرخ رنگ کی ایک اسپورٹ کار میں وہاں پہنچا..... نیما اور کلارا ابھی موجود تھیں۔ حمید آگے بڑھ کر اسے غور سے دیکھا تھا۔

”گھوڑا ٹرک پر آ رہا ہے۔“ ہیرو نے گاڑی سے اترتے ہوئے اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔“

کلارا اور نیما دونوں ہی اسے گھورے جارہی تھیں۔ قاسم کبھی ہیرو کی طرف دیکھتا اور

کلارا کو دیکھنے لگتا۔ حمید ہیرو کو ساتھ لئے ہوئے ایک خیمے کی طرف بڑھ گیا۔ قاسم اتنی دیر

اپنی موجودہ حیثیت کو قطعی فراموش کر بیٹھا اور جھینپے ہوئے انداز میں کلارا سے بولا۔ ”ہاں

چلکد معلوم ہوتا ہے سالہا.....!“

”کون.....؟“ کلارا چونک پڑی۔

”ہو غا قوی۔“ قاسم نے لا پرواہی سے کہا۔

”آپ نہیں جانتے۔“ نیما نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”میں نے قوی جاننے کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔“

”میرے خیال میں شاید یہی ہیرو ہے۔“ کلارا بولی۔

”ہونہہ..... ایسے ہوتے ہیں ہیرو۔ سالے کی نہ ناک نہ نقشہ۔“

”اُوہ..... تو آپ نہیں جانتے؟“

”ارے میں قوی گرا پڑا ہوں کہ ایسوں ویسوں تو جانتا پھروں۔“

نیما نے قاسم کی نظر بچا کر کلارا کو آنکھ ماری اور خود وہاں سے ہٹ کر یونٹ کے ”مر

لوگوں کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

”بڑے تعجب کی بات ہے قراقرم والا صاحب.....!“ کلارا بولی۔

”قون سالہا ہے قراقرم والا۔“

کی طرف بڑھ گیا۔

”پھر اب کیا کرو گے؟“ نینا نے حمید سے پوچھا۔

”پر واہ نہیں۔ یہ بھی نیا ہی چہرہ تھا۔ میں کسی کو بھی ہیرو بنا سکتا ہوں۔ میری یہ فلم کاسٹ

پہنیں کہانی کے بل بوتے پر چلے گی۔ سب جائیں جہنم میں۔“

بہشتا ہیرو کی گاڑی کی طرف سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی اور وہ چونک کر اس کی

طرف توجہ ہو گئے۔ ہیرو زمین پر پڑا چیخ رہا تھا۔ ”سانپ..... سانپ کاٹ گیا۔“

ایک بڑا سا سانپ سرسرا تا ہوا دوسری طرف کی جھازیوں میں غائب ہو گیا۔

”خدا کی پناہ..... کو برا۔“ نینا کہتی ہوئی ہیرو کی طرف جھپٹی۔

ہیرو نے سینڈل پہن رکھے تھے۔ سانپ نے داہنے پیر کے انگوٹھے پر منہ مارا تھا۔

”رسی لاؤ۔ جلدی سے کوئی رسی لاؤ۔“ نینا دونوں ہاتھوں سے اس کی پنڈلی دباتی ہوئی

پہنچتی تھی۔

اس وقت پچھلے دن سے زیادہ سنسنی پھیل گئی تھی۔ کسی نے موٹی سی ڈور نینا کے ہاتھ میں

بکڑادی اور وہ اسے مارگزیدہ ہیرو کی پنڈلی پر سختی سے لپٹنے لگی۔

کچھ لوگ بڑے بڑے پتھر لئے جھازیوں میں سانپ کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ نینا

حمید کو مخاطب کر کے بولی۔ ”اے جلد از جلد تجربہ گاہ تک پہنچانے کی کوشش کرو۔“

حمید پر بھی بوکھا ہٹ سی طاری ہو گئی تھی۔ اس طرح چاروں طرف بھاگتا پھر رہا تھا جیسے

جو سمجھ ہی میں نہ آیا ہو کہ اب کیا کرنا چاہئے۔

مارگزیدہ کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ بدقت تمام اُسے نینا کی جیب پر بٹھایا

گیا۔ حمید اسکے ساتھ بیٹھا اور جیب تجربہ گاہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ کلارا قاسم کیساتھ وہیں کھڑی

تھی۔ فلم یونٹ کے دوسرے لوگ بہ آواز بلند کہہ رہے تھے کہ اب وہ وہاں نہیں رکیں گے۔

”میں بھی نہیں چاہتی کہ رات آپ یہاں بسر کریں۔“ کلارا نے قاسم سے کہا۔

”پھر کہاں کروں؟“

”اگر آپ کو بھی سانپ ڈس لے تو میں آپ کو اپنے ساتھ لے جا سکوں گی۔“

”یعنی..... یعنی.....!“ قاسم ہلکایا۔

”آپ فچھ نہ پوچھیے..... ورنہ زور زور سے رونے لگوں گا۔“ قاسم کی آواز کسی قدر ہونگی اور کلارا نے غالباً اس لئے چاروں طرف دیکھا تھا کہ کہیں کوئی ان کی طرف نہیں۔ پھر چپ چاپ قاسم کے پاس سے کھسک کر نینا کے قریب جا پہنچی تھی۔

اتنے میں حمید اور ہیرو ایک دوسرے پر گر جتے برستے ہوئے خیمے سے باہر نکلے۔

”ٹھیک ہے۔“ حمید دباڑ رہا تھا۔ ”آپ نہیں کرنا چاہتے تو تشریف لے جایئے

ہمارے کانٹریکٹ میں ایسی کوئی شق نہیں تھی کہ آپ کا کام کوئی ڈپلیکیٹ بھی کرے گا۔“

”معاہدوں میں یہ باتیں نہیں ہوا کرتیں۔“ ہیرو بھی چلایا۔ ”کبھی اور بھی فلم بنائی تھی؟

”ہکو اس بند کرو۔“ حمید اُسے گھونہ دکھا کر چیخا۔ ”کیا میں نے تمہاری خوشامد کی تھی؟

میرے لئے کام کرو۔ تم خود ہی چکر لگاتے رہے تھے۔“

”گھوڑے پر ڈپلیکیٹ بیٹھے گا۔“

”ہرگز نہیں..... مجھ سے متفق نہیں ہو تو چلتے پھرتے نظر آؤ۔“

”اچھی بات ہے۔ میں تمہیں دیکھوں گا۔“ ہیرو اپنی اسپورٹ کار کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

”چپ چاپ چلے جاؤ، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔“ حمید جاے سے باہر ہوتا ہوا چیخا۔

وہ پھر پلٹ پڑا۔

”آخر بات کیا ہے؟“ نینا حمید کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”دوڑتے ہوئے گھوڑے پر خود نہیں بیٹھیں گے کوئی اور بیٹھے اور کھڑے ہوئے گھوڑے

پر ان کا کلوڑ اپ لیا جائے۔ اب میں اس وقت کہاں سے لاؤں ڈپلیکیٹ..... پہلے ہی کہہ!

ہوتا۔“

”تو اس میں اتنا گرم ہونے کی کیا بات ہے۔“ ہیرو ان کے قریب پہنچ کر بولا۔

”مفت میں وقت اور پیسہ ضائع کراتے ہو تم لوگ۔“ حمید غرایا۔ ”نہیں صاحب! اب

میں دوسرا ہی انتظام کروں گا۔ آپ تشریف لے جایئے۔“

”میں سوٹ فائیل کر دوں گا تمہارے خلاف۔“

”ضرور کرو۔“ اور اب چلے جاؤ۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ بات بہت زیادہ بڑھ جائے۔“

”اچھا..... اچھا..... میں دیکھوں گا۔“ ہیرو نے دانت پیستے ہوئے کہا اور پھر اپنی گاڑی

”خدا خواستہ آپ کو سانپ ڈسے۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ ڈسے جانے کی ایک ننگی۔“  
 اور یہاں سے نکل چلے۔“  
 ”اوہ..... یہ بات ہے..... اچھا..... اچھا۔“  
 ”آپ کی ماہانہ آمدنی اندازاً کتنی ہوگی؟“  
 ”کچھ پتا نہیں.....!“ قاسم کی ذہنی رو پھر بہکنے لگی۔  
 ”بڑی عجیب بات ہے۔ آپ کو اپنی ماہانہ آمدنی کا علم نہیں جبکہ شاید آپ بھی پتا  
 بار اس فلم میں آ رہے ہیں۔“  
 ”ارے تو قیا میری توئی فلم کی کمائی ہے۔“  
 ”تو پھر.....!“



ڈاکٹر چنگیزی کی تجربہ گاہ میں اس وقت حمید بھی موجود تھا۔ ہیرد پر غشی طاری ہو گئی تھی  
 اور ڈاکٹر چنگیزی اس انگوٹھے کو دیکھ رہا تھا جس پر سانپ کے دانتوں کے نشان تھے۔  
 دفعتاً ڈاکٹر نیما کی طرف مڑ کر بولا۔ ”تم انہیں سنگ روم میں بٹھا کر یہاں واپس آؤ۔“  
 ”چلے۔“ نیما نے حمید سے کہا اور حمید زیر لب کچھ بڑبڑاتا ہوا دروازے کی طرف مڑ گیا۔ نیما  
 اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر ڈاکٹر کے پاس واپس آ گئی۔ ڈاکٹر نے اسے دوسرے کمرے میں  
 پٹنے کا اشارہ کیا تھا۔ نیما خاموشی سے بائیں جانب مڑ گئی۔ ڈاکٹر نے دوسرے کمرے میں پہنچ کر  
 آہستگی سے دروازہ بند کیا۔ نیما ہمہ تن گوش سوالیہ نشان بنی ڈاکٹر کو دیکھنے جا رہی تھی۔  
 ”تم نے خود دیکھا تھا کو برا.....؟“  
 ”ہاں..... میں نے خود دیکھا تھا..... کو برا ہی تھا۔“  
 ”تمن سال سے ان اطراف میں جھک مار رہا ہوں۔ لیکن مجھے کہیں کو برا دکھائی نہیں دیا۔“  
 ”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ نیما اسے غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔  
 ”کو برا وہ اپنے ساتھ لایا تھا لہذا تمہیں یہ سن کر بھی حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ وہ کو برا  
 لایا نہیں تھا اور اس شخص کی بیہوشی محض ڈھونگ ہے۔“

”خدا خواستہ آپ کو سانپ ڈسے۔ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ ڈسے جانے کی ایک ننگی۔“  
 اور یہاں سے نکل چلے۔“  
 ”اوہ..... یہ بات ہے..... اچھا..... اچھا۔“  
 ”آپ کی ماہانہ آمدنی اندازاً کتنی ہوگی؟“  
 ”کچھ پتا نہیں.....!“ قاسم کی ذہنی رو پھر بہکنے لگی۔  
 ”بڑی عجیب بات ہے۔ آپ کو اپنی ماہانہ آمدنی کا علم نہیں جبکہ شاید آپ بھی پتا  
 بار اس فلم میں آ رہے ہیں۔“  
 ”ارے تو قیا میری توئی فلم کی کمائی ہے۔“  
 ”تو پھر.....!“

”فلم تو شوق کی چیز ہے۔ میرے تو بہت بڑے بڑے کارخانے اور مل ہیں۔“

”بیوقوف بنا رہے ہیں۔“ وہ ہنس پڑی۔

”نہیں الا قسم..... عاصم ملٹی انڈسٹریز کا نام تو سنا ہی ہوگا آپ نے۔“

”کیوں نہیں..... کیوں نہیں۔“

”عاصم صاحب میرے والد صاحب ہیں۔“

”اوہ..... شادی ہو چکی ہے..... آپ کی؟“

”تھوڑی سی ہوئی ہے۔ جھوٹ قیوں بولوں۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ..... ہی ہی ہی ہی..... قیا بتاؤں۔“

”خیر..... خیر..... کوئی بات نہیں۔ اب آپ جلدی سے ڈسے جانے کی اداکاری کرنا“

کردیتجئے۔ یہاں آپ کو نہیں رہنے دوں گی۔“

”مم..... مم..... سانپ۔“

”اچھا..... اچھا..... آپ سے نہیں بنے گا۔“ کلارا کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ ”میں خود“

کوئی تدبیر کروں گی۔“

”جی ہاں..... یہی ٹھیک ہے۔ آپ ہی قوی تدبیر قردیتجئے اور میں تو قہتا ہوں کہ“

”تت..... تو پھر.....!“

”تمہارا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ یہ پولیس والوں ہی کی بھیڑ ہے۔ فلم یونٹ نہیں۔“

”دیکھا.....!“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”میرے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے، اسی نے کہا تھا کہ اُسے جوں کا توں واپس کر دو۔“

”اب اس کا کیا حشر کیا جائے؟“

”اس کا حشر بھی کروں گی۔“ نیا جھنجھلا کر بولی۔

”کیا مطلب.....؟“

”تھری سیون کا انجکشن دے کر وہیں چھوڑ آؤں گی۔“

”اور وہ ان پر پتھر اور شروع کر دے گا۔ نہیں یہ مناسب نہیں۔“

”کیوں.....؟“

”میرا خیال ہے کہ اس فلم ڈائریکٹر کو یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی جائے کہ

کوئی غیر معمولی کام نہیں ہو رہا اور ہاں کلارا کہاں ہے۔ اس سے کہو کہ موٹے پر سے اٹھا

ہٹالے۔ اس آدمی کو اٹھوا کر وہیں اس کے کمپ میں بھجوا دو۔ کہہ دینا کہ سانپ زہریلا

تھا۔ دہشت سے بیہوش ہو گیا ہے۔“

”نہیں..... اسے بھی رات بھر روکنا چاہئے۔ فوری طور پر یہ کہہ دینا مناسب نہ ہوگا۔“

سانپ زہریلا نہیں تھا۔ اسے رات بھر یہیں رکھ کر اس کی نگرانی کی جائے۔“

”کیوں.....؟“ ڈاکٹر اُسے گھورتا ہوا بولا۔

”اس لئے کہ وہ تم سے زیادہ خوبصورت ہے۔“ نیما نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”یہ کیا بکواس۔“ ڈاکٹر بھنا گیا۔

”اگر ذہن کام نہ کرے تو خاموشی اختیار کیا کرو۔ اگر وہ خود ہی سانپ اپنے منہ

تھا تو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد رہا ہوگا۔“

ڈاکٹر کے چہرے سے ناگواری کے آثار زائل ہو گئے اور وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔

نیا پھر بولی۔ ”مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ اُسے یہاں رات گزارنے کا موقع دیا جائے۔“

اب ہم دیکھیں گے کہ وہ رات کو یہاں کیا کرتا ہے۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔ اگر کرٹل فریدی ادھر متوجہ ہوا ہے تو اسے مایوسی ہی ہونی چاہئے لیکن

وہ لومڑی..... اس کا کیا کیا جائے۔ اگر انہیں اس کو استعمال کرنے کا موقع مل گیا

.....“

”میں آج رات کو اُسے پنجرے ہی میں ختم کر دینے کی کوشش کروں گی۔ اس ڈائریکٹر

کے کمپ پہنچا کر واپس آتی ہوں۔ کلارا وہیں رہ گئی ہے۔“

نیا حمید کو جیب میں بٹھا کر کمپ کی طرف روانہ ہو گئی۔ خلاف معمول وہ بہت خاموش

ہی۔ حمید نے ہیرو کے متعلق استفسار کیا۔

”کوشش کی جائے گی کہ وہ بچ جائے۔ سانپ زہریلا تھا۔ کو برا آپ جانتے ہی ہوں

.....“

”میں بہت زیادہ متفکر ہوں۔ خواہ مخواہ جھگڑا کر بیٹھا تھا۔“

نیا کچھ نہ بولی۔ وہ کمپ میں پہنچ گئے۔ لیکن قاسم اور کلارا کا کہیں پتا نہ تھا۔ لوگوں نے

ایک کہہ اپنا سامان بیوک میں رکھ کر کلارا سمیت کہیں چلا گیا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہیں۔“ نیا حمید کو گھورتی ہوئی بولی۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ لڑکی کو اُس سے بے تکلف نہ ہونے دیا جائے۔“

”پھر بھی..... آخر وہ کہاں گئے۔“

حمید خود الجھن میں پڑ گیا تھا۔ فریدی نے قاسم کو ساتھ لانے کی مخالفت کی تھی۔ لیکن

نیمہ نے ٹھنڈے تفرینا اُسے اس یونٹ میں شامل کر لیا تھا اور اُسے اس پر آمادہ کرنے کے لئے

خانے پاؤں بھی بنیلے تھے۔ لیکن وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ قاسم صرف اپنی ذمہ داری پر کوئی

ایسی حرکت بھی کر بیٹھے گا۔

”سنو.....!“ نیا حمید کو مخاطب کر کے سخت لہجے میں بولی۔ ”اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر

ڈاکٹر واپس نہ آئی تو تم سب بھگتو گے۔“

”کلارا ادھ جیتی جیتی تو نہیں تھی۔“ حمید بھی کسی قدر گرم ہو کر بولا۔ ”جہاں بھی گئی ہوگی

نیمہ رضی سے گئی ہوگی۔ تم نے یہی تو بتایا تھا کہ موٹے آدمی اس کی کمزوری ہیں۔“

”کچھ بھی ہو۔ تم اس یونٹ کے انچارج ہو۔ اگر کلارا واپس نہ آئی تو تم سے پتلا جائے گا۔“

”میں تو تمہیں بھی یہی مشورہ دینے والا تھا کہ سانپوں کے اس جنگل سے کھلو۔ ملک کی مقبول ترین ہیر و رن بنادوں گا۔“

”دماغ تو نہیں چل گیا۔“

”آ خر ڈاکٹر کتنی تنخواہ دیتا ہے۔“

”بے تکلف ہونے کی کوشش مت کرو۔“

”کیا کوشش کے بغیر بھی بے تکلف ہونا ممکن ہے۔“

”شٹ اپ۔“

”میں بہت دکھی ہوں محترمہ نیا۔ اس وقت ہزاروں کا نقصان ہوا ہے۔ لیکن اُمیرے ساتھ چلنے پر رضا مند ہو جائیں تو یہ زخم مندمل بھی ہو سکتا ہے۔“

”میں کہتی ہوں بکواس بند کرو اور کلارا کا پتہ بتاؤ۔“

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک ٹرک خیموں کی اس چھوٹی سی بستی کے قریب آگیا۔ ایک بڑے اجگر کو بھی کچلتا پڑا۔ اسے راہ دینے کے لئے جیب نہیں روکی تھی۔ عمارت کی کپاؤنڈ پر ایک گھوڑا مع ساز و سامان موجود تھا۔ ڈرائیور کے قریب والی گلی نشست سے ایک آدمی بی بیچ کر گاڑی سے اُتر آیا اور دوڑتی ہوئی عمارت میں داخل ہوگئی۔ ڈاکٹر صدر دروازے سے اُترا اور ٹرک کے پیچھے حصے کی رکاوٹ نیچے گرا کر گھوڑے کو اس پر سے اتارنے لگا۔

”اب کیا میں گھوڑے کو اپنے کاندھے پر سوار کراؤں گا۔“ حمید ہاتھ ہلا کر دہاڑا۔

”کیوں؟ کیا ہوا جناب؟“ نووارد نے پوچھا۔

”ہیر و کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ وہ ڈاکٹر چنگیزی کے کلینک میں بیہوش پڑا ہے۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا۔“ وہ گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے ان کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

”دوسری صورت میں بھی بُرا ہی ہوتا کیونکہ اچانک اس نے گھوڑ سواری کے ڈپلیکیٹ کی بات شروع کر دی تھی اور فوری طور پر ڈپلیکیٹ مہیا کرنا دشوار تھا۔“

”دیکھئے جناب! گھوڑا تین گھنٹے سے زیادہ یہاں نہیں روکا جاسکتا کیونکہ آج کا تاریخ میں یہ ملا دو بیازہ کی شونگ کے لئے بھی بک ہے۔“

”لیکن بھائی..... میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہیر و اسٹوری سن چکا تھا اس وقت اس نے نہیں کہا تھا کہ سرپٹ ڈپلیکیٹ سے کرائی جائے۔“

”تو یہ کوئی بڑی بات ہے۔“ نووارد بولا۔ ”سرپٹ کے لئے میں ڈپلیکیٹ بناؤں گا۔“

”کوز اپ بعد میں کر لیجئے گا۔“

”جیب تو کام بن گیا۔ ٹھیک ہے۔“ حمید خوش ہو کر بولا۔ ”تمہیں ایک لومڑی کا تعاقب بنائے گا۔“

”شیر کا تعاقب کرنا ہو تب بھی فکر نہ کیجئے۔“ نووارد نے مسکرا کر کہا۔

”میں جارہی ہوں۔“ نیا بول پڑی۔

”اوہو..... ایسی بھی کیا جلدی۔ کیا آپ نہیں دیکھنا چاہتیں کہ ہم اُس لومڑی کو کس طرح نرول کرتے ہیں۔“

”نہیں.....!“ وہ تیزی سے جیب کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ ”کلارا آدھے گھنٹے میں پہنچی تو دیکھنا اپنا حشر۔“

پھر وہ آندھی اور طوفان کی طرح تجربہ گاہ کی طرف چل پڑی تھی۔ راستے میں اُسے حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک ٹرک خیموں کی اس چھوٹی سی بستی کے قریب آگیا۔ ایک بڑے اجگر کو بھی کچلتا پڑا۔ اسے راہ دینے کے لئے جیب نہیں روکی تھی۔ عمارت کی کپاؤنڈ پر ایک گھوڑا مع ساز و سامان موجود تھا۔ ڈرائیور کے قریب والی گلی نشست سے ایک آدمی بی بیچ کر گاڑی سے اُتر آیا اور دوڑتی ہوئی عمارت میں داخل ہوگئی۔ ڈاکٹر صدر دروازے سے اُترا اور ٹرک کے پیچھے حصے کی رکاوٹ نیچے گرا کر گھوڑے کو اس پر سے اتارنے لگا۔

”اب کیا میں گھوڑے کو اپنے کاندھے پر سوار کراؤں گا۔“ حمید ہاتھ ہلا کر دہاڑا۔

”کیوں؟ کیا ہوا جناب؟“ نووارد نے پوچھا۔

”ہیر و کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ وہ ڈاکٹر چنگیزی کے کلینک میں بیہوش پڑا ہے۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا۔“ وہ گھوڑے کی لگام پکڑے ہوئے ان کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

”دوسری صورت میں بھی بُرا ہی ہوتا کیونکہ اچانک اس نے گھوڑ سواری کے ڈپلیکیٹ کی بات شروع کر دی تھی اور فوری طور پر ڈپلیکیٹ مہیا کرنا دشوار تھا۔“

”دیکھئے جناب! گھوڑا تین گھنٹے سے زیادہ یہاں نہیں روکا جاسکتا کیونکہ آج کا تاریخ میں یہ ملا دو بیازہ کی شونگ کے لئے بھی بک ہے۔“

”لیکن بھائی..... میں کیا کر سکتا ہوں۔ ہیر و اسٹوری سن چکا تھا اس وقت اس نے نہیں کہا تھا کہ سرپٹ ڈپلیکیٹ سے کرائی جائے۔“

”تو یہ کوئی بڑی بات ہے۔“ نووارد بولا۔ ”سرپٹ کے لئے میں ڈپلیکیٹ بناؤں گا۔“

سب نکلے میں تقسیم ہو گئی ہوتیں۔

پھر جیب کا ایک ناز بھی دھماکے سے پھٹ گیا۔

”کور..... کور.....!“ گھوڑا سوار ایک درخت کے تنے کی اوٹ لیتا ہوا چیخا۔

جیب پر بیٹھے ہوئے چار آدمیوں نے بھی بائیں جانب چھلانگ لگائی تھی اور اس کی ن میں دبک گئے تھے۔ لومڑی بے حس و حرکت پڑی تھی اور گھوڑا تڑپ تڑپ کر کر بناک ن میں نکال رہا تھا۔

کئی منٹ گزر گئے۔ وہ اپنے کیمپ سے خاصے فاصلے پر تھے۔ حمید جیب کے پاس سے ن کر مرده لومڑی کے قریب آ کھڑا ہوا۔ لومڑی کے داہنے پہلو پر گولی لگی تھی۔ گھوڑا سوار کا ب کہیں پتا نہ تھا۔ حمید نے اُسے آوازیں بھی دی تھیں لیکن جواب نہ دار۔ گھوڑا ابھی زندہ تھا اس کے سر سے جیتا جیتا خون اُبل رہا تھا۔

حمید کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ کیونکہ ایسے کسی موقع کے لئے کوئی بت فریدی کی طرف سے نہیں ملی تھی۔ وہ دوبارہ جیب کی طرف واپس جا رہا تھا کہ محدود لومڑی نے پنجرے سے نکل کر خیمے کا ایک چکر لگایا اور پھر باہر نکلی چلی گئی۔ کمرہ دار والے جیسی ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔ اُس نے ٹرانسمیٹر نکال کر منہ کے قریب جیب پر بیٹھا تھا اور نو واد ڈپلیکیٹ گھوڑے کی پشت پر نظر آ رہا تھا۔

تے ہوئے کہا۔ ”ہیلو.....!“

دوسری طرف سے فریدی کی آواز آئی۔ ”جہاں ہو وہیں رہو۔“  
”بے آواز فائر ہو رہے ہیں۔ لومڑی ماری گئی۔“ حمید طویل سانس لے کر بولا۔ ”گھوڑا نے دالا ہے اور ڈپلیکیٹ غائب ہو گیا۔“

”فکر نہ کرو..... اب کوئی فائر نہیں ہوگا۔ وہیں ٹھہرو۔“

حمید نے ٹرانسمیٹر جیب میں ڈال لیا۔ اس کیس کے بارے میں اُسے اس کے علاوہ اور کوئی معلوم تھا کہ فریدی ایک پُر اسرار آدمی ڈاکٹر چنگیزی سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ فلم یونٹ کا کھڑاگ اسی لئے پھیلایا گیا تھا۔

اس نے مرده لومڑی کو گھورتے ہوئے سوچا اس کمبخت کا نہ جانے کیا رول تھا اس ناسے میں۔ دفعتاً کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی اور حمید چونک کر سامنے دیکھنے لگا۔ چاند سمت سے ایک اسٹیشن ویگن ان کی طرف بڑھی آ رہی تھی۔ قریب پہنچ کر رکی اور اس پر

”میں تمہیں تنہا نہیں جانے دوں گی۔“

”کیوں.....؟“ ڈاکٹر غرایا۔

”تم چنگیزی ہو..... غصہ آتا ہے تو عقل پناہ مانگ کر تم سے دور جا کھڑی ہوتی ہے۔“  
”خاموش رہو۔“ وہ اُسے دوسری طرف دھکیل کر نکلا چلا گیا۔

نیا چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر اس کمرے کی طرف چل پڑی جہاں فلمی

بڑی سی میز پر بیہوش پڑا تھا۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئی، ہیر و کراہ کر بائیں ہو گیا۔ لیکن اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔



لومڑی نے پنجرے سے نکل کر خیمے کا ایک چکر لگایا اور پھر باہر نکلی چلی گئی۔ کمرہ دار والے جیسی ٹرانسمیٹر پر اشارہ موصول ہوا۔ اُس نے ٹرانسمیٹر نکال کر منہ کے قریب جیب پر بیٹھا تھا اور نو واد ڈپلیکیٹ گھوڑے کی پشت پر نظر آ رہا تھا۔

لومڑی نے خیمے سے نکل کر ایک سمت دوڑنا شروع کیا۔ گھوڑا بھی حرکت میں آیا۔ جیب اس کے پیچھے چل پڑی۔ حمید کمرہ مین کے قریب بیٹھا اُسے بے آواز بلند ہدایات جارہا تھا۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ لومڑی نے وہی راستہ اختیار کیا تھا جوا چنگیزی کی تجربہ گاہ کی طرف جاتا تھا اور اس راستے میں کوئی ایسی رکاوٹ بھی نہیں تھی گھوڑے اور جیب کے لئے دشواریاں پیدا کر سکتی۔

لومڑی کسی پالتو کتے کی سی رفتار سے دوڑتی چلی جا رہی تھی اور اس کے اس ردینے ذرہ برابر بھی وحشت نہیں ظاہر ہوتی تھی۔ نہ اُسے اپنے پیچھے دوڑتے ہوئے گھوڑے کی تھی اور نہ جیب کا شور مچانے والا انجن ہی اس پر کسی طرح اثر انداز ہو سکا تھا۔ اچانک وہ اور راستے کی بائیں جانب جا پڑی۔ اس کے بعد گھوڑا الٹ کھڑا ہوا تھا۔ اگر سوار چھلانگ لگاتا میں ذرا سی دیر بھی لگاتا تو گرتے ہوئے گھوڑے کے نیچے دب کر اس کی بائیں ٹانگ

”کیا مطلب.....؟“  
 ”مطلب واضح ہے۔ اگر مجھے انچارج سمجھتی تو اس کے ساتھ کیوں جاتی۔“  
 ”اس بیہودہ بکواس کا مطلب میں نہیں سمجھ سکا۔“

”تھنڈی کا تقاضا یہ ہے کہ مجھے بطور ریغمال نہ رکھئے ورنہ آپ کو ان محترمہ سے بھی

بچھڑنے پڑیں گے۔“

”نٹ اپ.....!“ اس بار نیا کی آواز سنائی دی۔

”اللہ مالک ہے۔“ حمید نے ٹھنڈی سانس لی۔

عمارت کی کپاؤنڈ میں پہنچ کر اُسے گاڑی سے اتارا گیا اور دونوں اُسے رائفل دکھاتے  
 دے اندر لے چلے۔ حمید سوچ رہا تھا کہ اس کے پاس سے ریوالور بھی برآمد ہوگا اور جیسی  
 رائیفر بھی اور پھر ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر چنگیزی اب تک ان سے متعلق حقیقتا اندھیرے میں نہ

ہو۔ اندر پہنچ کر ڈاکٹر نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”اُسے بھی لے جا کرو ہیں باندھ دو۔“

”باندھ دو کا کیا مطلب؟“ حمید نے ڈاکٹر کو گھورتے ہوئے سخت لہجے میں سوال کیا۔

لیکن وہ کوئی جواب دیئے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ نیا البتہ اب بھی ان کے ساتھ تھی۔

”میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آ رہا۔“ اس نے مسمی صورت بنا کر نیا کو مخاطب کیا۔

وہ اُسے قہر آلود نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ رائفل کی نال سے اسے پھر دھکیلا گیا اور

ایک ایسے دالان میں لایا گیا جہاں مارگزیدہ ہیرد ایک ستون سے بندھا کھڑا تھا۔ نیا نے

”ہرے ستون کی طرف اشارہ کیا۔

”ٹھہرو۔“ حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”اس پچارے کو کیوں باندھ رکھا ہے۔“

”تم سب فراڈ ہو۔“ نیا نے جھنجھلا کر کہا۔

”کیا مطلب.....؟“

”یہ کیوں ہے؟“ نیا ہیرو کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی۔

”ہیرو بننے کے خواب دیکھنے والا ایک بیوقوف نوجوان۔ لیکن میرا دعویٰ ہے کہ زندگی بھر

نہیں بن سکے گا۔ پہلی ہی فلم میں جھگڑا کھڑا کر کے اس حال کو پہنچا۔“

”تم لوگ کھڑے کیا دیکھ رہے ہو۔ باندھ دو۔“ نیا نے دونوں مسلح آدمیوں کو لاکار پھر

سے ڈاکٹر چنگیزی اُترا۔ نیا اسٹیرنگ کے سامنے ہی بیٹھی رہی۔ پچھلی نشست پر وہ بھی  
 بھی موجود تھے۔ ڈاکٹر چنگیزی نے انہیں بھی اُترنے کا اشارہ کیا۔ پھر حمید سے بولا۔  
 ہمارے حوالے کر دو۔ ورنہ انجام بُرا ہوگا۔“

”مم..... میں سمجھا نہیں ڈاکٹر۔“

”کلارا کی واپسی تک تم بطور ریغمال ہمارے پاس رہو گے۔ اگر چوٹیں گھنے

کلارا واپس نہ آئی تو تمہیں پولیس کے حوالے کر دیں گے۔“

ڈاکٹر کے دونوں آدمیوں نے رائفلیں سیدھی کر رکھی تھیں۔ حمید نے نکلیوں سے

دیکھا اور ڈاکٹر سے بولا۔ ”ذرا ادھر دیکھئے۔ میرا تو دیوالہ ہی نکل جائے گا۔ وہ لوزی

پڑی ہے اور ادھر وہ گھوڑا دم توڑ رہا ہے۔“

”تو پھر میں کیا کروں۔“

”کسی نے بے آواز فائر کئے تھے اور یہ دیکھئے ایک گولی جیب کے نائز کو بیکار کر گئی

”گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔“ ڈاکٹر غرایا اور اس کے آدمی نے بڑھ کر رائفل کی نال

کی کمر سے لگادی۔

”آپ دیکھ رہی ہیں۔“ حمید نے نیا کو مخاطب کیا اور اس نے ناگواری سے اپنا منہ پھیرا

”اچھی بات ہے۔“ حمید اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ”موٹے نے ہمیں دشواری میں

دیا ہے۔ تم لوگ اسے تلاش کرنے کی کوشش کرو، ورنہ کم از کم مجھے تو جیل جانا ہی پڑے گا۔

اس کے تینوں ساتھی کچھ نہ بولے۔ وہ چپ چاپ اسٹیشن ونگن میں بیٹھ گیا۔ اُن

دونوں طرف مسلح آدمی بیٹھے تھے۔ نیا نے گاڑی بیک کر کے دوسری طرف موڑی۔

ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ چہرے سے ناگواری مترشح تھی۔

”کیا بکواس کر رہے ہو.....؟“ ڈاکٹر اگلی سیٹ سے غرایا۔

”ان مردوں کی جان کو رو رہا ہوں جو فلمی اداکاروں پر مردہ چھپکلیوں کی

گرتی ہیں۔ آخر اس موٹے قہل قہل میں کیا رکھا تھا۔“

”تم اس یونٹ کے انچارج ہو۔ تم پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔“ ڈاکٹر بولا۔

”کیا فائدہ ایسے انچارج ہونے سے۔ مجھے تو اب وہ موٹا ہی انچارج معلوم ہو رہا ہے۔“



”بی راؤ۔“

”اوہ..... فریدی کہاں ہے؟“

”میرے ساتھ آؤ۔“ وہ دوسری طرف مڑتا ہوا بولا۔ ڈاکٹر چنگیزی کسی پالتو کتے کی

مرح اس کے پیچھے چلنے لگا تھا۔

”تم بھی جاؤ۔“ نیما نے ان کے چلے جانے کے بعد دونوں مسلح آدمیوں سے کہا اور پھر جب وہ بھی چلے گئے تو اس نے انور کو مخاطب کر کے کہا۔ ”تم اپنے اخبار کے لئے کسی سنسنی خیز

کہانی کی توقع پر بہت دور نکل آئے ہو۔“

”بعض بیٹے ایسے ہی خطرناک ہوتے ہیں۔“ انور نے خشک لہجے میں کہا۔

”لیکن یہاں سے تو واپسی ناممکن ہوگی۔“

”ارے کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے کہ مسلسل اسی سے بات کئے جا رہی ہو۔“

”خبردار کوئی اپنی جگہ سے جنبش نہ کرے۔“ حمید نے ڈاکٹر چنگیزی کے دل کا تھپہ ہانک لگائی۔

”نہیں! تمہیں بھی لالہ زار بناؤں گی۔“ وہ اس کی طرف مڑ کر مسکرائی اور پھر ایک بڑا

ڈاکٹر چنگیزی کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ دوسری رائفل انور کے پیروں کے پاس جا پہنچا تو نکالا۔

”پہلے میری رسیاں کاٹنا۔“ حمید چکا۔

”ضرور.....!“ وہ چاقو کھولتی ہوئی سرد لہجے میں بولی۔ ”پہلے تم ہی نوازے جاؤ گے۔“

”لیکن کیا تم مرنے سے پہلے اپنی اصلیت سے آگاہ نہیں کرو گے؟“

”ظہور.....!“ دفعتاً ڈاکٹر کی آواز آئی۔ ”ایک اور بھی ہے۔“

حمید نے دیکھا کہ گھوڑ سوار ڈپلیکیٹ آہستہ آہستہ ان کی طرف چلا آ رہا ہے۔ اُس کے

پشت پر بندھے ہوئے تھے اور بی راؤ کی نامی گن اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر

مسلم آدمیوں نے ڈپلیکیٹ کو تیسرے ستون سے باندھ دیا۔

”اب تم دونوں جاؤ۔“ ڈاکٹر چنگیزی نے اپنے آدمیوں سے کہا۔ ”چھت پر چڑھ کر

”اس طرف نظر رکھو۔“

”چلے گئے اور ڈاکٹر نے ڈپلیکیٹ کی طرف اشارہ کر کے نیما سے کہا۔ ”یہ کرنل فریدی ہے۔“

ڈپلیکیٹ کا سر جھکا ہوا تھا۔ نیما آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچی اور ڈاکٹر کی

حمید سے بولی۔ ”یہ اشارہ کا کرائم رپورٹر انور ہے۔“

”میں نے کب کہا کہ نہیں ہے۔“ حمید ڈھٹائی سے بولا اور خود ہی اُس سڑک قریب جا کھڑا ہوا جس کی طرف نیما نے اشارہ کیا تھا۔

”اس کا مطلب.....؟“

”سوال یہ ہے کہ تمہیں کسی رپورٹر کے اداکار بن جانے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“

نیما کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ڈاکٹر چنگیزی آ گیا۔

”پتا نہیں سب کہاں مر گئے۔“ وہ دھاڑتا ہوا آگے بڑھا اور رائفل والوں میں سے ایک کی رائفل

اس کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ حمید نے اس کی رائفل پر ہاتھ ڈال دیا۔ پھر اسی رائفل

اس کے سر پر پڑا تھا اور دوسرے کے سنبھلنے سے پہلے ہی رائفل اس کے ہاتھ سے بھی نکل

اس کے بائیں پہلو پر حمید کی لات پڑی تھی۔

”خبردار کوئی اپنی جگہ سے جنبش نہ کرے۔“ حمید نے ڈاکٹر چنگیزی کے دل کا تھپہ ہانک لگائی۔

ہوئے کہا۔

ڈاکٹر چنگیزی کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ دوسری رائفل انور کے پیروں کے پاس جا پہنچا تو نکالا۔

تھی۔ اسکے پیر آزاد تھے۔ اُس نے اُسے کچھ اور قریب کھسکا کر دونوں پیروں کے نیچے دبا دیا۔

”اب تم دونوں اٹھو اور اسی ستون سے ڈاکٹر چنگیزی کو باندھ دو۔“ حمید نے سرد لہجے میں کہا۔

نیما ہکا بکھڑی کبھی حمید کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی ڈاکٹر چنگیزی کی طرف۔ دفعتاً

کی پشت سے آواز آئی۔ ”رائفل زمین پر گرادو۔ ورنہ چھلنی ہو کر رہ جاؤ گے۔“ ساتھ ہی

گن کی باڑھ سانے والی دیوار پر پڑی اور اس میں بڑا سا سوراخ ہو گیا۔ حمید نے رائفل

پر ڈال دی۔

”اور اب چپ چاپ ستون کے پاس کھڑے ہو جاؤ۔“

دونوں نہتے آدمیوں نے چھت کر اپنی اپنی رائفلیں اٹھالی تھیں اور پھر دیکھنے ہی دیکھنے

حمید کو بھی ستون سے باندھ دیا گیا۔

”کرنل فریدی..... ادھر بیہوش پڑا ہے۔“ آنے والے نے کہا۔

”لل..... لیکن تم.....!“ ڈاکٹر چنگیزی ہلکایا۔

طرف دیکھ کر بولی۔ ”تو پھر میں پہلے اسی کے پہلو میں چا تو اتاروں۔“

”نہیں۔“ بی راؤ سخت لہجے میں بولا۔ ”میں اس قسم کی تفریح کی اجازت نہیں دوں گا۔ صحت مند ہیں۔ انہیں ایک ایک کر کے آپریشن تھیز میں پہنچاؤ۔ پہلے فریدی ہی کو لے چلو۔ ڈاکٹر چنگیزی نے ڈپلیکیٹ کو دوبارہ ستون سے کھولا اور وہ دونوں اُسے وہاں سے لے گئے۔ نیا پھر ان قیدیوں کے ساتھ تہارہ گئی۔

”یہ بی راؤ کون صاحب ہیں؟“ حمید نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”جن کے چنگیزی صاحب دم ہلاتے پھر رہے ہیں۔“

”تمہیں اس سے کیا سروکار۔ تم اپنی خیر مناؤ۔“ نیا سرد لہجے میں بولی۔ ”ڈاکٹر چنگیزی میرے علاوہ اور کسی سے نہیں ڈرتا۔“

”تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔“

”خاموش رہو۔“ نیا غرائی۔ ”تمہاری زندگی ہی میں تمہارے جسموں سے سارا خون لیا جائے گا۔“

”اوہو..... کیا مطلب؟“ اس بار انور بولا۔

”تمہارے لئے بڑی شاندار کہانی ہوتی مسٹر کرائم رپورٹر۔ لیکن افسوس کہ میں تم تین زندہ نہیں رہنے دوں گی۔ جب تمہارے جسموں سے خون نچوڑا جا چکے گا تو میں تمہارے سینے میں چا تو اتار دوں گی۔“

”مگر ہلدا خون تمہارے کس کام آئے گا۔“

”ایک بہت ہی خاص قسم کی فیڈ تیار کی جائے گی جسے سانپ کھا کر اپنی کھال ہلک کرے اور لومڑیاں سدھائے ہوئے کتوں کی طرح ہمارے کام آئیں گی۔“

”بھلا لومڑیوں سے کیا کام لیا جاسکتا ہے؟“ انور کے لہجے میں بے اعتباری تھی۔

”میں نہیں جانتی اور اب تم لوگ خاموش رہو۔“ نیا نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

انور کو گھورے جا رہا تھا۔ آخر اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”آپ کس مرض کی دوا ہیں۔“

”کتوں کی طرح چہل قدمی کرنے والی لومڑی میری ہی دریافت تھی اور میں نے اُسے پکڑا کر کرٹل صاحب کے حوالے کیا تھا۔“

”تو یہ مصیبت تمہاری ہی لائی ہوئی ہے۔“

”اور جس وقت وہ لومڑی پکڑی گئی تھی اس کے جسم سے ایک چھوٹا سا خود کار مودی بندھا ہوا تھا جس میں آٹھ ملی میٹر کی فلم چل رہی تھی۔“

”کہاں ملی تھی وہ لومڑی؟“

”انہی اطراف کے ایک ممنوعہ علاقے میں، جہاں ریڈار اسٹیشن بنایا جا رہا ہے۔“

”کب سے یہ چکر چل رہا تھا؟“

”قرباً ایک ماہ سے۔“

”اس وقت مجھے تمہاری شکل لومڑی ہی کی سی لگ رہی ہے۔“ حمید انور کو گھورتا ہوا بولا۔

اتنے میں نیا پھر آئی۔ اس بار بی راؤ اس کے ساتھ تھا۔ اس نے ٹامی گن بغل میں دبا رکھی تھی۔ نیا نے ان دونوں کو کھول دیا اور بی راؤ نے انہیں کور کئے ہوئے آگے چلنے کو کہا۔ وہ آپریشن تھیز میں آئے۔ ڈپلیکیٹ ایک میز پر چت پڑا نظر آیا۔ اس کا جسم چمڑے کے تسموں سے جکڑا ہوا تھا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ بی راؤ نے دو کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا جو قریب ہی پڑی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے نیا سے کہا تھا کہ وہ دوسری میز بھی تیار کرے۔ ڈاکٹر چنگیزی ڈپلیکیٹ کے جسم سے خون نکالنے کی تیاری کر رہا تھا۔ بی راؤ نے اسے رک جانے کا اشارہ کیا۔ نیا دوسری میز تیار کر چکی تو اس نے حمید اور انور کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اب تم دونوں! ڈاکٹر چنگیزی کو اس میز پر لٹا کر اس کا جسم تسموں سے کس دو۔“

”کیا مطلب.....؟“ ڈاکٹر پلٹ کر غرایا۔

”ظاہر ہے کہ اب تم بی راؤ کے لئے بیکار ہو چکے ہو کیونکہ پولیس تم پر شبہ کرنے لگی ہے۔ اس لئے آخری کھپ کچھ زیادہ ہی ہونی چاہئے۔“

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“

”کیا تم دونوں نے نہیں سنا۔“ بی راؤ ٹامی گن کو جنبش دے کر بولا۔

”دونوں اٹھے ہی تھے کہ نیا بولی۔ ”ڈاکٹر ہوشیار۔ یہ بی راؤ نہیں معلوم ہوتا۔“

”تمہارا خیال درست ہے لڑکی۔“ بی راؤ مسکرایا۔ ”اس وقت کرٹل فریدی غداروں سے

مخاطب ہے۔“

”اوہ.....!“ ڈاکٹر چنگیزی مٹھیاں بھیج کر غرایا اور نامی گن کی پرواہ کے بغیر فریادیں اٹھاتا تھا۔ لیکن اس سے قبل ہی انور ان کے درمیان آچکا تھا۔ نیا کا چاتو ایک بار بار آیا۔ اس نے حمید پر حملہ کیا تھا۔ حمید غافل نہیں تھا ورنہ چچا تلاتا ہاتھ دل ہی پر پڑا ہوتا۔ اس نے نیا کی کلائی پکڑ لی اور نیا نے اچھل کر بائیں ہاتھ سے اس کے بالوں پر جھپٹا مارا۔ ڈاکٹر نے انور کو فریدی پر دھکیل کر دروازے میں چھلانگ لگائی تھی۔ پھر انور اور نیا تو اس کے پیچھے چھپے تھے اور نیا حمید سے گتھی رہ گئی تھی۔ چاتو اس کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن وہ کسی ہزار پا کی طرح حمید سے جمنی ہوئی تھی۔

”شکریہ..... شکریہ۔“ حمید ہولے ہولے کراہتا ہوا بولا۔ ”جسم میں بڑا درد ہے۔“

”میں..... تمہیں پس کر رکھ دوں گی۔“ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔ ”کیا سمجھتے ہو۔“

”میں تمہیں بہت عقل مند سمجھتا ہوں۔ تم سرکاری گواہ بن کر بھی اپنی جان بچا سکتی ہو۔“

میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں بچا لوں گا۔“

دھنیا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور اس نے ہسٹریائی انداز میں چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیا۔

”ارے..... ارے بالکل احمق ہو۔ میں کہتا ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے نو“

سے پہلے بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر پر لعنت بھیجو اور چلو میرے ساتھ۔“

اچانک عمارت کے کسی حصے سے دھماکے کی آواز آئی اور پھر ایسا محسوس ہوا جیسے پورا

عمارت گر ہی جائے گی۔

”بھاگو.....!“ نیا جھپتی ہوئی دروازے کی طرف جھپٹی۔ ”وہ ڈائنامائٹ سے سب کچھ“

کر رہا ہے۔“

جیسے ہی وہ باہر نکلے ایک دھماکہ پھر ہوا اور عمارت کا مزید کچھ حصہ ڈھیر ہو گیا۔ گرد و غبار

اور دھوئیں کی وجہ سے دم گھٹنے لگے تھے۔ اس وقت حمید نے یہی مناسب سمجھا کہ صرف نیا

نظر میں رکھے۔ کیونکہ وہ بہر حال جان بچانے کے لئے باہر ہی نکل جانے کی کوشش کر رہا

تھا ہر تھا کہ اُسے کسی غیر مخدوش راستے کا علم ضرور ہوگا، لیکن اس وقت اسے وہ ڈھلیٹ

آ گیا جسے بحالت اضطراب بھول ہی گیا تھا۔ پھر وہ بے تحاشہ اسی کمرے کی طرف پلٹ پڑا۔

## درندہ

حمید کو ہوش آیا تو اپنے ہی کراہنے کی آواز کانوں میں گونجتی محسوس ہوئی۔ پورا جسم ایک دھماکا پھوڑا لگ رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کئے پڑا کراہتا رہا۔ فوری طور پر آنکھیں کھول دینے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ اُس نے ڈپلیکیٹ کے تسمے کاٹنے وقت کمرے کی چمت گرتے دیکھی تھی اور اس کے بعد..... اس کے بعد..... لیکن اب تو گھٹن کا احساس بھی نہیں تھا۔ تو کیا؟ تو کیا؟ اس نے یلخت آنکھیں کھول دیں۔

چاروں طرف زرد رنگ کی دھند چھائی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ دھند چھشتی گئی اور

دروازہ صاف نظر آنے لگے۔ وہ شاید کسی ہسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں تھا۔ اس نے اپنے

ہونٹ تختی سے بھیج لئے کیونکہ اب ذہن پر پوری طرح قابو پا چکا تھا۔ کراہیں تو نیم بیداری کی

حالت میں نکلتی رہی تھیں۔ پھر تین چار منٹ کے اندر ہی اندر اس کے گرد نرسوں اور ڈاکٹروں

کی بھڑلگ گئی تھی اور اُسے معلوم ہوا کہ وہ دو دن تک بیہوش رہا تھا۔ لیکن آس پاس کوئی ایسا

خبر نہ آیا جس سے وہ اپنی بیہوشی کے بعد کے واقعات معلوم کر سکتا۔ اس نے ایک نرس سے

پوچھا۔ ”یہاں بستر کے قریب فون بھی ہونا چاہئے۔“

”بہت اچھا جناب۔“ اس نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔

فون آنے پر اس نے سب سے پہلے فریدی کو تلاش کرنا چاہا تھا۔ لیکن ناکامی ہوئی تھی۔

پھر انور سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ بھی نہ اپنے آفس میں موجود تھا اور نہ  
میں۔ محکمے کے کسی دوسرے فرد سے اس سلسلے میں گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تھک ہار کر  
نمبر ڈائریل کئے اور دوسری طرف سے اسی کی آواز آئی اور پھر حمید کی آواز پہچان کر چکا تھا۔  
”الا کا شکر ہے کہ تم زندہ ہو۔ میں تمہیں پہلے ہی معاف کر چکا ہوں۔“

”کیوں؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ اچھا وہ لڑکی کہاں ہے کلارا؟“

”کبڑا ہو گیا..... اے راستے ہی میں قرغل صاحب نے دھر لیا تھا اور لوٹ آیا ساتھ لے گئے تھے۔“

”وہ کہاں مل گئے تھے؟“

”اسی ٹرک پر تو تھے جس پر گھوڑا آ رہا تھا۔ کل مجھ سے ملے تھے۔ کہنے لگے تم پر ہرگز کیس قائم ہو جائے گا۔ اس لئے چپ چاپ رہو۔ قویٰ یکین نہیں کرے گا کہ وہ لڑکی فوراً تمہیں بھغلائی تھی۔ وہی یہ بھی بتا رہے تھے کہ تم گھوڑے پر سے گر کر بیہوش ہو گئے ہو۔ بلکہ اسپتال قایم نہیں بتایا تھا۔“

حمید نے اندازہ کر لیا کہ فریدی نے قاسم کو ہسپتال تک کا پتہ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ لئے اس نے مزید کچھ کہے بغیر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ ویسے اس گفتگو کے بعد وہ مظلوم ہو گیا تھا کہ فریدی بخیر و عافیت ہے۔ لیکن وہ..... ڈپلیکیٹ..... وہ بیچارہ..... پتہ نہیں اس کا حشر ہوا ہو۔ اس کے سارے تسمے بھی تو وہ نہیں کاٹ سکا تھا۔ آخر اُسے اس طرح بندھوا کی کیا ضرورت تھی۔ سوچتے سوچتے اس کا سر چکرانے لگا اور وہ ایک بار پھر گہری نیند سو گیا۔ وہ ڈھائی گھنٹے بعد خود ہی جاگ اٹھا اور سب سے پہلے کرنل فریدی پر نظر پڑی تھی۔

”خدا کا شکر ہے کہ تم اب خطرے سے باہر ہو۔“ فریدی بولا۔

”لیکن وہ ڈپلیکیٹ۔“

”تمہیں سن کر حیرت ہوگی کہ اس کے جسم پر معمولی سی خراش بھی نہیں آئی۔ اسی

تھا کہ تم اسے بچانے کے سلسلے میں زخمی ہوئے تھے۔“

حمید نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ اب وہ کچھ بھی معلوم کرنا نہیں چاہتا تھا۔ فریڈ بھی کیس سے متعلق کوئی ذکر نہ چھیڑا۔

تین دن بعد جب وہ کسی حد تک چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو ذہن میں پھر وہی خلش بارہوئے لگی اور اس کے استفسار پر فریدی نے کہا۔ ”اگر تم قاسم کو ساتھ نہ لے جاتے تو اسے میرے قابو سے باہر ہو جاتے۔ وہ محض اتفاق نہیں تھا کہ کلارا قاسم کے ساتھ بھاگ کر فریڈ ہیئر ہوئی تھی۔ دراصل وہ اُس نے ہم لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ فریڈ ہیئر ہی کی ہدایت پر اس نے یہ قدم اٹھایا تھا لیکن میں نے انہیں راستے ہی میں روک دیا۔ لڑکی جلد ہی نروس ہو گئی تھی اور سب کچھ اگلنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے کسی بی راؤ کا ذکر کیا، جو ڈاکٹر چنگیزی سے ٹرانسمیٹر کے ذریعے رابطہ قائم کیا کرتا تھا لیکن چنگیزی سے کبھی ملا نہیں تھا۔ اس کے پیغامات سرحد پار سے آتے تھے۔“

”چنگیزی نے اُسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں..... اسی لئے مجھے بی راؤ بننے میں آسانی ہوئی تھی۔“

”چکر کیا تھا.....؟“

”انسانی خون کی اس گنگ..... یوں سمجھ لو کہ انسانی خون سے ایک ایسی غذا تیار کی جاتی تھی جسے کھا کر سانپ اپنی کھال موٹی کرتے تھے اور لومڑیاں اپنا مزاج بدل دیتی تھیں۔ یعنی ہاتھوں کی طرح سراغ رسانی کر سکتی تھیں۔ جب انور کے ہاتھ ایک ایسی لومڑی لگی تو مجھے فانی جرنی کے ایک سائنسٹ کا کارنامہ یاد آ گیا جس نے یہودیوں کے خون سے ایسی ہی ایک چیز تیار کی تھی۔ بہر حال اُس لومڑی کی دریافت کے بعد ہی میرے ایک انفارمر نے مجھے اطلاع دی کہ اشار آرن فیکٹری سے لوہے کے ڈرموں کی کھپیں نکلتی ہیں اور سرحد کے ایک قریبی علاقے میں ڈلوادی جاتی ہیں۔ اسی انفارمر کی مارگزیدگی کے بارے میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں اور اب یہ بات پوری طرح کھل گئی ہے کہ ڈاکٹر چنگیزی دیہاتوں کو اپنے ایسے نمونوں سے ڈسواتا تھا، جو ہر لیے نہیں ہوتے تھے۔ پھر انہیں علاج کے بہانے اپنی تجربہ گاہ میں اٹھوالے جاتا، اور بیہوش کر کے اُن کے جسموں کا زیادہ تر خون نچوڑ لیا کرتا تھا۔ بہر حال سانس لے چند لومڑیوں پر اس کا تجربہ کیا تھا۔ انور کے ہاتھ لگنے والی لومڑی انہی میں سے ایک تھی اور اس نے کپ کے پنجرے سے نکل کر چنگیزی کی تجربہ گاہ ہی کا رخ کیا تھا۔ اسی لومڑی نے انور کی گردی لگی۔“

”تو وہ مردود ہمارا خون سرحد پار کی لومڑیوں کے لئے بھجواتا رہا تھا۔“

”ہاں..... حمید صاحب! آدمی جب درندگی پر اتر آتا ہے تو جانوروں سے بچ ہو جاتا ہے۔ کیا تم نے کبھی کسی کتے کو دوسرے کتے کا گوشت کھاتے دیکھا ہے۔“

”چنگیزی کا کیا ہوا.....؟“

”اپنے پورے کاروبار سمیت فنا ہو گیا۔ بلے سے اس کی کچلی ہوئی لاش برآمد ہے۔ صرف نیا اور کلارا ہی ہاتھ لگ سکیں۔ دوسرے ملازمین اس کے علاوہ اور کچھ نہیں پا سکتے تھے کہ ڈاکٹر چنگیزی سانپوں کا زہر نکالتا ہے اور ان کی کھالیں ایکسپورٹ کرتا ہے۔ کلار سے ایڈ لیتا تھا اور اتنا ذی اثر تھا کہ معمولی حالات میں اس پر ہاتھ ڈالنا دشوار ہو جاتا۔ لئے اتنے پاؤ بیلے پڑے تھے۔ میرا اپنا ایک کوبرا بھی ضائع ہو گیا، جو انور اس لئے مانگو گیا تھا کہ ڈاکٹر کی تجربہ گاہ میں بحیثیت مارگزیدہ کچھ وقت گزار سکے۔ لیکن حقیقت یہ ہے مشکل آسان ہونے میں قاسم ہی کی حماقت کام آئی تھی۔ کلارا کا بروقت ہاتھ آ جاتا ہے۔“

مند ثابت ہوا۔“

”سیٹھ اکرام کا کیا قصہ تھا.....؟“

”کچھ بھی نہیں..... وہ صرف اسمگلر ہے اور کئی قسم کے ادارے غیر قانونی طور پر کر رکھے ہیں۔ دو چار دن بعد وہ بھی جیل ہی میں نظر آئے گا۔“

حمید پائپ میں تمباکو بھرنے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد بولا۔ ”کم از کم دو ماہ کی چھٹی درخواست کر دوں گا۔ کیا خیال ہے۔“

”ضرور..... ضرور..... میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں کچھ دنوں کے لئے ملک سے بھجوا دوں۔“

حمید نے مسکرانے کی کوشش کی تھی، لیکن بائیں جڑے پر چڑھے ہوئے پلاٹرن کی اجازت نہ دی۔

ختم شد

(مکمل ناول)

ٹھنڈا جہنم

جاسوسی دنیا نمبر 115

ٹھنڈا جہنم

کاغذ ہنگامہ ہے تو سستی کتابیں کرنسی نوٹ والے کاغذ پر کیوں نہیں چھاپی جاتیں وہ تو ملک میں بہ افراط موجود ہے! روٹی نصیب نہ ہو تو کیک کھا لینے میں کیا قیامت ہے.....!

لاحول ولا قوۃ پھر میں نے آپ کو کاغذ کے مسئلے پر بور کیا۔ کہہ رہا تھا کہ سگریٹ ترک کر دینے کے بعد دوبارہ حواس بجا ہونے میں بھی کچھ وقت لگا تھا۔ اس لیے کتاب پھر تاخیری ہی سے آپ تک پہنچ رہی ہے۔

اگر کبھی آپ کو سالہا سال پرانی سگریٹ نوشی کی عادت ترک کرنے کا اتفاق ہوا ہو تو آپ میری ذہنی کیفیت کا اندازہ بخوبی کر سکیں گے۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ اب اس ذہنی انتشار کے دور سے گزر چکا ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ کتاب کے لیے آپ کو معمول سے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے گا۔

اور ہاں آپ بھی سگریٹ ترک کر دیجئے۔ اس کی بجائے پان کھائیے، نوار سے شوق فرمائیے، حقہ پیجئے کہ یہ اپنے ہی ”قومی نشے“ ہیں۔

ابن صفحہ

۲۹-۶-۷۳

## پیشرس

یہ کتاب آدھی سے زیادہ لکھی جا چکی تھی کہ بخار کا حملہ ہوا اور اسی کے عالم میں ریڈیو پر کسی ڈاکٹر صاحب کی تقریر سنی جو کہہ رہے تھے کہ البتہ سگریٹ میں اتنا ٹکٹوئین ہوتا ہے، جو ایک چوہے کی زندگی کو ختم کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ سخت افسوس ہوا اپنی اس نامعقولیت پر کہ روزانہ پچاس پچپن چوہے اپنے اندر مار ڈالتا ہوں لہذا سگریٹ نوشی ترک کر دوں چاہیے.....! اس سے قبل ایک ذمہ دار آدمی کا یہ قول بھی نظر سے گزر چکا تھا: لوگ زیادہ قیمت ادا کر سکتے ہیں، اس لیے گرانی بڑھتی ہے.....! میں نے نہ کر لیا چونکہ سگریٹ اس قیمت سے زائد پر فروخت ہو رہے ہیں جو پیکل پر درج ہوتی ہے اسلئے مجھے سگریٹ نوشی نہیں کرنی چاہیے.... بھلا چوہوں مرنے جینے کی کون پرواہ کرتا ہے وہ تو جملہ معترضہ تھا۔

لیکن میں کاغذ ہر قیمت پر خریدوں گا کیونکہ میری روٹی کپڑا اور میکینک کاغذ ہی سے وابستہ ہے۔ ویسے کہنے کو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر میکینک

شہری آبادی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ دورویہ اونچی نیچی چٹانوں کے درمیان سڑک حد نظر تک نسان دکھائی دیتی تھی۔  
گاڑی فرارے بھرتی رہی۔

ابھی چٹانوں پر بکھری ہوئی دھوپ میں خاصی تمازت باقی تھی لیکن وہ جانتا تھا جیسے ہی سورج غروب ہوگا خشک ہواؤں کی بھیگی بھیگی سی نرمی جسم کے مسامات میں گھلنے لگے گی۔  
اس لذت کے تصور میں چمکیلی دھوپ آنکھوں پر زیادہ گراں نہیں گزر رہی تھی۔

دفعتاً اونگتے ہوئے ذہن کو جھٹکا سا لگا.....! سانسے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی سڑک کے وسط میں اس طرح ترجھی کھڑی دکھائی دی کہ اسے فوری طور پر اپنی گاڑی کی رفتار کم کر دینی پڑی.....! پھر بریک لگائے۔

گاڑی آگے نکال لے جانے کے لیے جگہ نہیں تھی.....! انجن بند کئے بغیر وہ اتر گیا۔  
ہاتھوں سے یہی ہو رہا تھا..... ہر سینچر کی شام کو اس پر اس قسم کی آوارہ گردی کا پڑتا تھا۔ واپسی اتوار کے اختتام پر ہوتی۔

دیرانوں میں بسیرا ہوتا تھا۔ ہفتے میں پورے چھتیس گھنٹے شہر کے ہنگاموں سے دور بسر کرنے کی یہ عادت اسے کدھر لیے جا رہی تھی.....! اس پر اس نے ابھی تک غور نہیں کیا تھا۔ اس سلسلے میں ذہن کو کریدنے کی بھی ضرورت نہیں محسوس کی تھی۔

ذہن کو کریدنے سے فائدہ بھی کیا؟..... مرض کی وجہ بھی معلوم ہو گئی تو تم کیا کر گے.....؟ کس کے پاس علاج ہے.....؟  
بس لہراٹھے اور بہہ جاؤ..... اپنے گرد یکسانیت کے جال کیوں بن رکھے ہیں؟  
میں دوڑ لگانے کی سکت پیدا کرو۔

آنکھیں بند کرو اور دوڑ جاؤ..... ہو سکتا ہے کوئی اندھا کنواں تمہیں اس اذیت نجات دلا دے.....!

بہر حال اب سر پر نیلا آسمان تھا اور نیچے کو تار کی سیاہ سڑک!  
گاڑی ساٹھ میل کی رفتار سے اڑی جا رہی تھی..... شلٹام کے چار بجے تھے۔

”مجھے رکنا پڑا.....!“ اس نے جملہ پورا کر دیا لیکن لہجے میں پھاڑ کھانے کا سا انداز تھا۔  
”تم کسی تھانیدار کی اولاد معلوم ہوتے ہو!“ لڑکی اسے گھورتی ہوئی بولی۔  
”بکواس مت کرو.....!“ گاڑی اس طرح کیوں کھڑی کی ہے.....!“

”خواتین سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے!“ لڑکی کا موڈ بدل گیا۔

”میں اول درجے کا گدھا ہوں..... پھر.....!“

”میری گاڑی کا پٹرول ختم ہو گیا ہے!“ وہ ایک بیک روہانسی ہو گئی۔

”میں پٹرول پمپ تو نہیں ہوں.....!“

”اے پٹرول ہو تو اتنا دے دو کہ میں اگلے پٹرول پمپ تک پہنچ سکوں۔“

”گاڑی تو بڑی شاندار ہے تمہاری.....!“

”بھکارن تو نہیں ہوں..... پٹرول کی جو قیمت طلب کرو گے دوں گی!“

”چلو پہلے گاڑی سڑک کے کنارے لگاؤ.....!“ اس نے درشت لہجے میں کہا۔

دونوں نے گاڑی کو دھکا دے کر سڑک کے کنارے لگا دیا۔ اس نے پہلے ہی اپنی

باتیں کنارے پر روکی تھی۔

دوسری گاڑیوں کے لیے سڑک صاف ہو گئی۔

”روانگی سے پہلے فیول کیوں نہیں چیک کیا تھا۔“

”میٹر خراب ہو گیا ہے.....!“

”کہاں رہتی ہو.....!“

”جنت میں.....!“

”مبارک ہو!“ کہتا ہوا وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔

وہ اسکے پیچھے چل پڑی تھی لیکن وہ ڈکے کھولنے کے بجائے اسٹیرنگ کے سامنے جا بیٹھا۔

”میں نے کہا تھا..... پٹرول.....!“

”میری گاڑی میں بیٹھ جاؤ..... پہنچا دوں گا.....!“

”جہنم میں.....!“ وہ اسے گھورتی ہوئی بولی۔

”جنت سے اسی لیے نکالے گئے تھے کہ جہنم بھی آباد ہو سکے اور تم تو سیدھی جنت

سے چلی آ رہی ہو.....!“

”ذہنی طور پر بیمار لگتے ہو!“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی۔

”تم پہلی لڑکی ہو جس نے میرے ذہن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔“

”تو دے دو تا پٹرول.....!“

”کتنے سے کام چل جائے گا!“

”بس اتنا ہی کہ اگلے پٹرول پمپ تک پہنچ جاؤں۔“

وہ گاڑی سے اتر آیا۔ ڈکے کھولی اور ایک گیلن کا ڈبہ نکال کر اس کے حوالے کیا۔

”اوہو..... اتنا اسپر.....!“ وہ بقیہ ڈبوں کو گھورتی ہوئی بولی۔ ”کہاں جاؤ گے!“

”میں کسی پڑ سکون جھیل کی تلاش میں نکلا ہوں.....!“

”میری جھیل اگلے پٹرول پمپ سے زیادہ دور نہیں ہے!“

”تمہاری جھیل.....!“

”ہاں..... آں..... کیوں نہیں..... جب کہ میں نے ہی اسے دریافت کیا ہے! میں نے

بچے علاوہ وہاں اور کسی کو نہیں دیکھا!“

”اگر وہ ایسی ہی دیران جگہ ہے تو میرے لیے موزوں رہے گی.....!“

لڑکی نے اسے غور سے دیکھا اور ٹن اٹھائے ہوئے اپنی گاڑی کی طرف چل پڑی۔

وہ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا..... لڑکی کی چال بھی بڑی دلکش تھی! ایسا لگتا تھا جیسے پھولوں

سے لدی ہوئی جمیلی کی کوئی شاخ ہوا کے نرم رو جھونکوں میں ہلکورے لے رہی ہو.....!

اپنی گاڑی میں پٹرول ڈال کر خالی ٹن واپس کرنے اس کے پاس پلٹ آئی۔

”تم جیسے لوگوں کا دم غنیمت ہے دنیا میں.....!“ لڑکی بولی۔

”میرا تمہاری دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے!“

”کیا مطلب.....!“

”میں مرتخ سے آیا ہوں!“

”مگر تمہارے کان گدھوں کے سے تو نہیں ہیں!“

”ٹانگیں گدھوں کی سی ہیں..... اب چلتی پھرتی نظر آؤ ورنہ دولتی رسید کر دوں گا۔“

”بدتمیز ہو.....!“

”رومانی گفتگو سے اب جی بھر گیا ہے! لڑکیوں سے اب ایسی ہی باتیں کرتا ہوں!“

”بہت زیادہ رہے ہو لڑکیوں میں.....!“



”اسی لیے اب صحراؤں کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں.....!“

”پتہ نہیں کیوں تم پر رحم آ رہا ہے.....!“

”شکریہ.....! میں قابلِ رحم نہیں ہوں.....!“

”زندگی سے بیزار معلوم ہوتے ہو! اچھا چلو میں تمہیں وہ جھیل دکھا دوں گی۔“

اور بیٹھا پانی ہے..... میں اس میں گھٹنوں تیرتی رہتی ہوں!“

پھر وہ اپنی گاڑی میں جا بیٹھی تھی..... دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتی رہیں۔

پندرہ منٹ بعد وہ پٹرول پمپ تک پہنچے تھے۔ لڑکی نے اپنی گاڑی میں فلنگ سفر پھر شروع ہو گیا۔

کچھ دیر بعد لڑکی نے اپنی گاڑی بائیں جانب والے ایک نامہوار راستے پر موڑ دیا۔ وہ اس کا تعاقب کرتا رہا اور پھر وہ سچ بڑی جگہ پر پہنچ گئے۔

چاروں طرف بکھری ہوئی چٹانوں کے درمیان ایک چھوٹی سی شفاف جھیل تھی۔ جگہ سبز جھاڑیاں نظر آرہی تھیں۔

”واقعی بڑی خوبصورت جگہ ہے!“ اس نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

”ہے نا!“ لڑکی چکی۔ ”اب میں کچھ دیر تیرا کیے بغیر یہاں سے واپس نہیں ہاتا تمہارا کی خیال ہے؟“

”میرے پاس نہانے کا لباس نہیں ہے!“

لڑکی خاموشی سے اپنے کپڑے اتارنے لگی۔ تیرا کی کا لباس اس نے کپڑوں پہلے ہی سے پہن رکھا تھا۔

وہ متحیر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

پھر لڑکی نے لمبی دوڑ لگا کر جھیل میں چھلانگ لگائی تھی۔

پہلے بھی بے شمار لڑکیوں سے واسطہ پڑ چکا تھا لیکن یہ لڑکی اپنی تمام رعنائیوں سے

اسے نہ جانے کیوں کوئی غبیث روح لگ رہی تھی۔

اس نے جیب سے تمباکو کی پاؤچ اور پائپ نکالا اور پرتکثر نظروں سے اسے تیرتے دیکھا۔

کبھی کبھی وہ پانی میں غوطہ لگا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔

اس نے پائپ ساگایا اور ہلکے ہلکے کش لیتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ رات اسی جھیل کے کنارے گزاری جائے۔ وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر بہت سے آبی پرندے تیرتے

پھر رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہی رات کے کھانے کے لیے کای ہوتا۔ لیکن یہ لڑکی..... کتنی نڈر ہے ایک اجنبی کے ساتھ یہاں تک چلی آئی اور اب بڑی بے

فکری سے اشان کر رہی ہے۔ دفعتاً اسے خیال آیا کہ کسی معاملہ میں الجھایا تو نہیں جا رہا..... اس سے پہلے بھی متعدد

بار ایسا ہو چکا تھا..... لڑکیوں نے اسے دشواریوں میں مبتلا کیا تھا.....!

تو پھر اب اسے کیا کرنا چاہیے.....! یا پھر ہو سکتا ہے کہ کسی متول گھرانے کی کوئی ادباش

لڑکی ہو.....! اجنبیوں کو اسی طرح اپنی طرف متوجہ کر کے ان کے ساتھ وقت گزارتی ہو.....!

اس نے گاڑی کے ایک پوشیدہ خانے سے چار سو دس بور کی چھوٹی سی دو تالی ہندوق نکالی

اور اسے لوڈ کر کے جھیل کے اس حصے کی طرف بڑھنے لگا جہاں آبی پرندے تیر رہے تھے۔

دفعتاً لڑکی زور سے چیخی اور وہ چونک کر آواز کی طرف پلٹ پڑا۔ لڑکی پانی کے باہر

کھڑی نظر آئی۔

اس نے دیکھا کہ وہ کنارے سے گیلی مٹی اٹھا اٹھا کر اپنے جسم پر پلاستر کر رہی ہے۔

ساتھ ہی فلمی ریڈانڈین اشاکل میں جینیں بھی مارتی جا رہی تھی۔

وہ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ ادھر لڑکی بالکل بھوتی بن کر رہ گئی تھی۔ پھر وہ اس کی طرف

بڑھائی تھا کہ وہ شور مچاتی ہوئی چٹانوں کی طرف بھاگ نکلی۔

”کیا بلا ہے یہ.....؟“ وہ دانت پیس کر بڑبڑایا۔

لڑکی چٹانوں میں غائب ہو گئی اور وہ پھر اپنی گاڑی کے قریب آکھڑا ہوا۔

دس منٹ گزر گئے..... لیکن اس کی واپسی نہ ہوئی..... اس نے ایک بار پھر بُرا سا منہ بنایا

اور اس طرف چل پڑا جدھر لڑکی گئی تھی۔

اس کے جسم سے گرنے والی مٹی رجنمائی کرتی رہی..... تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مٹی گرتی

گئی تھی۔

بالآخر وہ ایک تنگ سے درے میں داخل ہوا اور پھر اچانک اسے رک جھٹکا پڑا۔

سامنے ہی کوئی اوندھا پڑا تھا لیکن یہ تو کوئی مرد تھا اور اس کے جسم پر پورا لباس موجود تھا۔ یہ کسی یا کمیس فریدوں کا کارڈ تھا، جو سارہ ہائی بلڈنگ وہ چند لمحے سالت و صامت کھڑا اے گھورتا رہا۔۔۔۔۔ پھر آگے بڑھا اور پھر جیسے ہی اس نے اُسے سیدھا کیا حلق سے تیز زدہ سی آواز نکل گئی۔

وہ تو ایک اش تھی اور چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔۔۔۔۔! دفعتاً وہ پلٹ کر اپنی گاڑی کی طرف بھاگا۔ یہاں سے گاڑی کا فاصلہ ایک یا دو فرانگ سے کسی طرح کم نہ رہا ہو گا لیکن وہاں لڑکی کی گاڑی نظر نہ آئی۔ نکل گئی۔۔۔۔۔ اس نے سوچا اور گاڑی کے ڈیش بورڈ کے ایک خانے سے ٹرانسمیٹر نکالا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایس پی ہومی سائیڈ کو کال کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جواب ملا۔  
 ”یور آئیڈنٹیٹی پلیز۔۔۔۔۔!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔  
 ”کیپٹن حمید۔۔۔۔۔ مرکزی محکمہ سرانفرسانی۔۔۔۔۔!“  
 ”کیسے کیا بات ہے۔۔۔۔۔!“  
 ”مفروضہ سرفراز کی لاش مل گئی ہے۔۔۔۔۔!“  
 ”کون سرفراز۔۔۔۔۔!“  
 ”کیفے دار اکامینٹر۔۔۔۔۔!“  
 ”اوہ۔۔۔۔۔ آپ کہاں ہیں؟“  
 ”ایک جمیل کے کنارے۔۔۔۔۔ ہائی وے کے اکہترویں میل پر جو پٹرول پمپ ہے وہاں پہنچ جائیے۔۔۔۔۔!“  
 ”کیا آپ وہیں ملیں گے۔۔۔۔۔!“  
 ”جی ہاں۔۔۔۔۔ اور اینڈ آل۔۔۔۔۔!“

ٹرانسمیٹر ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھ کر اس نے طویل سانس لی اور پھر گاڑی سے اتر آیا۔ لڑکی نے جہاں اپنی گاڑی کھڑی کی تھی وہاں گاڑی موڑنے کے نشانات موجود تھے۔ شاید وہ اسے لاش کے راستے پر پر لگا کر خود صاف نکل گئی تھی۔

حمید پھر اپنی گاڑی کی طرف پلٹ آیا اور اب اس کی نظر اس وزینگ کارڈ پر پڑی۔

یہ کسی یا کمیس فریدوں کا کارڈ تھا، جو سارہ ہائی بلڈنگ وہ چند لمحے سالت و صامت کھڑا اے گھورتا رہا۔۔۔۔۔ پھر آگے بڑھا اور پھر جیسے ہی اس نے اُسے سیدھا کیا حلق سے تیز زدہ سی آواز نکل گئی۔

وہ تو ایک اش تھی اور چہرہ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔۔۔۔۔! دفعتاً وہ پلٹ کر اپنی گاڑی کی طرف بھاگا۔ یہاں سے گاڑی کا فاصلہ ایک یا دو فرانگ سے کسی طرح کم نہ رہا ہو گا لیکن وہاں لڑکی کی گاڑی نظر نہ آئی۔ نکل گئی۔۔۔۔۔ اس نے سوچا اور گاڑی کے ڈیش بورڈ کے ایک خانے سے ٹرانسمیٹر نکالا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایس پی ہومی سائیڈ کو کال کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جواب ملا۔  
 ”یور آئیڈنٹیٹی پلیز۔۔۔۔۔!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔  
 ”کیپٹن حمید۔۔۔۔۔ مرکزی محکمہ سرانفرسانی۔۔۔۔۔!“  
 ”کیسے کیا بات ہے۔۔۔۔۔!“  
 ”مفروضہ سرفراز کی لاش مل گئی ہے۔۔۔۔۔!“  
 ”کون سرفراز۔۔۔۔۔!“  
 ”کیفے دار اکامینٹر۔۔۔۔۔!“  
 ”اوہ۔۔۔۔۔ آپ کہاں ہیں؟“  
 ”ایک جمیل کے کنارے۔۔۔۔۔ ہائی وے کے اکہترویں میل پر جو پٹرول پمپ ہے وہاں پہنچ جائیے۔۔۔۔۔!“  
 ”کیا آپ وہیں ملیں گے۔۔۔۔۔!“  
 ”جی ہاں۔۔۔۔۔ اور اینڈ آل۔۔۔۔۔!“

ٹرانسمیٹر ڈیش بورڈ کے خانے میں رکھ کر اس نے طویل سانس لی اور پھر گاڑی سے اتر آیا۔ لڑکی نے جہاں اپنی گاڑی کھڑی کی تھی وہاں گاڑی موڑنے کے نشانات موجود تھے۔ شاید وہ اسے لاش کے راستے پر پر لگا کر خود صاف نکل گئی تھی۔

حمید پھر اپنی گاڑی کی طرف پلٹ آیا اور اب اس کی نظر اس وزینگ کارڈ پر پڑی۔

”نہیں واقعی..... میں نہیں بھاگ سکتا..... مقدرات کی زنجیر مجھے بہر طور اسی خراب کھینچ لائے گی.....!“

”کیا ہوا.....! کسی لڑکی نے انکل کہہ دیا کیا.....!“

”جہنم میں جائے لڑکی.....!“

”تہا نہیں جائے گی تم بھی ہو گے اسکے ساتھ..... اب آ جاؤ اصل بات کی طرف

”لڑکی ہی تھی.....!“ حمید نے ٹھنڈی سانس لی اور پوری کہانی دہرا دی.....!

”تم سے حماقت سرزد ہوئی.....!“ فریدی خشک لہجے میں بولا۔ ”تمہیں سب سے

مجھے مطلع کرنا چاہیے تھا.....!“

”کیس ہمارے پاس تو نہیں تھا.....!“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا..... میں دیکھ رہا ہوں کہ تم روز بروز ناکارہ سے

ترین ہوتے جا رہے ہو.....!“

”میں نہیں سمجھا.....!“

”پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تم نے براہ راست کسی بھی معاملے میں ہوی سائیڈ

سے رابطہ قائم کیا ہو! اور پھر ایسی صورت میں جب کہ وہ لاش اتفاقاً دریافت نہیں ہوئی تھی

”میں نے اسے اتفاق ہی کا رنگ دیا ہے۔“

”میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا..... سرفراز کے بارے میں تم کیا جانتے ہو

”کیفے دارا کا منیجر تھا۔ ایک ہفتہ قبل کیفے دارا پر پولیس کا چھاپہ پڑا تھا جہاں سے

مقدار میں غشیات برآمد ہوئی تھیں اور سرفراز روپوش ہو گیا تھا.....!“

”چھاپہ کس بناء پر پڑا تھا.....!“

”مجھے تفصیل کا علم نہیں!“

”کسی نامعلوم عورت نے ایس۔ پی ایسٹ ڈویژن کو فون پر اطلاع دی تھی کہ کچھ

میں نشیات کی ایک بڑی کھپ اتاری گئی ہے!“

”اوہ.....!“

”لڑکی کی گاڑی کا نمبر یاد ہے؟“

”نہیں.....!“

”گاڑی کا میک.....!“

”نئے موڈل کی سرسبز تھی.....!“

”شہر میں بے شمار ہیں!“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا اور چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔

”لڑکی کا حلیہ.....!“

”پہلے خوب صورت..... پھر بھونتی.....!“

”سنجیدگی اختیار کرو۔“ فریدی کا لہجہ سخت تھا۔

”دما نہیں تھی۔“ حمید بھی جھنجھلا گیا۔

وزینگ کارڈ کے بارے میں بتانا بھول گیا تھا۔ یاد آنے پر بھی جھنجھلاہٹ کی بناء پر گول

رگیا۔

فریدی اٹھ گیا۔ حمید سنگ روم میں بیٹھا رہا۔ وہ لڑکی کا حلیہ کیا بتاتا۔ بس وہ بے حد

بصورت تھی۔ اس کے علاوہ اور کیا کہتا۔ بالتفصیل سراپا بتانے بیٹھا تو غزل ہو جاتی۔

ہو سکتا ہے بعد میں وہ بھتنی اس لیے بن گئی ہو کہ اس کا حلیہ بیان کرنے والا دشواری میں

پڑ جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میک اپ میں رہی ہو اور جھیل میں غوطے لگانے کی وجہ سے میک

پاڑ گیا ہو۔ لہذا اصلی صورت چھپانے کیلئے چہرے پر کچڑ کا پلاسٹر کر لیا گیا ہو۔

تو پھر اب کیا کرنا چاہیے۔ فریدی کو خواہ مخواہ تاراض کر دیا۔ وہ سوچتا اور بور ہوتا رہا۔

دفن فون کی کھنٹی بجی اور اس نے ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھا لیا۔

”ہیلو.....!“

”کون صاحب ہیں؟“ دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی۔

”حمید.....!“

”ارے واہ بھولے بادشاہ..... سچ مچ بدھو تھوڑا ہی ہو..... کیا برا مان گئے.....!“

”اب کیا ہے؟ لاش وہاں سے اٹھوا لی گئی.....!“

”کیا مطلب..... کیسی لاش.....؟“

”اس سے کام نہیں چلے گا..... عکھندی کا تھا ضابطہ ہے کہ فوراً مجھ سے مل لو.....!“

”وہ کال کسی فلیٹ سے نہیں ہوئی تھی.....!“ اس نے بالآخر کہا۔

”پھر.....!“

”تیرہ نمبر کے پبلک ٹیلیفون بوتھ سے!“

”دلیل..... لیکن اس نے تو کہا تھا کہ وہ خطرے میں ہے اور فلیٹ سے باہر نہیں نکل سکتی!“

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ وزٹنگ کارڈ پر نظر جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے

کہا۔ ”اور تیرہ نمبر کا بوتھ بھی اس علاقے میں نہیں ہے جہاں سارہ بائی بلڈنگ واقع ہے!“

”پتہ نہیں کیا چکر ہے!“ حمید سر سہلانا ہوا بڑ بڑایا۔

”ابھی معلوم ہوا جاتا ہے..... بیٹھ جاؤ.....!“

فریدی نے فون پر کسی کے نمبر ڈائل کیے اور ماؤتھ پیس میں بولا۔ ”ہارڈ اسٹون.....“

چیک کرو کہ سارہ بائی بلڈنگ کے پندرہویں فلیٹ میں کون رہتا ہے۔ فلیٹ مقفل ہو تو کسی

طرح اندر داخل ہونے کی کوشش کرو..... آدھے گھنٹے کے اندر اندر رپورٹ چاہیے!“ پھر

ریسیور رکھ کر سگار لگانے لگا۔

”میں ڈائننگ روم میں جا رہا ہوں!“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔

ہارڈ اسٹون کے حوالے پر وہ سمجھ گیا تھا کہ فون بلیک فورس کے کسی ممبر کو کیا گیا ہے۔

ڈائننگ روم میں پہنچ کر اس نے کھانا طلب کیا۔ کھانے اور کافی کے اختتام تک وہ مدت

پوری ہو گئی، جو بلیک فورس کے کسی ممبر کو دی گئی تھی۔

حمید وہاں سے اٹھ کر پھر سٹنگ روم میں آیا۔ فون کا ریسیور فریدی کے ہاتھ میں تھا اور

”بہت غور سے دوسری طرف کی بات سن رہا تھا۔“

بالآخر ریسیور رکھ کر حمید کی طرف مڑا۔

”اس فلیٹ میں بھی ایک لاش موجود ہے فرزند..... کسی لڑکی کی لاش اب تم وہاں جا کر

استثنا کر سکتے ہو!“

”دوبارہ ملاقات ہی کی توقع پر تو اپنا کارڈ تمہاری گاڑی میں چھوڑ آئی تھی!“

”تو تمہارا نام یا کمین فریدوں ہے!“

”نہیں مٹر کی پھلی.....!“

”کیا مطلب.....!“

”غیر ضروری سوالات میں وقت ضائع نہ کرو۔ میں اپنے فلیٹ میں تمہاری منتظر ہوں۔“

”سوال یہ ہے کہ تم خود ہی کیوں نہیں آ جاتیں!“

”میں خطرے میں ہوں..... فلیٹ سے باہر نہیں نکل سکتی.....!“

”کھل کر بات کرو۔“

”تم سمجھتے کیوں نہیں! میں خطرے میں ہو.....!“ دوسری طرف سے آواز آئی

سلسلہ منقطع ہو گیا۔

حمید ریسیور رکھ کر کچھ دیر گم سم بیٹھا رہا پھر اٹھا ہی تھا کہ فریدی دروازے میں کھڑا

دیا۔ وہ اسے اس طرح گھور رہا تھا جیسے اس کی چوری پکڑ لی ہو.....!

”کہاں چلے.....!“ بالآخر وہ بولا۔

”کہیں نہیں.....!“

”بیٹھ جاؤ!“ فریدی کا لہجہ اچھا نہیں تھا۔

”کیا مطلب.....!“

”لڑکی کا وزٹنگ کارڈ.....!“ فریدی ہاتھ بڑھاتا ہوا بولا۔

”تنت..... تو..... آپ دوسرے انٹرومنٹ پر سن رہے تھے.....!“

”اور تیسرے انٹرومنٹ پر ایکنیج کو ہدایت بھی کی تھی کہ اس کال کو چیک کر کے

جائے کہ یہ کس نمبر سے ہو رہی ہے!“

حمید نے طویل سانس لی اور کارڈ نکال کر فریدی کی طرف بڑھا دیا۔ اتنے میں فون

گھنٹی پھر بجی۔ اس بار فریدی نے ریسیور اٹھایا تھا۔

”ہیلو..... ہاں ہاں..... میں ہی ہوں..... ادھر..... اچھا۔ شکریہ.....!“ وہ ریسیور

حمید کی طرف مڑا۔ اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ تھی۔

## لاشیں

38

بواخون یہی ظاہر کر رہا تھا۔“

”کیا تمہیں علم ہے کہ سرفراز بھی اسی عمارت میں رہتا تھا!“ دفعتاً فریدی بولا۔

”نہیں! اودہ!“

”دوسری منزل پر..... فلیٹ نمبر ستائیس میں!“

”کیا یہ محض اتفاق ہو سکتا ہے.....!“

فریدی خاموش رہا۔

حمید کا ذہن مسلسل چنے جا رہا تھا۔ وہ یہی لڑکی تھی۔ وہ یہی لڑکی تھی لیکن لاش کی حالت

نی کے نظریے کی بھی تردید نہیں کر رہی تھی تو پھر یہ سب کیا تھا.....؟ دوسری طرف منطقی

راے باور کرنے پر تیار نہیں تھا کہ قتل ہو جانے کے بعد بھی اس کی روح کا رابطہ عالم

ام سے نہیں ٹوٹا تھا۔

پھر اس اتفاق کو کیا کہیے کہ مقتول سرفراز کی رہائش بھی اسی عمارت میں تھی۔

رات کا بیشتر حصہ اس قصبے کی نذر ہو گیا۔ دوسری صبح وہ دیر تک سوتا رہا تھا۔ سوتا ہی رہتا

بلیٹن کی گھنٹی نہ بجتی۔

”ہیلو.....!“ وہ ریسور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں دھاڑا۔ نیند کی جھونجھل میں تھا لیکن

ہر طرف سے ایک نسوانی قہقہہ سن کر اس کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔

”میں مرجکی ہوں کیپٹن حمید!“ قہقہے کے اختتام پر کہا گیا۔

”مجھے تو زندہ رہنے دو.....!“

”تم بھی مر چکے ہو.....! ہم سب مر چکے ہیں!“ دوسری طرف سے آواز آئی اور پھر

نجواں اور سسکیاں سنائی دینے لگیں۔ وہ رو رہی تھی۔

”تم آخر ہو کیا بلا.....!“ حمید دانت پیس کر بولا۔

”ہری طرف سے سلسلہ منقطع ہو جانے کی آواز آئی۔

پھر وہ بڑی غلت کے ساتھ اپنی خواب گاہ سے برآمد ہوا تھا لیکن ملازموں سے معلوم ہوا

نی گھر پر موجود نہیں ہے۔ منہ اندھیرے ہی کہیں چل دیا تھا۔

ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر حمید سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

وہ فرش پر چپت پڑی تھی۔ بائیں کپٹی پر ایک بدنما سوراخ تھا..... آنکھیں کھلی تھیں..... غالباً موت کے ساتھ ہی حقیر اور خوف کے آثار چہرے پر منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔ فریدی نے سوالیہ انداز میں حمید کی طرف دیکھا اور حمید نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی اس کی بھی تصدیق ہو گئی تھی کہ مقتولہ کا نام یاسین فریدوں ہی تھا اور وہ پچھلے تین سال سے اسی فلیٹ میں مقیم تھی۔

لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد فریدی حمید کو الگ لے گیا۔ اس کے محکمے کے بظرف شعبوں کے ماہرین فلیٹ کے دوسرے کمروں میں بھی مصروف کار تھے۔

”تمہیں یقین ہے کہ یہی تھی.....!“ فریدی نے حمید سے سوال کیا۔

”یہی تھی.....!“ حمید بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”بڑی عجیب بات ہے؟“

”میں بھی اسی پر غور کر رہا ہوں!“ حمید کا لہجہ غم انگیز تاثر سے خالی نہیں تھا۔

”فون پر بھی اسی کی آواز تھی.....؟“ فریدی نے پوچھا۔

”مجھے یقین ہے کہ کچھ دیر پہلے فون پر مجھ سے اسی نے گفتگو کی تھی۔“

”اور ملاقات غالباً چار بجے شام کو ہوئی تھی.....!“

”جی ہاں..... چار یا سوا چار بج رہے ہوں گے۔“

”لیکن میرا تجربہ ہے کہ یہ لڑکی چار بجے زندہ نہیں تھی.....! قتل دس اور بارہ کے

درمیان ہوا ہے، ہو سکتا ہے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں ایک یا ڈیڑھ گھنٹے کا فرق آئے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے.....!“ حمید بولا۔

”تو پھر.....!“

حمید کچھ نہ بولا۔ فریدی بھی گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔

”پڑوس میں کسی نے بھی فائر کی آواز نہیں سنی تھی لیکن قتل فلیٹ ہی میں ہوا تھا۔ فرش“

”کچھ بھی نہیں.....!“ ذہن نے جواب دیا۔ ”آج اتوار ہے.....!“

لیکن وہ آواز جو ابھی فون پر سنائی دی تھی۔ کیا اسے اتوار کی خوشیاں نصیب ہو گئی۔ پتہ نہیں وہ کون ہے اور کیا چاہتی ہے۔

ہنسی میں جتنی کھٹک تھی اتنا ہی گداز رونے میں تھا۔ جب وہ فون پر روئی تھی تو اب آنکھیں غیر ارادی طور پر بھیگ گئی تھیں اور وہ جملہ کتنی تاثر انگیزی کے ساتھ کہا گیا تھا ”بھی مر چکے ہو..... ہم سب مر چکے ہیں.....!“

فون کی گھنٹی پھر بجی..... وہ تیزی سے انسرومنٹ کی طرف جھپٹا تھا لیکن اس بار اس کی آواز سنائی دی تھی۔

”ہم سب مر چکے ہیں؟“ وہ ماؤتھ پیس میں دھاڑا تھا۔

”کیا بکواس ہے.....!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”اوہ..... کچھ نہیں..... آپ کہاں سے بول رہے ہیں!“

”تیرہ نمبر کے پبلک ٹیلیفون بوتھ سے.....!“

”اوہو..... کوئی خاص بات.....!“

”کچھ دیر پہلے تم نے کوئی کال ریسیو کی تھی.....!“

”جی ہاں..... وہ عالم بالا سے بول رہی تھی۔ کیا اس بوتھ کی کالیں ٹیپ کی جارہی ہیں؟“

”ہاں..... میرا خیال ہے کہ وہ اس بوتھ کے آس پاس ہی کہیں رہتی ہے!“

”یہ بوتھ ہے کہاں.....!“

”اپر کلاس ہاؤسنگ سوسائٹی میں.....!“

”اوہ..... کس جگہ.....؟“

”سوسائٹی کے ٹیلیگراف آفس کے قریب.....! تم کتنی دیر میں یہاں پہنچ سکتے ہو!“

”میں تیار ہی ہوں.....!“

”آ جاؤ..... میں ٹیلیگراف آفس میں ملوں گا۔“

ٹیلیگراف آفس تک پہنچنے میں پندرہ منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوئے تھے۔ فریدی نے لیکن ٹیلی گراف آفس کے قریب کھڑی نظر آئی اور وہ گاڑی ہی میں بیٹھا ہوا تھا.....

نے اشارہ کر کے گاڑی آگے بڑھالے گیا۔

سات آٹھ منٹ بعد ان کی گاڑیاں سے پول ہوٹل کی کپاؤنڈ میں داخل ہوئیں۔

ڈائمنگ ہال سنسان تھا..... فریدی کاؤنٹر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

”فرمائیے جناب!“ کاؤنٹر کلرک نے مؤدبانہ کہا۔

”میجر سے کہاں ملاقات ہو سکے گی؟“

”وہ تو تار جام تشریف لے گئے ہیں جناب!“

”اوہ..... اچھا..... ذرا ہیڈ ویئر کو بلوا دیجئے.....!“

”کوئی خاص بات ہے جناب!“ کلرک نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ وہ شاید ان

کو پہچانتا تھا۔

”نہیں کچھ ایسی تشویش کی بات نہیں!“

”وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر ہے جناب!“

”اس کا پتہ.....!“

”ابھی حاضر کرتا ہوں جناب!“ اس نے کہا اور کاؤنٹر سے اٹھ کر میجر کے کمرے میں

چلا گیا۔

حید خاموش کھڑا تھا۔ بہت سے سوالات اس کے ذہن میں گھبرا رہے تھے لیکن اس

نے فی الحال صرف پاپ ہی سے شغل کرتے رہنے کو ترجیح دی۔

کاؤنٹر کلرک واپس آ گیا..... ہیڈ ویئر کا پتہ ایک سلپ پر تحریر کر لایا تھا۔

”اور کوئی خدمت جناب!“ اس نے سلپ فریدی کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں..... شکریہ!“

وہ پھر باہر آئے۔

”تم اپنی گاڑی فی الحال یہیں پارک رہے دو..... اور میرے ساتھ چلو۔“ فریدی نے

نید سے کہا۔

”اور کوئی خدمت جناب!“

”چلو بیٹھو!“

فریدی کے بعد پولیس کو بیان دے سکے۔“

حمید کچھ نہ بولا..... اس کا ذہن اسی لڑکی میں الجھا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

”تو وہ لڑکی قاتلوں کو بھی جانتی ہوگی۔“

”ہیڈ ویٹر کی تلاش کیوں ہے!“ حمید نے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی بتاتا ہوں!“

گاڑی سے پول کی کپاؤنڈ سے باہر نکلی اور فریدی بولا۔ ”یا سمین فریدو! ایک مقام میں اسٹیو تھی.....!“

”میں نے ہیڈ ویٹر کے بارے میں پوچھا تھا۔“

”بچھلی رات اسکے کمرے سے ایک بیج برآمد ہوا تھا اور یہ بیج سے پول کے ہیڈ ویٹر کا ہے“

”اوہ.....!“

”معلوم ہوا ہے کہ یا سمین اور سرفراز ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ ان کے تعلق کے بارے میں سارہ بائی بلڈنگ کے دوسرے کرایہ دار عموماً چہ میگوئیاں کرتے رہتے تھے۔“

”سوال تو یہ ہے کہ سرفراز کیوں مارا گیا؟“

”ٹھہرو بتاتا ہوں!“ فریدی نے کہا اور گاڑی ایک پبلک ٹیلیفون بوتھ کے قریب روک دیا۔ حمید کو میٹھے رہنے کا اشارہ کرتا ہوا وہ نیچے اتر گیا۔ قریباً دو تین منٹ بعد ٹیلیفون بوتھ سے برآمد ہو کر پھر گاڑی میں آ بیٹھا۔

”ایک دلچسپ اطلاع.....!“ وہ حمید کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔

”میری دلچسپی کی چیز فی الحال اس لڑکی کے علاوہ اور کچھ نہیں جو مر جانے کے باوجود مجھے بور کیے جا رہی ہے۔“

”اسی کا قصہ ہے۔“

”جلد سے جلد سنا دیجئے!“ حمید مضطربانہ انداز میں بولا۔

”آج نوبے اس نے جو کال تمہیں کی تھی اس کا ٹیپ اس پولیس آفیسر کو سنایا گیا ہے کسی عورت نے فون پر کیفے دارا سے متعلق اطلاع دی تھی..... وہ پورے یقین کے ساتھ کہہ رہے کہ یہ آواز اسی عورت کی ہے!“

”خدا کی پناہ۔“

”کھیل دلچسپ معلوم ہوتا ہے!“ فریدی طویل سانس لے کر بولا۔ ”خیر تم نے پوچھا کہ سرفراز کیوں مارا گیا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسے قتل کیا گیا ہے تو اس کا مقصد یہی ہو گا کہ“

”آخر حالات میرا ہی پیچھا کیوں کرتے ہیں!“

”واقعی مجھے بھی حیرت ہے! تم اسی لیے تو بھاگ نکلتے تھے کہ اتوار کا دن اپنی مرضی سے گزار سکو.....!“

”آدی کو بھی اگر سرد خانے میں رکھا جا سکتا..... تو میں کم از کم پندرہ دن کے لیے ضرور نپاٹ ہو جاتا۔“

”جھک مارتے رہو.....! کیا فرق پڑتا ہے!“

”اس کی آواز میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی ہے!“

”کچ بچ بڑی دلکش آواز ہے!“ فریدی بولا۔

اب ان کی گاڑی شہر کے ایک پیچلرز بورڈنگ ہاؤز کے سامنے رکی۔

بورڈنگ ہاؤز کی منظمہ ایک معمر عیسائی عورت تھی۔

”ہمیں فاروق سے ملنا ہے.....!“ فریدی نے اس سے کہا۔

”کون فاروق؟“

”سے پول میں ہیڈ ویئر ہے!“

”اوہ..... وہ تو بہت بیمار ہے جناب! ہم نے اسے سول ہسپتال داخل کرا دیا ہے۔“

”کس وارڈ میں؟“

”جنرل وارڈ بیڈ نمبر تھرٹین!“

”کب داخل کرایا ہے؟“

”آج صبح..... اسے خون کی تے ہوئی تھی۔“

اب وہ سول ہسپتال کی طرف جا رہے تھے لیکن فاروق سے پوچھ گچھ کرنے کی دل ہی میں رہ گئی۔

وہ بھی دم توڑ چکا تھا۔

”اس نے خودکشی کی تھی یا کسی نے اسے زہر دیا تھا؟“ ڈاکٹر نے فریدی کو بتایا۔

وہ پھر بورڈنگ ہاؤز کی طرف پلٹے۔

”تم دشواری میں پڑ گئی ہو.....!“ فریدی نے منتظمہ سے کہا۔

”کیوں جناب؟“ وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

”فاروق مر گیا..... موت کی وجہ سے زہر خورانی بتائی گئی ہے!“

منتظمہ نے سینے پر کراس بنایا اور اپنی عافیت کی دعائیں مانگنے لگی۔ پھر کپکپاتی ہوئی

میں بولی۔ ”رات اس نے یہاں نہیں گزاری تھی..... صبح آیا تھا اور زینوں ہی پر اسے لے

گئی تھی.....! یہاں کے کئی کرایہ دار اس وقت موجود تھے.....!“

”خیر..... ہم اس کے کمرے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں!“

”آپ کون ہیں جناب!“

”پولیس!“

”خدا امن پسندوں کی حفاظت کرے.....!“ وہ طویل سانس لے کر بولی۔

”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں! ہمیں اس کے کمرے میں لے چلو۔“

کمرے میں پہنچ کر فریدی نے اس سے کہا۔ ”اب تم باہر جا سکتی ہو.....!“

پچلی گئی۔

”آپ یہاں کیا دیکھیں گے.....!“ حمید نے پوچھا۔

”وردی والا کوٹ جس میں بیچ لگایا جاتا ہے.....!“

اور وہ کوٹ جلد ہی مل گیا۔

”یہ دیکھو.....!“ فریدی نے کوٹ کے ایک پھٹے ہوئے حصہ کی طرف اشارہ کر کے

”بیچ یہیں تو لگایا جاتا ہے.....!“

”اوہ..... تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ یاسمین کا قاتل فاروق ہی تھا!“ حمید بڑبڑایا۔

”بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے! کسی کشکش کے دوران میں بیچ کوٹ سے اس طرح الگ ہوا

کہ کپڑا پھٹ گیا.....!“

اور پھر تھوڑی دیر کی کوشش کے بعد اسی کمرے سے ایک ایسا پستول بھی برآمد کر لیا گیا

جس کی نال پر سائینسرفٹ تھا اور میگزین میں ایک کارٹوس بھی کم تھا۔

قصہ طویل ہوتا جا رہا تھا۔ حمید نے ٹھنڈی سانس لی۔

پھر ڈھائی تین بجے تک وہ دونوں الگ الگ مصروف رہے تھے..... تین بجے کے

قریب حمید گھر پہنچا۔ اس کی بھاگ دوڑ کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ فاروق کی پچھلے دن کی نقل و حرکت

کے بارے میں کسی سے کچھ بھی نہ معلوم ہو سکا۔

تین دن پہلے اس نے ہوٹل سے ایک ہفتے کی چھٹی لی تھی۔ اس سے ایک دن قبل کیفے

دار پر چھاپہ پڑا تھا اور سرفراز کو پولیس نے روپوش قرار دے دیا تھا۔

گویا چھاپہ پڑنے کے ایک دن بعد فاروق نے چھٹی لے لی۔

چار بجے فریدی واپس آیا۔

”پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور میرے اندازے میں سرمو فرق نہیں۔ البتہ سرفراز کی موت

اس سے دو گھنٹے بعد واقع ہوئی تھی.....!“ اس نے کہا۔

”تو فاروق ہی یاسمین کا قاتل تھا.....!“

”اس کے سر سے برآمد ہونے والی گولی اسی پستول سے چلائی گئی تھی، جو فاروق کے

کمرے میں ملا تھا..... اس کے برخلاف جس گولی نے سرفراز کا خاتمہ کیا وہ اعشاریہ چار پانچ



کے رویہ اور سے چلائی گئی تھی.....!“

حمید خاموشی سے کافی پیتا رہا۔ وہ تو اسی لڑکی کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ بڑے انوکھے انداز میں ان جرائم کی نشاندہی کی تھی۔ آخر وہ کون تھی اور کیا چاہتی تھی۔

”اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فاروق کو زہر دینے والا کون تھا!“ فریدی اپنے انڈیلتا ہوا بولا۔ ”خودکشی کا امکان نہیں..... زہر اپنے ہی گھر پر کھا کر موت کا انتظار ہے..... کہیں اور کھا کر گھر کی راہ نہیں لی جاتی۔“

”وہ..... لال..... لڑکی.....!“ حمید ہکھلایا۔

”خدا تم پر رحم کرے.....!“

”کر ہی دے گا کسی نہ کسی دن!“ حمید نے ٹھنڈی سانس لی۔

”اس کی انگلیوں کے نشانات حاصل کر لیے گئے ہیں۔“

”کہاں سے؟“ حمید چونک پڑا۔

”وہیں سے جہاں اس نے اپنے جسم پر کچھڑ ملی تھی.....! ایک چٹان پر پوری ہاتھی چھاپ مل گئی ہے لیکن یہ نشانات یاسمین فریدیوں کی انگلیوں کے نشانات سے مختلف ہیں۔“

”کمال ہے؟ کیا میں سنجیدگی سے اسے کسی روح کا کارنامہ سمجھتا رہا ہوں!“ حمید بولا۔

”آپ کی رومان پسندی سے کچھ بعید نہیں!“

”لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ یاسمین کے میک اپ میں کیوں تھی!“

”تلاش کرو اور پوچھ لو.....!“

”ہو سکتا ہے فاروق کے سلسلے میں بھی وہی کچھ کر گزرے.....!“

”احقوں کی جنت سے نکل کر کام کے آدمی بنو!“

”کیا مطلب!“

”تیرھویں ٹیلیفون بوتھ کے آس پاس اسے تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ مجھے یقین ہے۔“

وہ آواز بدلنے کی صلاح دینے لگا۔ ”نہیں رکھتی اور اب تم اسے صرف آواز ہی سے پہچان سکو گے۔“

”یعنی اس کا مطلب یہ ہوا کہ ٹیلیفون بوتھ کے قریب کھڑا ہو کر ہر آتی جاتی لڑکی۔“

چھیڑوں جب وہ گالیاں دینا شروع کر دے تو اس کی آواز پہچاننے کی کوشش کروں!“

”جو طریقہ چاہو اختیار کرو..... مجھے اس سے غرض نہیں.....!“

”کینے دارا کے ملازمین سے بھی پوچھ گچھ تو کی ہی گئی ہوگی.....!“

”لیکن کوئی بھی نہیں بتا سکتا کہ منشیات کی کھپ کبہاں سے آئی تھی، جو بتا سکتا تھا وہ مار.....!“

”الایا.....!“

”یاسمین کیوں ماری گئی.....؟“

”ہو سکتا ہے وہ بھی کچھ جانتی ہو.....!“

”فاروق.....!“

”وہ کم از کم یہ تو بتا ہی سکتا کہ یاسمین کو کس نے قتل کرایا تھا.....!“

”سوال تو یہ ہے کہ یہ کشت و خون کیا محض اسی بناء پر ہوا ہے کہ منشیات کا اصل تاجر اپنی

ٹھنٹ کو چھپانا چاہتا ہے۔“

”اس سٹیج پر صرف قیاس ہی کیا جاسکتا ہے!“ فریدی بولا۔

”خیر..... ہو گا کچھ!“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”تو پھر مجھے اجازت ہے!“

”کیا مطلب!“

”نکل جاؤں اس لڑکی کی تلاش میں!“

”تمہارے لیے فی الحال یہی مناسب ہو گا!“ فریدی نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

لیکن حمید اس سے کوئی اثر لیے بغیر فراخ دلانہ انداز میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

گاڑی کے بجائے موٹر سائیکل نکالی تھی اور منتھوں میں وہ اسپرنگ فٹ کر لیے تھے۔

جن کے دباؤ سے نہ صرف ناک کی نوک اوپر اٹھ جاتی تھی بلکہ اوپری ہونٹ کی پوزیشن بھی

اس طرح بدل جاتی تھی کہ دانت نظر آنے لگتے تھے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ ٹیلیفون بوتھ کی نگرانی احقاقہ حرکت ہوگی کیوں نہ آس پاس کی کوشیوں

میں یہ دیکھا جائے کہ نئے موڈل کی مرسیڈیز گاڑیاں کہاں کہاں ہیں۔

ٹیلیفون بوتھ کی نگرانی کے لیے اس نے اپنے تین ماتحتوں کو طلب کر کے کہا۔

”اگر کوئی بے حد خوبصورت لڑکی یہاں فون کرنے آئے تو اس کا تعاقب کیا جائے۔“

”بے حد خوبصورت!“ ایک ماتحت نے پریشان ہو کر دہرایا۔



لڑکی نے اپنا منہ کھول دیا اور حمید کو ایسا محسوس ہوا جیسے خود اس کا دم گھٹ گیا۔  
لڑکی کے منہ میں زبان نہیں تھی۔

”اوہ.....! مجھے افسوس ہے!“ وہ ایک لخت ڈھیلا پڑ گیا۔

لڑکی اسکوٹر سے اتر کر ریت پر بیٹھ گئی اور اشارے سے کاغذ اور قلم مانگا۔

حمید پر ”انسانیت“ کا دورہ پڑ چکا تھا اس نے اپنی جیبی ڈائری سے دو تین ورقہ کیے اور فاؤنٹین پن سمیت اس کے حوالے کر دیئے۔  
لڑکی لکھنے لگی۔

”میں پیدا کنٹی طور پر زبان سے محروم ہوں..... کبھی کبھی مجھ پر دیوانگی کے دورے پڑتے ہیں۔ اس وقت بھی یہی ہوا..... تم بہت اچھے ہو کہ خود تم نے بدلہ لینے کی کوشش نہیں کی۔ کون ہو.....؟ مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ میں سن سکتی ہوں لکھ پڑھ سکتی ہوں..... آکسفورڈ بی۔ اے کیا تھا۔“

”فرنج بھی آتی ہے.....!“

حمید نے بڑے خلوص سے اپنا کارڈ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے کارڈ پڑھا۔  
ڈالی پھر ہونقوں کی طرح ایک نیک حمید کی طرف دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں حیرت تھی۔  
معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے اپنی بصارت پر یقین نہ آ رہا ہو۔  
پھر یک بیک چوکی اور لکھنا شروع کر دیا۔

”یقین نہیں آتا۔ تم تو بہت مشہور آدمی ہو..... بہت دلیر..... تمہاری زندہ دلی کے عجیب  
بہت قصے سن رکھے ہیں۔ کیا یہ ایک خوشگوار اتفاق نہیں ہے! لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم میرا تعاقب  
کیوں کر رہے تھے؟“

”تم سے گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ مجھے ایک سفید مرسیڈیز گاڑی اور ایک بے حد چالاک لڑکی  
کی تلاش ہے۔“

”میرے خاندان میں پانچ مرسیڈیز گاڑیاں ہیں..... اور پانچوں سفید ہیں۔“ اس نے لکھا۔

”اوہو.....!“ حمید جلدی سے بولا۔ ”بھلا سیونٹھ ہیون کے کینوں پر کون شبہ کر سکتا

ہے..... تیموری خاندان ملک کے معزز ترین خاندانوں میں سے ہے۔ میں نے اس لیے تمہارے

اب کیا تھا کہ موقع ملتے ہی جان پہچان پیدا کرنے کی کوشش کروں۔“  
”لیکن کیوں؟“ اس نے لکھا۔

”وہ لڑکی انہی اطراف میں کہیں رہتی ہے..... اور اس کے پاس نئے ماڈل کی سفید  
بنڈیز ہے۔ دراصل گاڑی کا نمبر معلوم نہ ہونے کی بناء پر یہ دشواری پیش آرہی ہے!“  
”کس سلسلے میں مطلوب ہے وہ لڑکی۔“ اس نے لکھا۔

”مجھے افسوس ہے کہ یہ نہ بتا سکوں گا..... سرکاری راز ہے!“

”لڑکی کا حلیہ بتاؤ.....!“

”سیاہ گھنگھریالے بال..... متناسب جسم..... رنگ سرخ و سفید آنکھیں غالباً براؤن ہیں۔“  
”کوئی اور خاص پہچان.....!“ اس نے لکھا۔

”اس سے زیادہ اور کچھ نہ بتا سکوں گا.....!“

وہ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہی پھر اس نے لکھنا شروع کیا۔

”ٹیلیگراف آفس کی پشت پر ایک کلب ڈانسروں کی رہتی ہے۔ کل میں نے اسے ایک  
میدمرسیڈیز میں دیکھا تھا۔ اس کے پاس گاڑی نہیں ہے لیکن روز ہی ایک نئی گاڑی میں نظر  
آئی ہے..... ہو سکتا ہے یہ گاڑیاں اس کے ملنے والوں کی ہوتی ہوں۔ وہ ایک اچھی رقاصہ اور

بیک اپ کی ماہر ہے اور میرا خیال ہے کہ چالاک بھی ہے.....!“

”چالاک نہ ہوتی تو روزانہ ایک نئی گاڑی میں کیسے دکھائی دیتی!“

”بہت بہت شکریہ! لیکن کل وہ کس وقت سفید مرسیڈیز میں دکھائی دی تھی۔“

”شاید ایک یا ڈیڑھ بجے کی بات ہے..... یاد اس لیے رہ گئی کہ سفید گاڑی اور سفید  
مہمات میں کوئی دیوی لگ رہی تھی.....!“

حمید اچھل پڑا..... اسے خجل دے کر نکل جانے والی بھی سفید ہی لباس میں تھی!

لڑکی لکھتی رہی۔ کبھی کبھی وہ محض اپنی چال ڈھال سے پہچانی جاسکتی ہے کیونکہ میک اپ  
سزلیعہ خود و خال میں تبدیلی کر لینے پر بھی قادر ہے۔

”کل وہ میک اپ میں تھی!“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں کل تو وہ نوٹی ہی لگ رہی تھی.....!“

”ہرگز نہیں! میں شراب نہیں پیتی..... کافی منگوا لو..... میرا خیال ہے کہ تم بھی شراب  
پیتے..... تمہاری آنکھیں بتاتی ہیں!“  
”تمہارا خیال درست ہے۔“

”ہاں! تمہارے چیف کرنل فریدی بھی نہیں پیتے!“  
”یہ بھی درست ہے۔“

”لیکن سیونٹھ ہیون میں شراب کی نہریں بہتی ہیں!“ لڑکی نے لکھا۔ ”میرا باپ شرابی  
ہے۔ میری ماں شرابی ہے..... بہر حال میرے علاوہ سب ہی پیتے ہیں۔ نابالغ افراد بھی  
مرف سے شوق کرتے ہیں۔ اگر کوئی ٹھنڈا پانی پیتا ہوا نظر آئے تو سمجھ لو کہ اسے ڈاکٹر نے  
بتایا ہوگا۔“

”کتنے افراد کا کنبہ ہے؟“

”سب مل کر تیس عدد..... دادا جان کہیں اور رہتے ہیں.....! مجھے حیرت ہے کہ تم نہیں  
جانتے..... کرنل فریدی تو میرے ایک چچا کے گھر سے دوستوں میں سے ہیں! کئی بار سیونٹھ  
ہیون میں آچکے ہیں!“

”مجھے علم نہیں!“ حمید بولا۔

”تفصیل کرنل سے معلوم کر لیتا..... کہاں تک لکھوں..... ہاتھ دکھ گیا۔ اب تم ہی بولتے رہو!“  
کافی آئی اور وہ کچھ دیر تک خاموشی سے شغل کرتے رہے۔

پھر حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”میں ابھی آیا۔ ذرا ایک ضروری کال کرنی ہے۔“

لڑکی نے سر کی جنبش سے گویا اسے اجازت دی تھی۔

وہ ہوٹل کی عمارت میں آیا اور فون بوتھ میں داخل ہو کر گھر کے نمبر ڈائل کیے۔

اتفاقاً فریدی گھر ہی پر موجود تھا۔

”ٹیلیگراف آفس کی پشت پر ایک رقاصہ نوبی رہتی ہے!“ حمید ماؤتھ پیس میں بولا۔

”اس کی نگرانی کرائیے.....!“

”تم کہاں ہو!“

”جہاں بھی ہوں زیادہ خوش نہیں ہوں، نوبی کی نگرانی کرائیے۔“

”کس مخصوص کلب کی ڈانسر ہے!“

”آج کل برتھا بورن میں رقص کرتی ہے!“ لڑکی نے لکھا۔

”واقعی میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ تم نے خاصی معلومات فراہم کر دیں۔“

”تم دل پھینک قسم کے آدمی ہو۔ کہیں خود ہی اس کے جال میں نہ پھنس جانا!“

”لکھا اور حمید ہنس کر بولا۔ ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ عرصہ ہوا دل کو سیف ڈپازٹ  
میں رکھوا چکا ہوں۔“

”سمندر کی سیر کا ارادہ ہو تو میری موٹر بوٹ موجود ہے!“ لڑکی نے کہا۔

”کیا مضائقہ ہے! چلو.....!“ حمید بے چون و چرا تیار ہو گیا۔

”لیکن تم مسلسل بولتے رہو گے۔ میرے ہاتھ تو اسٹیرنگ پر ہوں گے۔ میں لکھ نہیں

سکوں گی۔“

وہ حمید کی زندگی کی سب سے عجیب شام تھی۔ اس لڑکی کی خاموشی تھی یا ہزار زبانوں  
بیک وقت نغمہ ریز تھیں کسی گھلاوٹ تھی اس کی آنکھوں کی اداسی میں۔

حمید کہہ رہا تھا۔ ”اس وقت میں سب کچھ بھول گیا ہوں..... زندگی ایک بیکراں سند  
معلوم ہو رہا ہے۔ لہریں..... لہریں..... لہریں۔ ایک ہی بات بار بار دہراتی ہوئی لہرائیں۔“

لڑکی نے اپنے سر کو جنبش دی۔ جیسے پوچھ رہی ہو۔ ”کون سی بات؟“

موٹر بوٹ لہروں کا سینہ چیرتی ہوئی آگے بڑھی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ بیچ ہوٹل والے ساحل سے جا لگی۔

”تم نے بہت اچھا کیا کہ ادھر لے آئیں۔“ حمید بولا۔

”کیوں؟“ اس لڑکی نے ہاتھ کے اشارے سے سوال کیا۔

”کچھ دیر سکون سے بیٹھیں گے! تم بڑی اچھی دوست ثابت ہو سکتی ہو!“

وہ موٹر بوٹ سے اتر کر بیچ ہوٹل کے لان پر آ بیٹھے..... سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔

”کیا پیو گی!“ حمید نے اس سے پوچھا۔

”زبان نہ ہونے کی بناء پر ذائقے سے محروم ہوں کچھ بھی پلا دو!“ لڑکی نے لکھا۔

”شکر ہے!“

”بر تھا بورن کلب میں رقص کرتی ہے!“

”کس بات کا شبہ ہے اس پر!“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”شاید کل وہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق میک اپ بھی کر سکتی ہے!“

”تم اس وقت کہاں ہو؟“

”بچ ہوٹل میں!“

”اور کون ہے تمہارے ساتھ!“

”کوئی بھی نہیں.....!“

دوسری طرف سے یہ پوچھے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا گیا کہ وہ بوتھ نمبر تیرہ کی نگرانی کرتے بچ ہوٹل کیسے جا پہنچا۔

حمید کو لڑکی سے معلوم ہو چکا تھا کہ فریدی کے اس خاندان سے تعلقات ہیں اس لیے اس لڑکی کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ بے زبان ہونے کے باوجود بھی وہ دلکش اور دلپسند تھی اور وہ اس کے ساتھ مزید کچھ شامیں گزارنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر موٹر بوٹ میں آ بیٹھے..... اس بار حمید اسٹیز کر رہا تھا اور لڑکی سیٹ کی پشت گاہ سے ٹیک لگائے ادگھ رہی تھی۔

حمید اسے نکھیوں سے دیکھے جا رہا تھا..... بڑی عجیب بات تھی..... لڑکی کے چہرے پر ویسی ویرانی یا وحشت نہیں پائی جاتی تھی جیسی عموماً گونگے افراد کے چہروں پر ملتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس کی قوت سامعہ بہر حال برقرار تھی..... وہ اپنے گرد و پیش کا مکمل ادراک رکھتی تھی۔ تعلیم یافتہ بھی تھی۔

شہر پہنچتے پہنچتے رات کے آٹھ بج گئے..... آرکچو میں انہوں نے کھانا کھایا اور گیارہ بجے تک بال روم میں وقفے وقفے سے رقص میں حصہ لیتے رہے۔ لڑکی بہت سلیقے سے رقص بھی کر سکتی تھی۔

سو گیارہ بجے واپسی کی ٹھہری۔ لڑکی نے کاغذ کے ٹکڑے پر لکھا!

”آج کی شام بہت دنوں تک یاد رہے گی..... اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ پھر بھی

ماری ملاقات ہو سکے.....!“

”کیوں.....؟ بھلا ملاقات میں کیا دشواری ہو سکتی ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”صبح تک میں تمہیں بھول چکی ہوں گی.....!“ لڑکی نے لکھا۔ ”میرے لیے یہی بہتر

”ہے“ ماری دنیا کے مرد عورتوں کی زبان کا رونا روتے نظر آتے ہیں لیکن کوئی مجھ بے زبان

”بے ثباتی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔“

”ارے..... وہ تو!“ حمید کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”وہ مرد دراصل یہ چاہتے ہیں کہ

”صرف ان کی ہاں میں ہاں ملائی رہے۔ ان سے اختلاف نہ کرے۔“

”کچھ بھی ہو.....!“ لڑکی نے لکھا۔ ”زیادہ ملنے سے تعلقات بڑھتے ہیں پھر جدائی

”بانت نہیں ہو سکتی۔“

حمید کچھ نہ بولا۔ ایک بیک وہ اس کے لیے بے حد مغموم ہو گیا تھا۔

بارہ بجے کے قریب گھر پہنچا۔ فریدی موجود نہیں تھا لیکن ایک ملازم سے معلوم ہوا کہ کچھ

”فریدی کی کال آئی تھی اور اس نے کہا تھا کہ جیسے ہی حمید گھر پہنچے اسے دفتر بھیج دیا جائے۔

”دفتر..... اتوار کو بارہ بجے رات!“ حمید اچھل پڑا۔

اچھلتا یا سر کے بل کھڑا ہوتا..... دفتر تو جانا ہی پڑا تھا۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ فریدی فنگر پرنٹ سیکشن میں ہے۔

اور پھر جرب فریدی نے ایک مخصوص قسم کی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا تو

اسے اپنی عافیت خطرے میں نظر آنے لگی۔ یہ طنزیہ سی مسکراہٹ حمید کے احقانہ اقدامات کے

”بے خصوص تھی۔“

”نومی حراست میں لے لی گئی ہے! لیکن اسکی انگلیوں کے نشانات ان سے نہیں ملتے جو

”نہیل کے کنارے والی ایک چٹان پر ملے تھے.....!“ اس نے غلاف توقع نرم لہجے میں کہا۔

”سوال تو یہ ہے کہ آپ نے اسے.....!“ حمید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ یہاں دوسرے

”سائے کسی بحث میں نہیں الجھنا چاہتا تھا۔“

”فجولو.....!“ فریدی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اور پھر وہ اپنے آفس میں آئے تھے۔

”میں نے صرف نگرانی کے لیے کہا تھا!“ حمید بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”آپ سے بھلا کیا ہو سکا ہو گا!“  
 ”اس گاڑی کے ڈکے میں منشیات کے بڑے بڑے پیکٹ موجود تھے۔“  
 ”نہیں.....!“ حمید بوکھلا کر سیدھا ہو بیٹھا۔  
 ”لہذا اب بتاؤ اصل بات کیا ہے؟“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔  
 ”کیسی بات!“  
 ”ہوں!“ فریدی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر اس نے فون کا ریسیور اٹھا کر ماؤتھ

”خیر..... خیر..... لیکن نومی کے پاس گاڑی نہیں ہے۔“  
 ”اس کے باوجود ہر روز ایک نئی گاڑی میں دیکھی جاتی ہے..... ہفتے کو اس کے پاس کی شکل ہی نہیں دیکھی تھی۔“  
 ”نئے موڈل کی سفید مرسیڈیز تھی۔“  
 ”اب تم نے کام کی بات کی ہے؟ لیکن اس کی آواز بھی فون والی آواز سے مماثلہ نہیں اور مناسب جسم والی تھی۔“  
 ”بیٹھ جاؤ.....!“ فریدی نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔  
 ”اس نے چپ چاپ تعمیل کی لیکن اس کا سر جھکا ہوا تھا کسی سے آنکھ نہیں ملا رہی تھی۔“  
 ”ہفتے کو تمہارے پاس نئے موڈل کی سفید مرسیڈیز تھی۔“ دفعتاً فریدی نے سوال کیا۔  
 ”جی نہیں!“ کسکپاتی ہوئی آواز میں جواب ملا۔ ”یہی ٹویوٹا تھی.....!“  
 ”صرف یہی دو گاڑیاں تمہارے استعمال میں رہی ہیں!“  
 ”جی ہاں!“

فریدی نے حمید کی طرف دیکھا، جو اپنی بائیں کنپٹی سہلا رہا تھا۔ جھیل کے کنارے  
 بیوقوف بنانے والی نومی ہرگز نہیں ہو سکتی تھی..... اس کے بال سیاہ اور گھونگر لالے تھے..... لیکن  
 تو بھی اس لڑکی کے برابر نہیں تھا۔

تو پھر..... وہ بے زبان لڑکی.....؟ وہ بدستور کنپٹی سہلا سہلا کر اس کے بارے میں سوچتا  
 تھا..... اب وہ فریدی اور نومی کی گفتگو کی طرف متوجہ نہیں تھا۔  
 ”ان دونوں گاڑیوں کا مالک کون ہے؟“  
 ”میں صرف نیلی گاڑی کے مالک کو جانتی ہوں لیکن وہ مرچکا ہے.....!“

”آخر کس بناء پر!“ فریدی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔  
 ”مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ میک اپ میں خاصی دسترس رکھتی ہے اور پچھلے دن ایک  
 بجے کے قریب سفید مرسیڈیز میں دیکھی گئی تھی جسے وہ خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی اور منہ  
 میں بھی تھی.....!“  
 ”معلومات کس طرح حاصل کی تھیں.....!“

”تحریری رپورٹ پیش کر دوں گا!“ حمید بھنا کر بولا۔ وہ فریدی سے اس لڑکی کا  
 نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”میک اپ کر سکتی ہے تو آواز بھی بدل سکتی ہوگی۔“  
 ”نہیں.....! وہ آواز بدلنے کی صلاحیت نہیں رکھتی..... اتنا اندازہ بھی نہ کر سکوں تو کچھ  
 تجربات خاک کا ڈھیر ہی ثابت ہوئے۔“  
 ”سوال تو یہ ہے کہ پھر آپ نے کس بناء پر حراست میں لیا ہے۔“  
 ”بیٹھ جاؤ! تم نے پھر ایک بڑا میر مارا ہے.....!“  
 ”حمید طویل سانس لے کر آرام کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔“

”نومی کو خود میں نے چیک کیا تھا.....! وہ اپنے بنگلے سے نکلی تھی! اس وقت نیلے رنگ  
 کی گاڑی میں تھی..... وہ گاڑی اس نے ایروسیمنہ کے سامنے والے پارکنگ پلاٹ میں پارک  
 کی تھی اور ڈنٹا بلڈنگ میں چلی گئی۔ دس منٹ بعد وہاں سے برآمد ہوئی تو نیلی گاڑی نے  
 بجائے سفید گاڑی ٹویوٹا پر جا بیٹھی..... ٹویوٹا چلی تو اس کا رخ تار جام کی طرف تھا..... اب  
 میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اس گاڑی میں ضرور کچھ نہ کچھ ہے، لہذا وقت کیوں ضائع  
 جائے۔ گاڑی کو اوور ٹیک کر کے میں نے اسے رکنے پر مجبور کیا..... اور پھر جانتے ہو کیا ہوا.....“

”دیکھو کیا ہوتا ہے..... اس سے ابھی تک میں نے پوچھ کچھ نہیں کی۔“

”تو یہ ڈیوڈ غالباً وہی آدمی ہے جسے آپ نے طلب کیا ہے۔“

فریدی نے سرکواشتابی جنبش دی اور پُر تفکر انداز میں سگار کا گوشہ توڑنے لگا۔

کچھ دیر بعد مطلوبہ آدمی وہاں لایا گیا۔ اس کے ہاتھوں میں جھٹڑیاں تھیں۔

یہ ادھیڑ عمر کا ایک قد آور آدمی تھا۔ سر کے بال غائب تھے اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی

تھیں۔ لباس سے ذی حیثیت معلوم ہوتا تھا۔

”یہ ظلم ہے کرنل صاحب!“ وہ آفس میں داخل ہوتے ہی بول پڑا تھا۔ ”پتہ نہیں کس

نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔“

”بیٹھ جاؤ.....!“ فریدی نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے خشک لہجے میں کہا۔ ”بچی

بات اور نہ تم مجھے اچھی طرح جانتے ہو.....!“

”میں کچھ نہیں جانتا.....!“ وہ بیٹھتا ہوا بولا۔

”کیا نہیں جانتے.....!“

”اسی کے بارے میں کہ مجھے کیوں پکڑا گیا ہے۔“

”پھر تم نے یہی کیوں کہا تھا کہ کسی نے تمہیں پھنسانے کی کوشش کی ہے!“

”ظاہر ہے کہ آپ کسی شکایت کے بغیر تو اس قسم کے اقدامات نہیں کر سکتے!“

”کیا تمہیں اس سے انکار ہے کہ ٹرک نمبر R-318 تمہاری ملکیت نہیں ہے!“

”کیا اس سے کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے؟“ اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

”میرے سوال کا جواب دو!“

”جج..... جی ہاں..... وہ میرا ہی ٹرک ہے! لیکن ہوا کیا ہے؟“

”اے اس وقت کہاں ہونا چاہیے تھا؟“

”مگ..... گیراج میں جناب..... وہ کئی دن سے روڈ پر نکلا ہی نہیں مرمت میں ہے۔“

”تب پھر تم نے کیوں پوچھا تھا کہ کیا اس سے کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔“

”وہ کھسانی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”جب کسی ذی عزت آدمی کے ہاتھوں میں اچانک

جھٹڑیاں پڑ جاتی ہیں تو وہ اسی طرح نروس ہو جاتا ہے.....!“

”کون؟“

”کیفے دارا کا منیجر سرفراز..... اُسی نے مجھے اس کام پر لگایا تھا..... اب کوئی بات بہم

سے کیا فائدہ.....؟“

سرفراز کے نام پر حمید پھر چونکا اور ان کی طرف متوجہ ہو گیا نومی کہہ رہی تھی۔

فریدوں میری دوست تھی۔ اسی نے سرفراز سے ملوایا تھا۔ دونوں ہی ختم ہو گئے۔

اموات نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا..... اچھا ہوا کہ میں پولیس ہی کے ہاتھ لگی درزن کون جانے

میرا کیا حشر ہوتا.....!“

”منشیات تم تک کیسے پہنچتی تھیں!“ فریدی نے سوال کیا۔

”منشیات ڈنشا بلڈنگ کے قریب پہنچتی تھیں۔ میں گاڑی پارک کر کے ڈنشا بلڈنگ

ایک گوشے میں جاتی ہوں..... جہاں مجھے منشیات والی گاڑی کی کنجی رکھی ہوئی ملتی ہے اور

اپنے استعمال والی گاڑی کی کنجی وہاں رکھ کر منشیات والی گاڑی کی کنجی اٹھالیتی ہوں اور اپنا

گاڑی وہیں چھوڑ کر منشیات والی گاڑی لے نکلتی ہوں! تار جام والی سڑک پر ایک ٹرک مٹا ہے

اور میری گاڑی کی ڈگی خالی ہو جاتی ہے۔ میں اس گاڑی کو اپنے بنگلے میں لیے چلا آتا

ہوں..... کلب میں چونکہ میری ڈیوٹی گیارہ بجے شب سے تین بجے صبح تک ہوتی ہے۔ اور

لیے مجھے اس کام کا وقت مل جاتا ہے..... معاوضہ ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ اور گاڑی مفت۔ اور

تلخ سے ہنسی کے بعد خاموش ہو گئی۔

فریدی نے اپنے ماتحت کو اشارہ کیا کہ اسے لے جائے.....! حمید خاموش بیٹھا رہا۔

نومی کے چلے جانے کے بعد فریدی نے پھر فون کا ریسپور اٹھایا اور ماؤتھ پیس

بولا۔ ”ڈیوڈ کولاؤ.....!“ ریسپورر کہ حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

”تو کیا آپ نے اس ٹرک کو نظر انداز کر دیا جس پر نومی کی گاڑی سے منشیات

ہوتی تھی!“ حمید نے سوال کیا۔

”نہیں..... وہ بھی پکڑا گیا..... اور وہ جس تک پہنچاتا تھا وہ آدمی بھی اس وقت حراست

میں ہے۔“

”کیا وہی آخری آدمی ہے؟“

فریدی نے فون کا ریسور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں کہا۔ ”ٹرک ڈرائیور کو لاؤ!“  
حمید نے محسوس کیا کہ دفعتاً ڈیوڈ کا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہو گیا۔  
ڈرائیور لایا گیا۔ گھنی اور بے مرمت داڑھی مونچھوں میں اس کا چہرہ بڑا خوشگوار تھا۔ اس کے ہاتھوں میں بھی تھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔

”مم..... میں نہیں..... جانتا یہ کون ہے!“ ڈیوڈ ہکھلایا۔ ”میں سمجھا شاید آپ نے ہا ٹرک ڈرائیور کو بلوایا ہے۔“

”مجھے حیرت ہے ڈیوڈ کہ تم اپنے بھائی ولیم تھلارام کو نہیں پہچانتے کیسے ڈیوڈ تھلارام میں نے کچھ نہیں بتایا!“ ڈرائیور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

فریدی نے اپنے ماتحت سے کہا۔ ”اسکی مصنوعی داڑھی اور مونچھیں چہرے سے الگ کر دو۔ فوراً تعمیل کی مکیاور ڈرائیور میں ولیم تھلارام کا شائستہ سا چہرہ ظاہر ہو گیا۔ اب صورت سے خاصا سیدھا سادہ آدمی لگ رہا تھا۔ ڈیوڈ آنکھیں بند کر کے کرسی کی پشت گاہے نلک گیا۔ اس کا سینہ کسی لوہار کی دھونکی کی طرح پھول پچک رہا تھا۔

”تم دونوں سے صبح نپٹو گا۔“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا اور ماتحتوں کو اشارہ کیا کہ وہ انہیں لے جائیں۔ پھر حمید کی طرف مڑ کر بولا۔ ”اب تمہاری باری ہے فرزند.....!“

## فون نمبر

”میں نہیں سمجھا!“ حمید کا لہجہ جارحانہ تھا۔

”تمہاری ان معلومات کا ذریعہ اس لڑکی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔“

”میں آپ کے اس خیال کی تردید کرتا ہوں.....!“

فریدی براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ حمید ڈھٹائی سے جمارہا۔

”اسکی کوشش نہیں کی تھی۔“

”تمہارے چہرے پر چٹائی نہیں ہے۔“

”سچائی اتنی سستی نہیں ہے کہ چہروں پر ماری ماری پھرے۔“

”مجھ سے کچھ چھپا کر پچھتاؤ گے۔ شاید وہ آج پھر تمہیں جل دے گی!“

حمید کچھ نہ بولا۔ اب وہ بھی اس بے زبان لڑکی کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔

فریدی کچھ دیر بعد بولا۔ ”ہو سکتا ہے! منشیات کی غیر قانونی تجارت کرنے والے دو بڑے آپس میں ٹکرا گئے ہوں اور بات اس حد تک بڑھی ہو کہ ایک گروہ دوسرے گروہ کو پولیس کی نظر میں لانے کی کوشش کرنے لگا ہو۔“

”ہوں! تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس لڑکی کا تعلق اسی گروہ سے ہو سکتا ہے جو اس لیے میں پولیس کی رہنمائی کر رہی ہے۔“

”نی الحال اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچ سکتا۔“

حمید تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ ایک بے زبان لڑکی تھی!“

”خوب.....!“ فریدی مسکرایا۔

”یقین کیجئے!“ حمید نے کہا اور کھسپائے ہوئے انداز میں اپنی کہانی دہرانے لگا۔ اس کے خاموش ہونے پر فریدی بد تشویش لہجے میں بولا۔ ”اُس گھرانے میں کوئی ایسی لڑکی نہیں ہے۔ شہباز تیوری کی گیارہ عدد جوان پوتیاں ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی بے زبان نہیں ہے بلکہ سب ہی بے حد زبان دراز ہیں۔“

”لیکن وہ اسی عمارت سے برآمد ہوئی تھی!“

”میرے گھر سے اگر کوئی برآمد ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ وہیں کا کوئی فرد ہے۔“

”جنم میں جائے!“ حمید بھنا کر بولا۔ ”مجھے نیند آرہی ہے!“

”دفع ہو جاؤ.....! تم سے بھی صبح نپٹو گا!“

”کیا آپ استراحت نہیں فرمائیں گے.....؟“

”آپ ہی فرمائیں۔“ فریدی نے کہا اور اٹھ کر آفس سے نکل گیا۔

حمید نے شانوں کو جنبش دی اور جیب سے پائپ نکال کر اس میں تمباکو بھرنے لگا۔ نوی



”ہیرا اس گھرانے سے کوئی تعلق نہیں ہے جس کا ذکر میں نے کل کیا تھا۔“  
 ”لیکن تم برآمد تو وہیں سے ہوئی تھیں۔!“  
 ”محض اتفاق تھا۔۔۔۔۔ وہاں مجھے کوئی نہیں جانتا۔“

”پھر وہاں کیا کر رہی تھیں؟“

”کچھ معلومات فراہم کرنے گئی تھی۔۔۔۔۔!“

”اس وقت پور کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟“

”اتنی بے دردی سے بے مردتی کا مظاہرہ مت کرو۔۔۔۔۔ پچھلی رات تو تم مجھ پر قربان  
 بے جا رہے تھے۔۔۔۔۔!“

”محض اس لیے کہ تم پچھلی رات بے زبان تھیں۔۔۔۔۔ ذرا بتانا تو اس کی مشق کیونکر بہم  
 پہنچائی ہے!“

”بچپن ہی سے پریکٹس کرتی آئی ہوں! زبان کو اس طرح سمیٹتی ہوں کہ وہ نچلے جڑے

کا ایک حصہ معلوم ہونے لگتی ہے۔“

”اب کہاں اور کس شکل میں ملوگی۔“

”خدا جانے۔۔۔۔۔ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی!“

”سوال تو یہ ہے کہ تم نے اپنی زندگی ان خطرات میں کیوں ڈالی ہے!“

”اس لیے کہ میں اس درندگی کا خاتمہ چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ کیپٹن حمید کیا تم تصور کر سکتے ہو

ایزہ ماں کی پریشانیوں کا جس کا گیارہ سال کا بچہ ان موذیوں کا شکار ہو کر اس کی زندگی

نہ تار کیوں کا اضافہ کر رہا ہے۔۔۔۔۔ میں تمہیں دعوت دیتی ہوں آ جاؤ اور اپنی آنکھوں سے

”ایزہ!۔۔۔۔۔ ہمیں پورہ کی ترکاری گلی میں کھولی نمبر اٹھارہ پر آ جاؤ!“

”اوہو۔۔۔۔۔ مگر تمہیں اس کی پریشانیوں سے کیا سروکار تم اس مٹی سے تو نہیں بنیں۔ نئے

”نار کی سرسبز کاربھیم پورے کی ترکاری گلی میں کیوں جانے لگی۔“

”میں اپنے طبقے سے اس قدر متنفر ہوں کہ اس کا نام و نشان تک منادینا چاہتی ہوں۔“

”فلمی قسم کی نیکیوں کے ہوائی قلعے بنانے کی عادی معلوم ہوتی ہو!“

”کیپٹن حمید!“ غصیلے لہجے میں کہا اور پھر سلسلہ منقطع ہونے کی آواز آئی۔

والے انکشاف نے اس کی نیند غائب کر دی تھی۔۔۔۔۔ تو کیا وہ بے زبان لڑکی بچ بچا کر  
 گئی تھی۔ بے زبانی کا ڈھونگ اسی لیے رچایا تھا کہ اپنی آواز نہیں سنانا چاہتی تھی۔۔۔۔۔  
 زبان تھی ہی کہاں اس کے منہ میں۔

”ادنبہ۔۔۔۔۔! دیکھا جائے گا!“ وہ پائپ سلگائے بغیر اٹھتا ہوا بڑبڑایا۔

واپسی پر اسکے ذہن میں سیونٹھ بیوں کی گیارہ عدد جوان لڑکیاں بسی ہوئی تھیں۔ اس نے  
 کر لیا تھا کہ خود ہی اس راز سے پردہ ہٹائے گا۔ وہ کون تھی اور اس عمارت سے اس کا کیا تعلق تھا  
 دوسری صبح جلد ہی بیدار ہونا پڑا کیونکہ یہ چھٹی کا دن نہیں تھا۔ فریدی سے ناشتے کی  
 پر ملاقات نہ ہو سکی۔۔۔۔۔ ملازموں سے معلوم ہوا کہ وہ واپس ہی نہیں آیا تھا۔

آج کے کئی اخبار میز پر پڑے تھے۔ ان میں پچھلی رات والی گرفتاریوں سے متعلق  
 بھی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پریس رپورٹروں کے کان میں ان کی بھٹک بھی نہ پڑے۔  
 پائی ہو۔

ناشتے سے فارغ ہو کر دفتر پہنچا۔۔۔۔۔ فریدی آپریشن روم میں تھا۔ سیدھا وہیں چل گیا۔  
 فریدی اسی پر اسرار لڑکی کی آواز کا ٹیپ سن رہا تھا جو حمید سے فون پر بات کرتی رہی تھی۔

حمید کو اس نے گھور کر دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ اتنے میں ان کے آفس کے ایک آدمی  
 نے وہاں پہنچ کر اطلاع دی کہ فون پر حمید کی کال ہے۔

فریدی نے پھر اسے چھٹی ہوئی نظروں سے دیکھا لیکن خاموش رہا۔

حمید نے لا پرواہی ظاہر کرنے کے لیے شانوں کو جنبش دی اور آفس کی طرف چل پڑا  
 تھا۔ لیکن کال ریسو کرتے ہی آنکھوں میں تارے تاج گئے۔ پھر وہی لڑکی تھی۔ ”ہیلو“ کہنے پر  
 دوسری طرف سے کھٹکتی سی ہنسی سنائی دی تھی۔

”کل پھر تمہیں چوٹ ہو گئی۔۔۔۔۔ پیارے حمید صاحب!“ اس نے ہنسی کو برقرار رکھے  
 ہوئے کہا۔

”نہیں! تمہارا بہت بہت شکریہ! مزید تین شکار ہاتھ لگے ہیں!“

”تم جیسے زیرک آدمی کو بے زبانی کا یقین دلادینا کیا ایک بڑا کارنامہ نہیں ہے!“

”بیسویں صدی کی اس چوتھائی میں سب کچھ ممکن ہے!“ حمید خشک لہجے میں بولا۔

بچہ دیر بعد لیکن تار جام کی طرف اڑی جا رہی تھی.... فریدی کسی گہری سوچ میں تھا۔  
 ”ڈیوڈ بھی اس سامان کو آگے بڑھا دیتا ہے.... اس کے بعد کا اسے علم نہیں کہ وہ  
 لے جایا جاتا ہے۔“

”کیا وہ بھی کسی کے حوالے کرتا ہے؟“

”نہیں! ایک مخصوص جگہ پر رکھ دیتا ہے اور دوسری رات وہاں کچھ نہیں ہوتا!“

”ان تینوں کی گرفتاری کی خبر اخبارات میں نہیں آئی.... لیکن اس لڑکی کو علم ہے!“

”ہوں! تو اس نے تمہیں مبارک باد دی ہوگی!“

”کچھ اسی قسم کی بات تھی۔“

”پچھلی رات ساڑھے گیارہ بجے تک وہ تمہارے ساتھ ہی تھی اور اسی دوران میں وہ

نہیں گرفتار کر لیے گئے تھے!“

”شاید آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ لڑکی تنہا نہیں ہے!“

”یقیناً! ورنہ اسے کیونکر علم ہوتا!“

”آپ بدستور اس نظریے پر قائم ہیں کہ وہ کسی دوسرے گروہ سے تعلق رکھتی ہے!“

”جب تک اس نظریے کی نفی نہ ہو جائے قائم رہنا ہی پڑے گا!“

”آپ بار بار لڑکی کی آواز کا ٹیپ سن رہے ہیں!“

”ہوں! لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ان گیارہ لڑکیوں میں سے نہیں ہے؟“

”ہو سکتا ہے بارہویں کہیں اور پیدا ہوئی ہو!“

فریدی کچھ نہ بولا۔ حمید صرف اسی لڑکی کے بارے میں سوچے جا رہا تھا.... اسے بھی

بے بس جانا چاہئے تھا۔

دفعتاً اس نے کہا۔ ”لڑکی اس عمارت سے لا تعلق ہی سہی لیکن اس کے مکیںوں کے بارے

میں بہت کچھ جانتی ہے! شہباز تیموری کے کسی لڑکے سے آپ کے بہت اچھے تعلقات ہیں!“

”ہوں.... محمود تیموری.... ہم دونوں آکسفورڈ میں ایک ساتھ تھے!“

”وہ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ شہباز تیموری اس عمارت میں نہیں رہتا!“

”یہ بھی درست ہے اور اس کے گھر والے نہیں جانتے کہ حقیقتاً وہ کہاں رہتا ہے!“

حمید نے طویل سانس لے کر ریسور کریدل پر رکھ دیا اور مڑا ہی تھا کہ فریدی  
 ٹکراتے ٹکراتے بچا!

”ہوں! تو اس نے تمہیں یقین دلا دیا کہ کل وہ بے زبان لڑکی وہ خود ہی تھی!“  
 نے سرد لہجے میں کہا۔

”خواہ مخواہ میرے سر ہو رہی ہے!“ حمید بے زاری سے بولا۔

”اب کیا کہہ رہی تھی.....؟“

”وہی کہ منشیات کی تجارت کا خاتمہ چاہتی ہے.....! اور یقین دلانے کی کوشش کر

ہے کہ اس کا تیموری خاندان سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض معلومات حاصل کرنے وہاں گئی تھی۔

”اور کچھ.....!“

”بھیم پورہ کی ترکاری گلی میں کھولی نمبر اٹھارہ پر آنے کی دعوت دی ہے!“

”کیوں.....؟“

”منشیات کی اس ریل پیل کی تباہ کاری دکھانا چاہتی ہے! کسی بیوہ کے گیارہ سالہ

کا ذکر کیا تھا۔“

”کیا تم جانتے ہو کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے! ننھے ننھے مزدور بچوں کی دن بھر کی کمائی

کے جیبوں سے کھینچ لی جاتی ہے۔“ فریدی طویل سانس لے کر بولا۔

”میں جانتا ہوں!“

”لیکن جب تک آخری آدمی نہ پکڑا جائے یہ سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا.....! نوئی

ڈیوڈ.... ولیم.... یہ سب درمیانی لوگ ہیں.... بزنس ہیڈ کی نشاندہی نہیں کر سکتے، جو

کر سکتے تھے وہ مارڈالے گئے۔“

حمید کچھ نہ بولا! وہ سوچ رہا تھا شاید بھیم پورہ میں پھر اس سے ملاقات ہو جائے

فریدی اسے کہیں اور لے جانا چاہتا تھا۔

”چلو.... وقت کم ہے.... شاید ہم کچھ مزید معلومات حاصل کر سکیں۔“

”ڈیوڈ وغیرہ کیا رہا.....!“

”اطمینان سے بتاؤں گا.... تم اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دو!“

”کمال ہے.....!“

”اگر تم اسے دیکھ لو تو تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ ملک کے پانچ سب سے بڑے

داروں میں سے وہ بھی ایک ہے!“

”سینگ ہیں اس کے سر پر!“

”نہیں معمولی مزدوروں کی سی زندگی بسر کرتا ہے.....!“

”عوامی لیڈر بننے کی سوچ رہا ہوگا!“

”نہیں! اس نے اپنی کاروباری زندگی کی ابتداء ایک خوانچہ فروش کی حیثیت

تھی۔ اس حقیقت کو وہ آج تک نہیں بھولا۔ اس کی اولادیں سیونٹھ ہیون میں رہتی ہیں،

بچ جنت کا نمونہ ہے لیکن وہ خود دو کمروں کے ایک کوارٹر میں رہتا ہے.....!“

”ذاتی طور پر کبھی چوس معلوم ہوتا ہے!“

”سیونٹھ ہیون کی تعمیر پر تین کروڑ روپے صرف ہوئے ہیں۔“

”میں عمارت کو اندر سے دیکھنا چاہتا ہوں!“

”جب چاہو دیکھ سکتے ہو!“

”کیا آپ جانتے ہیں شہباز تیمور کہاں رہتا ہے!“

”اس کے بیٹوں کو نہیں معلوم لیکن میں جانتا ہوں!“

”اس کے درشن بھی کرا دیجئے.....!“

”ضرور..... ضرور.....!“

”لیکن اس وقت کہاں تشریف لے جا رہے ہیں!“

”ڈیوڈ کی بیوی سے ملوں گا کیونکہ اس کو اس راہ پر اسی نے ڈالا تھا!“

تار جام پہنچ کر لیکن ذی حیثیت لوگوں کی ایک بستی میں داخل ہوئی اور پھر ایک خانہ

کے سامنے رک گئی۔

گھور یا ڈیوڈ جوان العر تھی اور خاصی قبول صورت بھی۔ اس نے بڑی خوش اخلاقی

ان کا استقبال کیا۔

مگر جب فریدی نے اسے ڈیوڈ کی گرفتاری کی اطلاع دی تو اس کا موڈ یک لخت

پتین اسے سراسیمگی ہرگز نہیں کہا جاسکتا تھا۔ وہ تو غضبناک ہو گئی تھی۔

”ڈیوڈ کے بے شمار دشمنوں میں سے کسی نے بالآخر اس کے خلاف پولیس سے ساز باز

زنی لی۔“ پہلا جملہ اس کی زبان سے یہی نکلا تھا۔

”اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے!“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔

”پولیس تو بے گناہوں سے بھی اعتراف جرم کرا لیتی ہے!“

”ہوسکتا ہے!“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔

”میں اپنے وکیل کی عدم موجودگی میں کسی قسم کی بھی گفتگو نہیں کروں گی!“

”آپ کی مرضی۔“

وہ اٹھ کر فون کی طرف بڑھی اور کسی کے نمبر ڈائل کر کے کہا۔ ”میں گھور یا ڈیوڈ بول رہی

ہوں! کسی غلط فہمی کی بناء پر ڈیوڈ حراست میں لے لیا گیا ہے۔ یہاں اس وقت محکمہ

مافنسائی کے دو آفیسر موجود ہیں! براہ کرم آپ جلد پہنچئے!“ پھر وہ کچھ سنتی رہی اور ”او۔ کے“

کہہ کر ریسور رکھ دیا۔

”آخر اسے کس بناء پر گرفتار کیا گیا ہے!“ اس نے کچھ دیر بعد فریدی سے پوچھا۔

”اب وکیل کو آ ہی جانے دیجئے.....!“ فریدی نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

”آپ کی مرضی۔“ گھور یا نے لاپرواہی سے کہا۔

شاید چندہ منٹ بعد ایک دبلا پتلا اور دراز قد آدمی ڈرائنگ روم میں داخل ہوا..... فریدی

تہید سے مصافحہ کر کے وہ گھور یا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں کچھ بھی نہیں جانتی، انہی حضرات سے پوچھئے!“ وہ نوار دے بولی۔

”میں مسٹر تھارام کا قانونی مشیر ہوں!“ نوار دے نے اپنا وزینگ کارڈ فریدی کی طرف

دھاتے ہوئے کہا۔

”ڈیوڈ پر الزام ہے کہ وہ منشیات کی غیر قانونی تجارت میں ملوث تھا۔“

”اوہ!“ وکیل نے پھر گھور یا کی طرف دیکھا۔

”میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں جانتی.....!“

”لیکن ڈیوڈ نے آپ کے سلسلے میں بھی ایک اعتراف کیا ہے!“ فریدی بولا۔

”میرے بارے میں!“ وہ چونک پڑی اور پھر اسی وقت اپنی جگہ سے ایک ذرا

اچھل کر فرش پر آ رہی..... اس کی بائیں کینٹی سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا۔

حمید نے فریدی کو بائیں جانب والی کھڑکی کے باہر چھانگ لگاتے دیکھا اور وہ

اسی طرف دوڑ گیا۔

عمارت کے اس بازو میں دیوار سے آٹھ فوٹ تک کیاریوں کی قطار تھی اور اس

آگے دور تک مالٹی کی بے ترتیب جھاڑیاں پھیلتی چلی گئی تھیں۔

حمید نے فریدی کو انہی جھاڑیوں میں گھستے دیکھا تھا..... وہ بھی کھڑکی سے باہر چھان

لگانے والا تھا لیکن پھر اسے عقل آ گئی اور اس نے محسوس کیا کہ نووارد وکیل وہاں سے کھٹے

فکر میں ہے۔

حمید نے بغلی ہولسر نکالتے ہوئے کہا۔ ”ٹھہرو!“

وکیل بوکھلا کر اس کی طرف مڑا۔

”کک..... کیا مطلب.....!“ وہ اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتا ہوا بھلایا۔

”میں نے آج تک کسی وکیل کو موقع واردات سے فرار ہوتے نہیں دیکھا۔“

”ڈڈ..... ڈاکٹر.....!“

”وہ مر چکی ہے وکیل صاحب! ذرا غور سے دیکھئے..... ڈاکٹر اب کیا کر سکتے گا۔ براہ

بیٹھ جائیے۔“

”لیکن آپ کا رویہ جناب.....!“ وہ ریوالور کی طرف دیکھتا ہوا بھلایا۔

”بیٹھ جائیے!“ حمید کا لہجہ سخت تھا۔

وہ اسے گھورتا ہوا بیٹھ گیا۔

”آپ نے گوریلا کی کال کی اطلاع کسے دی تھی!“

”مم..... میں نہیں سمجھا.....!“

”کچھ دیر پہلے اس نے فون کر کے آپ کو طلب کیا تھا..... لہذا یہاں آنے سے قبل آپ

نے کس کو مطلع کیا تھا.....!“

وکیل کے چہرے پر زردی پھیل گئی لیکن پھر وہ فوراً ہی سنبھلا لے کر بولا۔ ”آپ

نے کس کو مطلع کیا تھا.....!“

وکیل کے چہرے پر زردی پھیل گئی لیکن پھر وہ فوراً ہی سنبھلا لے کر بولا۔ ”آپ

نے کس کو مطلع کیا تھا.....!“

وکیل کے چہرے پر زردی پھیل گئی لیکن پھر وہ فوراً ہی سنبھلا لے کر بولا۔ ”آپ

نے کس کو مطلع کیا تھا.....!“

”خوب.....!“

”عورت نے انہیں طلب نہیں کیا تھا۔ یہ اتفاقاً دھرنکل آئے تھے۔“ حمید نے اضافہ کیا۔

”تیسری اہم ترین اطلاع فی الحال میں خود ہی محفوظ رکھوں گا۔“ فریدی وکیل کی دیکھتا ہوا مسکرایا۔

”آپ لوگ مجھے کسی معاملے میں الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں!“ وکیل بول پڑا۔  
”اب تمہارے لیے حوالات ہی مناسب رہے گی ورنہ تم بھی اسی طرح مار ڈالے گے!“ فریدی نے خشک لہجے میں کہا۔

”نک..... کیا مطلب!“

”شاید تین سال پہلے کا کوئی واقعہ مجھے دہرانا پڑے گا..... مسٹر باری.....!“

”مم..... میں نہیں سمجھا!“ وکیل پھر زرد پڑ گیا۔

”تم لاگرجوٹ نہیں ہو.....!“ تین سال قبل مشرقی صوبے میں تم پر اس سلسلے پر

مقدمہ چلا تھا اور تم وہاں سے فرار ہو کر ادھر چلے آئے تھے۔

”نن..... نہیں.....!“

”خود کو زیر حراست سمجھو مسٹر باری.....!“

وہ کرسی کی پشت گاہ سے نک گیا۔ اس کی پیشانی پر ننھی ننھی بوندیں پھوٹ آئی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد تار جام کا اسٹیشن انچارج اپنے چند ماتحتوں سمیت وہاں پہنچ گیا۔

ضابطے کی کارروائی کے بعد فریدی نے وکیل سے کہا۔ ”آپ میرے ساتھ چلیں گے“

مسٹر باری.....!“

وہ کچھ نہ بولا..... ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔

واپسی کا سفر خاموشی سے گزرا..... وکیل کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں ڈالی گئی تھیں۔“

حمید کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھا اس طرح ہانپ رہا تھا جیسے دے کا مریض ہو۔

آفس پہنچ کر..... فریدی نے ڈیوڈ کو طلب کیا۔ وہ آیا اور جیسے ہی وکیل پر نظر پڑا

ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

”فریدی نے اس سے کہا اور وہ وکیل کو گھورتا ہوا بیٹھ گیا۔“

”بیٹھ جاؤ.....“

”تمہارے لیے ایک بڑی خبر ہے!“

”اس کے بعد..... وہ اپنی ہتھکڑیوں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔“

”دنیا کی کوئی خبر میرے لیے“

”جہاں ہی قتل کر دی گئی!“

”نہیں.....“ وہ بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

”ہم تینوں کی موجودگی میں!“ فریدی، حمید اور وکیل کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

فریدی نے اسے بتایا کہ کس طرح ان کے وہاں پہنچنے پر گلوریانے وکیل کو طلب کیا

اور گفتگو کے دوران میں ایک بے آواز فائر کا نشانہ بن گئی تھی۔

”اب یہی شخص بتا سکے گا کہ اس کا قاتل کون ہے؟“ ڈیوڈ وکیل کی طرف دونوں ہاتھ

مار چینا۔

”میں نے غلط تو نہیں کہا تھا مسٹر باری!“ فریدی نے وکیل کو مخاطب کیا۔ وہ خشک

ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

”وہ شاید نہ جانتی ہو..... لیکن یہ جانتا ہے کہ اس تجارت کی پشت پر کون ہے.....؟“

”گلوریا کو حقیقتاً اسی نے اس بزنس پر آمادہ کیا تھا۔“

”مم..... میں..... اس بزنس کا مالک نہیں!“ وکیل ہکلا یا۔

”میں نے تم پر ایسا کوئی الزام عائد نہیں کیا!“ فریدی نرم لہجے میں بولا۔

”میں بردستی اس میں جھوٹکا گیا تھا..... میں بھی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔ اس نے مجھے

بیک سیل کر کے اس گندے بزنس میں شریک کیا تھا۔“

”ہو سکتا ہے!“

”اور گلوریا ڈیوڈ ہی اس بلیک میلنگ کے لیے میرے اور اس کے درمیان رابطے کا

فریدی ہی تھی..... یہ غلط ہے کہ میں نے اسے ورغلا یا تھا۔“

”پوری کہانی مسٹر باری!“ فریدی اسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

”مشرقی صوبے سے فرار ہو کر یہاں آیا تھا اور تہیہ کر لیا تھا کہ اب کوئی اور پیشہ اختیار

بدجرت سے آنکھیں پھاڑے سیاہ، سنہری اور براؤن زنانہ وگول کو گھورے جا رہا تھا۔

## عجیب آدمی

لرم ایڈووکیٹ باری نے جو فون نمبر دیا تھا وہ ٹیلیفون ڈائریکٹری میں اسی پتے کے موجود تھا لہذا اس سلسلے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ باری نے غلط بیانی سے کام لیا ہوگا۔

بڑوں کے دونوں گواہوں نے بتایا کہ بنگلہ زیادہ تر مقفل رہتا ہے۔ کبھی کبھی ایک معمر آدمی وہاں آتی ہے کچھ دیر تک قیام کرتی ہے اور چلی جاتی ہے۔

”بے حد چالاک آدمی معلوم ہوتا ہے!“ فریدی بڑبڑایا۔

”ظاہر ہے؟ اتنا بدھو ہرگز نہ ہوگا کہ آسانی سے پکڑا جاسکے!“ حمید بولا۔

”یہ مس فوزیہ شیخ مختلف قسم کے وگ بھی استعمال کرتی ہے.....!“

”کیا تم اس لڑکی کے امکانات پر غور کر رہے ہو!“

”یہ سیاہ وگ تو بالکل ویسی ہے جیسے اس لڑکی کے بال تھے.....!“

”اور بے زبان لڑکی سنہرے بالوں والی تھی!“ فریدی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

حمید کچھ نہ بولا۔ وہ اب بھی بھیم پورے والی کھولی کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

وہاں سے واپسی پر ٹیلی فون ایکسچینج سے رابطہ قائم کیا گیا لیکن بے سود، اس فون نمبر کا

بجز صرف کالوں کے بارے میں بتا سکتا تھا اس جگہ کی نشان دہی نہیں کر سکتا تھا جہاں سے وہ

فون استعمال کیا جا رہا تھا۔

”کہیں! وہ انشورمنٹ ٹارجام ہی کے کسی مکان میں نہ موجود ہو!“ حمید نے اپنی رائے

غائب کی۔

”ہو سکتا ہے!“ فریدی آہستہ سے بولا۔

حمید محسوس کر رہا تھا کہ گھوریا کے قتل نے اسے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا ہے۔ ظاہر ہے

کروں گا..... نام بھی بدل دیا تھا۔“

”تمہارا اصل نام عبداللہ سعادت علی ہے.....!“

”جی ہاں.....! اچانک ایک دن گھوریا نے مجھے راہ چلتے روکا اور اس بلیک میلر نے پہنچایا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر اس کے کہنے پر میں نے عمل نہ کیا تو میرا راز فاش کر جائے گا۔ بہر حال اس نے مجھے مجبور کیا کہ میں وکالت ہی کا پیشہ جاری رکھوں۔ پریکٹس کرنا کا اجازت نامہ بھی اسی نے فراہم کیا تھا۔“

”میں سمجھ گیا۔“ فریدی سر ہلا کر بولا۔ ”اس وقت تم نے کسے اطلاع دی تھی کہ گھوریا ڈیوڈ خطرے میں ہیں۔“

”میں نام نہیں جانتا..... ایسے مواقع کیلئے مجھے ایک فون نمبر دیا گیا تھا۔“

”اس پر لکھ دو.....!“ فریدی نے کاغذ اور قلم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

فون نمبر شہر ہی کا ثابت ہوا اور یہ فون اپر کلاس ہاؤسنگ سوسائٹی کے ایک بنگلے کا تھا۔

بنگلہ کا سرچ وارنٹ حاصل کر کے وہ ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔

”کیا وہ شخص چھلوا تھا جس نے گھوریا پر فائر کیا تھا.....!“ حمید بڑبڑایا۔

”مجھے خود بھی حیرت ہے کہ اتنی جلدی کہاں غائب ہو گیا تھا۔“

”سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اتنی بڑی عمارت میں گھوریا بالکل تنہا تھی۔ کوئی ملازم

بھی اس کے پاس نہ تھا۔“

”اس ٹائپ کے مجرم بہت محتاط ہوتے ہیں۔“

مطلوبہ بنگلے کے قریب فریدی نے گاڑی روکی۔ عمارت مختصر سی لیکن خوبصورت تھی اور

گیٹ مقفل تھا۔ گیٹ پر لگی ہوئی نیم پلیٹ پر ”مس فوزیہ شیخ“ تحریر تھا۔

”بہت خوب!“ فریدی بڑبڑایا۔

مناسب کارروائی کے ساتھ گیٹ کا قفل توڑا گیا..... دو گواہ بھی موجود تھے۔

پہلی بات تو یہ نظر آئی کہ اس بنگلے میں سرے سے فون ہی موجود نہیں تھا..... پول سے

فون کی لائن بھی بنگلے تک نہیں آئی تھی۔

اور دوسری اہم بات یہ تھی کہ میک اپ کے سامان اور فرنیچر کے علاوہ وہاں اور کچھ بھی نہیں

کہ وہ قتل اسی کے سامنے ہوا تھا اور وہ قاتل پر ہاتھ نہیں ڈال سکا تھا۔

اچانک وہ اٹھا اور آفس سے باہر نکل گیا۔ حمید نے طویل سانس لی۔ فریڈک انداز سے بخوبی واقف تھا..... اب شاید تب ہی اس کیس کو پنپانے کی کوشش کرے۔

حمید اب قطعی آزاد تھا لہذا اس نے بھیم پورے کی طرف دوڑ لگائی..... ترکاڑی اٹھارویں کھولی تک پہنچنا کوئی دشوار کام نہیں تھا۔ لہذا اسے اپنی گاڑی سڑک ہی پر چڑھ

پڑی تھی..... بھیم پورے کی گلیاں اتنی تنگ تھیں کہ تین آدمی برابر سے نہیں چل سکتے تھے۔ اٹھارویں کھولی کے سامنے پہنچ کر وہ رک گیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اب اسے کیا ہے۔ کس بہانے کھولی کے مکین سے ملے اور ان سے کس قسم کی گفتگو کرے۔

دفعتاً دروازے سے ناٹ کا پردہ ہٹا اور ایک میلی کچیلی جوان العر عورت نکل کر ا

طرف بڑھی۔

”آپ حمید صاحب ہیں.....!“ اس نے پوچھا۔

”ہاں..... آں.....!“

اس نے اپنے بلاؤز کے گریبان سے ایک لفافہ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

”یہاں سے فوراً چلے جائیے!“

حمید نے لفافہ اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر جیب میں رکھا اور تیز رفتاری سے گلی کی کافلی ہوں۔“

دوسرے سرے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

پھر چکر کاٹ کر اپنی گاڑی تک پہنچا تھا..... گاڑی میں بیٹھ کر لفافہ چاک کیا لیکن

میں سے سادہ کاغذ کے علاوہ اور کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔

”کہیں اب اس کا دماغ تو نہیں چل گیا!“ وہ برا سامنے بنا کر بڑبڑایا۔

دل تو چاہا تھا کہ پھر ترکاری گلی کی طرف پلٹ جائے..... لیکن عورت کا چہرہ یاد آ

جس میں خوفزدگی کا عنصر بھی شامل تھا۔

”جنہم میں جائے!“ اس نے سر جھٹک کر گاڑی اسٹارٹ کی اور منزل کا تعین کیے بغیر

چل پڑا۔

اس بھاگ دوڑ میں دن کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوا تھا..... اور اب تو گویا بھوک مری گئی

لیکن چائے کی طلب نے جلد ہی اسے کسی اچھے ریسٹوران کی تلاش پر مجبور کر دیا۔ پھر اسے محسوس ہوا جیسے اس کا تعاقب کیا جا رہا ہو۔ وہ ایک خستہ حال چھوٹی فیٹ گاڑی

اسے ایک خستہ حال بوڑھا ڈرائیور کر رہا تھا۔ حمید نے اپنی گاڑی بالآخر سے پول ہوٹل کے کپاؤنڈ میں موڑ دی۔ فیٹ بھی اس کے

نی کپاؤنڈ میں داخل ہوئی تھی۔ حمید گاڑی پارک کر کے ڈائمنڈ ہال میں آیا لیکن وہ

مے کے داخلے سے بھی بے خبر نہیں تھا۔

دیے اسے توقع نہیں تھی کہ وہ سیدھا اسی کی میز کی طرف آئے گا۔

”میں اجازت لیے بغیر تمہاری ہی میز پر بیٹھوں گا۔“ بوڑھے نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

اس کے سر کے بال برف ہو رہے تھے لیکن اعضاء کی مضبوطی کی بناء پر عمر کا صحیح اندازہ

لانا دشوار تھا۔ چہرے سے بھی خاصی توانائی ظاہر ہوتی تھی۔

”ضرور..... ضرور.....!“ حمید نے سرد لہجے میں کہا۔

بوڑھا کرسی کھینچ کر اسکے سامنے بیٹھ گیا اس کی قمیض میلی تھی اور خاکی پتلون بھی کریز سے

بنا پڑی تھی۔ وہ چند لمحے حمید کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ”لاؤ..... وہ خط میرے حوالے کر دو.....!“

”کیسا خط.....!“ حمید نے آنکھیں نکالیں۔

”نکالو ورنہ ہڈیاں توڑ دوں گا..... بوڑھا نہ سمجھنا! تم جیسے بنا سستی جوانوں کے لیے اب

”میں بوڑھوں کا احترام کرتا ہوں، خواہ وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں!“

”میں خط مانگ رہا ہوں۔“

”آپ ہیں کون.....؟“

”تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے! نکالو خط.....!“

حمید اپنا سر سہلانے لگا..... سوچ رہا تھا کہ اس نامعقول لڑکی نے پھر کسی دشواری میں

خدا سمجھے۔

”کیا سن نہیں رہے.....!“ بوڑھے نے پھر تقاضا کیا۔

”ایسی بھی کیا جلدی ہے! آپ بھی چائے پیجئے..... یا کافی پسند کریں گے!“

”قبل میں نے اس عورت کی شکل تک نہیں دیکھتی تھی!“  
 ”پیدا کرنے والے کی قسم کھا سکتے ہو!“  
 ”گلے گلے..... پانی میں!“  
 ”کھاؤ قسم.....!“

”قسم ہے پیدا کرنے والے کی جس عورت سے مجھے لاف ملا ہے میرے لیے قطعی اجنبی تھی!“  
 ”اب اگر تم نے جھوٹی قسم کھا لی ہے تو تم خود بھگتو گے..... میں نے تو اعتبار کیا۔“  
 بڑھے نے کہا اور اٹھ کر صدر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

حمید کاؤنٹر کی طرف لپکا، جہاں منیجر کھڑا تھا۔  
 ”یہ بوڑھا کون تھا.....!“ اس نے اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔  
 ”آپ نہیں جانتے!“ منیجر نے حیرت سے کہا۔  
 ”نہیں.....!“

”بہت بڑا آدمی ہے، شہباز تیموری!“  
 ”اوہ.....!“

اور پھر اس نے صدر دروازے کی طرف دوڑ لگائی تھی۔  
 بوڑھا آدمی اپنی گاڑی میں بیٹھ ہی رہا تھا کہ اس نے اسے جالیا۔  
 ”اب کیا ہے!“ وہ اسے گھورتا ہوا بولا۔

”میں معافی چاہتا ہوں جناب.....!“ حمید بولا۔ ”مجھے آپ سے ملنے کا بید اشتیاق تھا!“  
 ”اچھی بات ہے تو بیٹھ جاؤ..... میری گاڑی میں! اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دو!“  
 ”بہت بہتر!“ حمید نے کہا اور دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اس کے برابر ہی بیٹھ گیا۔  
 ”اب بتاؤ..... تم حقیقتاً کیا چاہتے ہو.....!“ بوڑھا کچھ دیر بعد بولا۔

”سیونٹھ بیون کی سیر کرنا چاہتا ہوں!“  
 ”اوہ! لیکن کیوں.....؟“

”سنا ہے..... بڑی شاندار جگہ ہے.....!“  
 ”اتقوں کی جنت.....!“

”دیکھو صاحبزادے مجھے غصہ نہ دلاؤ.....!“  
 ”سوال تو یہ ہے کہ آپ کو کسی ایسے خط سے کیا سروکار جو میری ذات سے تعلق رکھ“  
 ”اپنی بد ذات کہو.....!“

”کیا مطلب!“ حمید کی کھوپڑی پھر گرم ہو گئی۔  
 ”اپنے طبقے کی سوسائٹی گزرتی ہی تک محدود رہو!“  
 ”بڑے میاں تم پتہ نہیں کیا سمجھ رہے ہو!“

دفعۃً حمید نے دیکھا کہ مے پول کا منیجر اس کی میز کی طرف دوڑا آ رہا ہے۔  
 اس نے طویل سانس لی۔ اسے یقین تھا کہ اب یہ نامناسب لباس والا بوڑھا انا  
 یہاں سے نکال دیا جائے گا۔

لیکن یہ کیا.....؟ منیجر تو اسے جھک کر سلام کر رہا تھا۔  
 ”جاؤ تم اپنا کام دیکھو.....!“ بوڑھے نے جھنجھلا کر اس سے کہا۔  
 ”کیا پیش کروں..... جناب.....!“ منیجر لکھیا یا۔  
 ”کچھ نہیں..... جاؤ.....!“

منیجر چپ چاپ چلا گیا۔ حمید حیرت سے بوڑھے کو گھورے جا رہا تھا۔  
 ”نکالو خط.....!“ بوڑھا میز پر ہاتھ مار کر بولا۔

”دیکھئے جناب۔ آپ تہذیب کی حدود سے گزر رہے ہیں!“  
 ”میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی تہذیب پر جو دوسروں کی عورتوں پر ڈاکے ڈالتی ہو!“  
 ”وہ کس کی عورت تھی.....!“

”میری.....! وہ میری بیوی تھی! لڑ جھگڑ کر علیحدہ ہو گئی ہے، لیکن میں اسے برداشت  
 نہیں کر سکتا کہ وہ کسی اور سے تعلق قائم کرے۔ البتہ طلاق حاصل کر لینے کے بعد وہ قطعی آزاد  
 ہوگی!“

”اتنی نوجوان عورت آپ کی بیوی ہے!“

”بکو اس مت کرو۔ تمہیں اس سے کیا سروکار!“

”اچھا تو سنئے..... وہ خط کسی اور کا ہے، جو آپ کی بیوی کے توسط سے مجھ تک پہنچا“



”مجھے بھی اس پر حیرت ہے جناب!“

”میری مرضی.....! جو میرا دل چاہے گا کروں گا..... کسی کو اس سے کیا سروکار لیکن اس نفع کے بعد سے سوچنا پڑا ہے کہ ان بد بختوں میں سے کوئی مجھے ذلیل کرنا چاہتا ہے۔“

”میں نہیں سمجھا!“

”میرے پانچ بیٹے ہیں..... انہی میں سے کوئی..... وہ مجھے اس لیے گھٹیا سمجھنے لگے ہیں کہ میں نے ان کے لیے جنت تعمیر کرادی ہے۔“

”گستاخی معاف..... آپ نے بھی تو کمال کر دیا ہے۔ کیا یہ محترمہ ظنی آپ ہی کے طبقے کی کوئی خاتون ہیں۔“

”میرا کوئی طبقہ نہیں ہے.....! میں اس نظام کی شہ رگ ہوں! میرا سرمایہ لاکھوں کے لیے روزگار فراہم کرتا ہے اور بس.....! مجھے اس پر شرمندگی ہے کہ میں نے ان نالائقوں کے لیے نیک و احتشام کے اسباب فراہم کیے..... مجھے شروع ہی سے یہ سوچنا چاہیے تھا کہ ان لاکھوں آدمیوں کی محنت میرے لیے بھی دو وقت کی روٹیاں مہیا کر دیتی ہے..... وہ میرے محسن ہیں۔ ان کے مقابلے میں میری اولاد میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں!“

”آپ حیرت انگیز ہیں جناب!“

”چائے پیو گے یا کافی..... آج کل میں خود ہی باورچی خانہ سنبھالتا ہوں۔ میں اس سے بہتر حالت میں نہیں رہنا چاہتا جس میں میرے مزدور رہتے ہیں!“

”تکلیف نہ کیجئے۔“

”نہیں چائے تو پینی ہی پڑے گی۔ تم جب بھی مجھ سے ملنا چاہو مل سکتے ہو! صبح دس بجے سے ڈھائی بجے تک اپنے آفس میں ملتا ہوں اور اس کے بعد یہاں..... سیونٹھ بیون تم ٹیڈی کے ساتھ بھی جاسکتے ہو! وہ محمود کے دوستوں میں سے ہے! دراصل اب میں وہاں قدم نہ بٹھائی پسند نہیں کر سکتا..... اب وہ عمارت مجھے ٹھنڈا جہنم معلوم ہوتی ہے.....! اندر داخل ہونے سے بعد تم خود بھی یہی محسوس کرو گے۔“

”ٹھنڈا جہنم کی بھی خوب رہی!“

”ہاں اس کے مکیں یکسانیت اور بوریت کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں..... کامل ست اور کا

”کمال ہے! یہ آپ کہہ رہے ہیں..... یعنی اس کے خالق.....!“

”ہاں..... ہاں..... چلو دکھا دوں..... لیکن تم ہو کون.....؟“

”مم..... میں کرنل فریدی کا اسٹنٹ ہوں.....!“

”اوہو..... اب تم مجھے الجھن میں ڈال رہے ہو..... شاید تمہارا نام حمید ہے!“

”جی ہاں..... جی ہاں.....!“

”آخر ظنی کے توسط سے تمہیں کون پیغام بھجوا سکتا ہے!“

”آپ یقین نہیں کریں گے.....!“

”نہیں..... کہو..... کہو.....!“

”یہ دیکھئے..... اس لفافے میں ایک سادہ کاغذ کے علاوہ اور کچھ نہیں!“

لفافے سے سادہ کاغذ نکال کر دکھایا۔

”میں سمجھ گیا.....!“ بوڑھا سر ہلا کر بولا۔

”کیا سمجھ گئے؟“

”پہلے تم بتاؤ کہ ترکاری گلی تک کس طرح پہنچے تھے!“

”ہمارا ایک نامعلوم انفارمر ہے، جو ہمیں فون پر مختلف قسم کی اطلاعات دیا کرتا ہے انا

صبح اس نے کہا تھا کہ اگر میں کھولی نمبر ۱۸ کے سامنے پہنچ جاؤں تو کچھ مفید معلومات حاصل

ہوں گی۔ میں وہاں پہنچا اور کھولی سے وہ خاتون برآمد ہوئیں۔ مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ جلد

صاحب ہیں..... میرے اعتراف پر لفافہ حوالے کر کے بولیں۔ فوراً یہاں سے چلے جاؤ.....“

”تم نے مجھے الجھن میں ڈال دیا..... اب میں تمہیں اس وقت سیونٹھ بیون میں نمٹ

لے جاؤں گا۔ پہلے میرے گھر چلو.....!“

فریدی کے بیان کے مطابق یہ ”گھر“ دو کمروں کا کوارٹر ہی ثابت ہوا۔ جو غریب

آدمیوں کی ایک چھوٹی بستی میں واقع تھا۔

”ظنی سے اسی بات پر جھگڑا ہوا ہے کہ میں اسے اپنی کسی شاندار عمارت میں کیوں نہ

رکھتا..... اور خود یہاں کیوں پڑا ہوا ہوں.....!“ بوڑھے نے حمید کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے

کہا۔

”چلو قیمت ہے!“ فریدی سر ہلا کر بولا۔

”آخر وہ کیا چاہتی ہے؟“

”اس حرکت سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے شہباز کو دیدہ دانستہ تمہارے پیچھے لگایا تھا۔“

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک ملازم نے کمرے میں داخل ہو کر کسی ملاقاتی کا کارڈ پیش کیا۔

”اوہو!“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”آخر بڑے میاں تشریف لے ہی آئے۔“

”کون.....؟“ حمید چونک کر بولا۔

”شہباز..... تم یہیں ٹھہرو.....!“

فریدی کمرے سے چلا گیا۔ حمید سوچ رہا تھا کہ کہیں ثلثی کے سلسلے میں کوئی اسکینڈل نہ

ہو گیا ہو..... آخر کیا چاہتی ہے..... وہ لڑکی!

تھوڑی دیر بعد ایک ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ فریدی نے اسے ڈرائنگ روم میں

بلایا ہے۔

فریدی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ حمید کو دیکھتے ہی برس پڑا۔ ”میں تمہیں کئی بار سمجھا چکا ہوں

کہ نامعلوم انفارمرز کی اطلاعات پر آنکھیں بند کر کے نہ دوڑ جایا کرو۔“

”میں نے تو پہلے ہی تیموری صاحب سے معافی مانگ لی تھی۔“ حمید نے تیموری کی

طرف دیکھ کر سہم جانے کی ایکٹنگ کی۔

”ثلثی غائب ہو گئی ہے میرے بیٹے.....!“ شہباز تیموری بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”اوہ.....! کب.....؟“

”تمہیں مے پول چھوڑ کر میں اھر ہی گیا تھا۔ کھولی خالی پڑی تھی۔ اس کا سامان بھی

غائب تھا۔“

”قصہ دراصل یہ ہے جناب!“ نید کے کچھ بولنے سے قبل فریدی بول پڑا۔

”قصور حمید کا بھی نہیں ہے! اس نامعلوم انفارمر نے اسی دوران میں کئی بہت گچی

اطلاعات ہم تک پہنچائی تھیں۔ مثال کے طور پر آپ نے اخبارات میں کیفے دارا کے چھاپے

سے متعلق پڑھا ہوگا۔“

”ہاں..... ہاں..... شاید کچھ تھنیر قانونی غنیمت کے بارے میں!“

چور ہیں! طرح طرح کے ذہنی امراض میں مبتلا ہو گئے ہیں لیکن اس کے باوجود اس نہیں چھوڑ سکتے۔ بالکل اسی طرح جیسے جہنم سے نکلنا ناممکن ہو گا۔ عورتیں اپنے شوہروں نالاں ہیں لیکن ان سے پیچھا نہیں چھڑا سکتیں کہ اس ٹھنڈے جہنم سے نکلنا پڑے گا۔ دیکھا..... ذرا سے اختلاف پر مجھے چھوڑ گئی نا..... چھوڑ دے لیکن میں اسے اس جہنم میں دھکیل سکتا۔ وہاں پہنچ کر وہ ثلثی نہیں رہے گی، چیخنے اور کراہنے والی مشین بن جائے گی ایک جگہ جی چیختی رہے گی۔ کھولی نمبر اٹھارہ کا رخ نہیں کر سکے گی اور میں اپنے دل میں اس لیے تڑپ محسوس نہیں کروں گا!“

وہ بولتا رہا اور حمید حیرت سے آنکھیں پھاڑے سب کچھ سنتا رہا۔ اس کی بھائی چائے اسے پینی ہی پڑی تھی۔

اس سے بھی عجیب بات یہ تھی کہ اس نے مصر ہو کر حمید کو اپنی ہی گاڑی میں دوبارہ مے پول ہوٹل تک پہنچایا تھا۔

رات ہوتے ہوتے وہ گھر پہنچ سکا۔ فریدی بھی کچھ دیر پہلے کہیں سے تھکا ہارا آیا تھا۔

”آپ باز نہ آئے ہوں گے.....!“ اس نے حمید کو گھورتے ہوئے کہا۔

”اور پھر ایک کہانی سنئے۔“ حمید فخریہ انداز میں مسکرایا۔

”کہانی بھی ہے.....!“

”جی ہاں.....! اور شاید میں اس نامعقول لڑکی کی وجہ سے کسی بڑی دشواری میں پڑنا

والا ہوں۔“ حمید نے کہا اور بھیم پورے والی روداد دہرانے لگا! فریدی بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا

لیکن کبھی کبھی اس کے چہرے پر جذباتی تغیر بھی نظر آتا۔

حمید کے خاموش ہونے پر بولا۔ ”تم سے ایک بڑی حماقت سرزد ہوئی ہے۔“

”وہ کیا.....؟“ حمید کے جوش و خروش پر ٹھنڈا پانی پڑ گیا۔

”شہباز تیموری کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ لفافے میں سادہ کاغذ تھا۔ صرف انا

ہی کہہ دینا کافی ہوتا کہ کسی نے ثلثی کے توسط سے تمہیں کوئی پیغام بھجوایا تھا شاید تم نے یہ بھی

دیا ہو کہ پیغامبر کوئی لڑکی ہے۔“

”جی نہیں.....!“

حید نے لہک کر شعر پڑھا۔

بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل  
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے  
”کبھی کبھی سے کیا مراد ہے؟“ شعر پڑھ کر اس نے فریدی سے پوچھا۔  
”کان نہ کھاؤ۔“

”علامہ اقبال کا شعر ہے!“

”انہیں سے پوچھو جا کر.....!“

”میں بتاتا ہوں.....! اتنے بزرگ آدمی تھے صاف صاف کیا کہتے! کبھی کبھی سے مراد ہے جب کوئی عورت قریب ہو۔ اس کے علاوہ اور کوئی مفہوم نہیں اس کبھی کبھی کا.....!“  
”عورت کے بچے خاموش رہو!“

”نہ عورت خاموش رہ سکتی ہے اور نہ اس کا بچہ! ایک کان کھاتی ہے اور دوسرا حلق پھاڑتا ہے۔ آواز کے علاوہ اور کیا رکھا ہے دنیا میں۔“

”ٹپنی کا کیا ہو گا.....؟ ان بڑے میاں کی افتاد طبع آئے دن طرح طرح کے گل کھلاتی جا رہی ہے!“

”سوال تو یہ ہے کہ آپ نے انفارمر کے سلسلے میں غلط بیانی سے کیوں کام لیا تھا۔“

”غلط بیانی سے کیا مراد ہے تمہاری؟“

”وہ مرد تو نہیں ہے!“

”میں نے کب کہا تھا کہ وہ مرد ہے! انفارمر مرد بھی ہو سکتا ہے اور عورت بھی صرف انصاف نہیں کی تھی اور وضاحت نہ کرنا غلط بیانی نہیں کہلاتا۔“

”میرا خیال ہے کہ آپ اس بوڑھے پر شبہ کر رہے ہیں!“

”شبہ اسی صورت میں کر سکتا ہوں جب یہ ثابت ہو جائے کہ ٹپنی کے غائب ہو جانے

نہ اس کا ہاتھ ہے!“

”میں تو اکتا گیا ہوں ان معاملات سے!“ حمید جمالی لے کر بولا۔ ”اُس فون نمبر کے

سلسلے میں کیا ہوا؟“

”جی ہاں! اسی نامعلوم انفارمر نے ہمیں مطلع کیا تھا کہ وہاں مثنیات کی ایک بہت سی کھیپ پہنچنے والی ہے۔“

”اچھا.....!“ تیوری کے لہجے میں حیرت تھی۔ ”لیکن..... ٹپنی..... بھلا ٹپنی کو کیسی معاملے سے کیا سروکار..... خدا کی پناہ..... کیا میرے گرد کوئی جال بنا جا رہا ہے..... یقیناً بات ہے..... اس لفافے میں سادہ کاغذ تھا..... حمید صاحب؟“

”جی ہاں..... آپ نے دیکھا ہی تھا!“

”خدا مجھ پر رحم کرے..... اس شہر کے دوسرے کاروباری میرے دشمن ہیں! کیوں میرے طوں کے مزدوروں کو تنخواہوں کے علاوہ کئی الاؤنسز بھی دیئے جاتے ہیں جن کا انھار میری مرضی پر ہے۔“

”میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں.....!“ فریدی بولا۔

”لیکن میں کیا کروں.....!“ بوڑھا بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”شہر کا کونہ کونہ چھان مارا جائے گا.....! کیا آپ کسی کے خلاف شبہ کا اظہار کرنا پسند فرمائیں گے۔“

”کس کا نام لوں..... مجھے تو میری اولادیں تک ناپسند کرتی ہیں..... لیکن میں فرعونوں کی طرح نہیں مرنا چاہتا۔“

”آپ بے فکر رہیں..... جب تک محترمہ ٹپنی کا سراغ نہیں ملے گا چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ ان کی کوئی تصویر مل جائے گی؟“

”ہر وقت پاس رکھتا ہوں۔“ بوڑھے نے جیب سے پرس نکالتے ہوئے کہا۔ پھر اس پرس کے ایک خانے سے ٹپنی کی تصویر برآمد ہوئی۔

”لیکن یہ کام بہت خاموشی سے ہونا چاہئے۔“ بوڑھے نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ میرے بیٹوں کو مجھ پر ہنسنے کا موقع ملے!“

”آپ مطمئن رہئے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے گی۔“

پھر بوڑھے کے چلے جانے کے بعد فریدی ٹھنڈی سانس لے کر بولا تھا۔ ”یہ بیماری کسی عمر میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔“

”تو میرا یہ خیال غلط نہیں تھا کہ وہ تمہاری ہی تحویل میں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ بڑے بڑے نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ بہر حال میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچ سکتا کہ مجھے بڑے سے الجھنا چاہتی تھیں۔“

”میری بات غور سے سنو!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”اپنے چیف سے کہہ دو! اگر بڑی بھیڑیا نظر آئے تو اس کی کھال اتارنے کی کوشش ضرور کریں۔“

پھر حمید ”ہیلو۔ ہیلو“ ہی کرتا رہ گیا تھا اور دوسری طرف سے سلسلہ قطع ہونے کی آواز آئی تھی۔

## چیخ اور سناٹا

دوسری صبح ناشتے کی میز پر حمید نے فریدی کو بچھلی رات دالی فون کال کے بارے میں بتایا۔ فریدی کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ سر ہلا کر بولا۔ ”اس کی رہنمائی تل ہی میں بھیڑیے تک پہنچ چکا ہوں..... لیکن لا حاصل۔“

”میں نہیں سمجھا!“

”اس میں شک نہیں ہے کہ اُس عورت ہی نے ہمیں اس راہ پر ڈالا ہے لیکن اصل مجرم رسائی اور بات ہے۔“

”اوہو..... تو پھر..... بھیڑیا کون ہے؟“

”بھیڑیا..... بھیڑیا ہے.....!“

”اور میں چونکہ بھیڑیا نہیں ہوں اس لیے آلو کا پٹھا ہوں!“ حمید بھنا کر بولا۔

”خواہ مخواہ بور ہو رہے ہو! اس کے کہنے کے مطابق اب اگر کوئی بھیڑیا ملا تو کھال بھی تڑکڑکھا دوں گا.....!“

حمید کچھ نہ بولا..... وہ تو صرف اسی لڑکی کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ اس کیس نہ! لڑکی کے علاوہ اور رکھا بھی کیا تھا! غشیات کی ناجائز تجارت کوئی نیا واقعہ نہ تھا۔ رہ گئیں

”ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ اس نمبر کا انسٹرومنٹ کہاں ہے!“

”کیا اب پھر کہیں جانا ہوگا!“

”فی الحال تو ارادہ نہیں ہے!“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔ ”صرف دو گھنٹے کی نیند کا خواہش ہوں.....!“

”جائیے! میں ابھی جاگ رہا ہوں۔“

فریدی کی اپنی خواب گاہ میں چلا گیا اور خمید نے ڈائننگ روم کی راہ لی۔

آج وہ بڑی الجھن میں مبتلا تھا۔ لڑکی کی وجہ سے خاصی چوٹ ہوئی تھی۔ خواہ مخواہ ایک سادہ لوح بڑے کی نظروں میں خوار ہوا تھا لیکن کیا وہ سچ مچ یہی چاہتی تھی کہ بوڑھا اس کی طرف متوجہ ہو جائے۔ آخر کیوں؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس واقعے کے بعد خود بوڑھے ہی نے غلطی کو منظر عام سے ہٹا دیا ہو..... پھر ایک بیک اسے اپنے اس انداز فکر پر ہنسی آگئی۔ کیا غلطی ہی کے توسط سے وہ اس لڑکی کے بارے میں معلومات نہ حاصل کر سکتا؟ لہذا یہ کیوں نہ سچا جائے کہ غلطی سے کام نکلنے کے بعد خود اسی لڑکی نے غلطی کو غائب کر دیا ہو۔

کھانے کی میز پر کیا تھا وہ اس وقت اس طرف دھیان نہ دے سکا۔ اس پر خیالات کی یلغار ہو رہی تھی۔

”فون پر آپ کی کال ہے!“ دفعتاً ایک ملازم نے آکر اطلاع دی۔

”عورت ہے کوئی.....!“

”جی ہاں.....!“

اس نے ہاتھ صاف کئے بغیر میز چھوڑ دی۔

ڈرائنگ روم میں آیا اور ریسور اٹھا کر پُر فکر لہجے میں کال ریسپونڈ کی۔

”بہت بچھے بچھے سے لگ رہو ہو!“ لڑکی کی آواز آئی۔

”تمہاری وجہ سے بہت پریشانی اٹھائی ہے۔“

”شاید میری ہی وجہ سے کچھ بھی اٹھاؤ۔“

”تو پھر بلواؤں کسی قاضی کو.....!“ حمید نے چپک کر پوچھا۔

”فضول باتیں مت کرو..... غلطی محفوظ ہے!“

ناشتہ ختم کر کے حمید اٹھنے لگا تو اس نے کہا۔ ”ایک دائرہ ریکارڈ رکھی رکھ لیتا!“

”تک..... کیا مطلب.....!“

”ساری لڑکیوں کی آوازیں ریکارڈ کرنی ہیں..... اس طرح کہ کسی کو احساس نہ ہونے

.....!“

”کیا میں صرف احکامات بجالانے کی مشین ہوں!“ حمید پھر بھنا گیا۔

”چلو..... چلو.....!“ فریدی اس کا شانہ تھپک کر بولا۔ ”میرا یہ خیال غلط تھا کہ وہ لڑکی

دائردہ لے کی صلاحیت نہیں رکھتی.....!“

”اوہو..... تو کیا ان گیارہ لڑکیوں میں سے.....!“

”دیکھ لینے میں کیا حرج ہے..... بدلی ہوئی آواز کا ریکارڈ بھی ہمارے پاس موجود

ہے..... ٹک کر لیں گے.....!“

ٹھیک اسی وقت ملازم نے ڈائٹنگ روم میں داخل ہو کر کسی فون کال کی اطلاع دی۔

”عورت تو نہیں ہے!“ حمید نے پوچھا لیکن نفی میں جواب پا کر برا سا منہ بناتے ہوئے

برگاہ کی طرف چل پڑا۔ فریدی سنگ روم میں چلا گیا۔

حمید دائرہ ریکارڈ لے کر واپس آیا تو فریدی کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار

ٹی جسے وہ کوئی معنی نہ پہنسا سکا۔

”چلو..... خاصا ہنگامہ رہے گا!“ فریدی نے اس کے ہاتھ سے دائرہ ریکارڈ لیتے ہوئے

ہاتھ بوڑھے کا فون تھا! وہ اس وقت اپنے ٹھنڈے جہنم میں موجود ہے اور اس کی خواہش

ہے کہ ہم وہاں پہنچ جائیں۔“

”وہ تو کہتا تھا کہ وہاں قدم رکھنا بھی اسے گوارا نہیں!“

”چلو دیکھتے ہیں.....!“

سیونٹھ بیون کے چھانک پر دو مسلح سپاہیوں نے ان کا استقبال کیا۔ شاید انہیں پہلے

نہ اسے ان کے بارے میں ہدایات دے دی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک نے ان کی رہنمائی

مردروازے تک کی تھی اور تیسرا جو وہیں موجود تھا انہیں اندر لے چلا۔

اندر قدم رکھتے ہی ہلکی سی موسیقی ذہنوں کو گدگدانے لگی تھی۔

وہ لاشیں تو وہ بھی اس شہر خدار کے لیے انہونیوں میں سے نہیں تھیں۔ روزانہ دو چار تو بچے

مخواہ ٹریفک کے حادثات ہی کی نذر ہو جایا کرتے تھے۔

”چلو آج تمہیں ٹھنڈے جہنم کی سیر بھی کرا دوں!“ فریدی کچھ دیر بعد بولا۔

”کیا وہ گیارہ عدد ہر وقت وہیں موجود رہتی ہیں۔“

”بکواس مت کرو.....!“

”ان گیارہ عدد کے علاوہ مجھے وہاں کی کسی اور چیز سے کوئی دلچسپی نہیں!“

”دادا بھی دلچسپی کی چیز ہے لیکن وہ اس عمارت سے تعلق نہیں رکھتا.....!“

”صبح چار بجے بھی اس کی کال آئی تھی.....!“

”ٹلنی ملی یا نہیں!“

”نہیں.....!“

”کمال کا آدمی ہے..... میرا دل چاہتا ہے کہ کچھ دن اسی کے چکر میں گزار دوں!“

”کیا مطلب.....!“

”مزید کچھ عورتوں سے اس کا تعارف کراؤں.....!“

”حمید صاحب کبھی اس کے دفاتر کی طرف بھی جانا ہوا ہے.....!“

”نہیں..... تو.....!“

”درجنوں خوب صورت عورتیں..... آپ کو مختلف عہدوں پر نظر آئیں گی!“

”تو پھر یہ..... ٹلنی والا گھنسیا پن.....!“

”اپنا اپنا معیار ہے..... تم اسے گھنسیا پن نہیں کہہ سکتے جس طبقے میں وہ زندگی بسر کر رہا

ہے اسی کی مناسبت سے.....!“

دفعہ وہ جملہ پورا کئے بغیر خاموش ہو گیا۔

حمید نے استفہامیہ انداز میں جلدی جلدی پلکیں جھپکائیں۔

”کچھ نہیں!“ فریدی بڑبڑایا۔ ”ناشتہ ختم کرنے میں جلدی کرو.....!“

”کوئی خاص بات.....!“

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ پُر فکر انداز میں سگار کا گوشہ توڑ رہا تھا۔

ہر جگہ یکساں آواز..... کہیں پر بھی فاصلے کا احساس نہ ہو سکا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے درود یوار سے موسیقی کی لہریں خارج ہو رہی ہوں۔ پورا گھر  
ایز کنڈیشنڈ ثابت ہوئی..... ایک مخصوص قسم کی خوشبو چاروں طرف پکراتی پھر رہی تھی۔  
بادوردی ملازم انہیں ایک بڑے ہال میں لایا۔ یہاں کی آرائش دیکھ کر حمید کی آنکھیں  
کھل گئیں۔

پورے ہال میں ایک ہی قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین بھی ایسا جس میں بیدھنٹے  
محسوس ہوتے تھے! پھر فرنیچر کا کیا کہنا.....؟

ہال میں پانچ آدمی نظر آئے۔ بوڑھا شہباز تیموری، تین گول منول سے آدمی  
چوتھا جوان تینوں سے چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ گھیلے جسم کا قد آور آدمی تھا۔

انہیں دیکھ کر وہ اٹھے تھے اور بوڑھا خالی کرسیوں کی طرف اشارہ کر کے پھر بیٹھ گیا تھا  
حمید نے محسوس کیا کہ ان میں سے ایک آدمی اسے کینہ تو ز نظروں سے دیکھ رہا تھا  
دہی، جو دوسرے افراد کے مقابلے میں صحت مند اور توانا معلوم ہوتا تھا۔

تعارف ہوا..... یہ چاروں شہباز تیموری کے بیٹے تھے۔  
پہلا گول منول سجاد تیموری تھا۔ دوسرا آصف تیموری، تیسرا بابر تیموری اور چوتھا مناسب  
جسم والا جمشید تیموری تھا..... حمید پانچویں کے بارے میں سوچنے لگا جو، ان میں موجود نہ  
تھا..... فریدی کا دوست محمود تیموری۔

ٹھیک اُسی وقت فریدی نے بوڑھے سے پوچھا۔ ”کیا محمود نہیں ہیں!“  
وہ پچھلی رات یو۔ کے فلائی کر گیا۔ ”بوڑھے نے جواب دیا۔  
”فرمائیے.....! میں کیا خدمت کر سکتا ہوں!“ فریدی نے پانچویں پر اچھتی کی نگہ  
ڈالتے ہوئے کہا۔

”کیپٹن حمید کیا وہ سادہ کاغذ اور لفافہ محفوظ ہے!“ بوڑھے نے حمید سے سوال کیا۔  
”جی ہاں.....!“  
”ان پرائگلیوں کے نشانات ضرور ہوں گے!“  
”یقیناً ہیں!“ حمید کے جواب دینے سے پہلے فریدی بول پڑا۔

”میں چاہتا ہوں کہ چاروں کے فنگر پرنٹ لے لیے جائیں!“ بوڑھے نے اپنے بیٹوں  
رہ دیکھ کر کہا۔

تینوں گول منول آدمی تو خاموش رہے لیکن چوتھا اٹھ کھڑا ہوا۔  
”یہ ناممکن ہے!“ اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔  
”جمشید بیٹھ جاؤ!“ بوڑھا غرایا۔

”آپ ہماری توہین کر رہے ہیں!“  
”بیٹھ جاؤ!“ بوڑھا پیر شیخ کر دھاڑا۔

”ہرگز نہیں.....! میں جا رہا ہوں اور آئندہ کبھی ادھر کا رخ بھی نہیں کروں گا۔“  
”دیکھ پچھتائے گا!“

”لغت ہے پچھتانے والے پر..... آپ آخر مجھے کیا سمجھتے ہیں؟“  
”بیٹھ جاؤ..... بیٹھ جاؤ.....!“ تینوں گول منول خوفزدہ لہجے میں بولے۔  
”آپ لوگ بے حس اور ذلیل ہیں..... میں نہیں ہوں!“ جمشید نے کہا اور تیز تیز قدم  
اٹاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اکتا دینے والی موسیقی اب بھی ہال میں گونج رہی تھی اور حمید ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے  
کی فلم کی پس منظر موسیقی ڈرامے کے لمحات گزر جانے کے بعد ڈھیلی پڑ گئی ہو۔  
”وہ سب خاموش تھے۔ بوڑھے کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور اس کے تینوں بیٹے  
باندہ خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔

دفنٹا جمشید پھر ہال میں داخل ہوا اور حمید کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”یہ شخص اول  
بے کا جھوٹا ہے!“

”وہ کس طرح جناب!“ حمید نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔  
”تم خود ہی اس حرکت کے ذمہ دار ہو.....!“  
”ثابت کرو.....!“ بوڑھا غرایا۔

”شہر میں کون نہیں جانتا کہ کیپٹن حمید عورتوں کے پیچھے دم ہلاتا پھرتا ہے۔“  
”مجھے تو شہر میں ایک بھی دم دار عورت نظر نہیں آئی۔“

”میں تمہیں دیکھوں گا!“

”گٹ آؤٹ!“ بوڑھا حلق پھاڑ کر چیخا۔

”نہیں... نہیں! یہ زیادتی ہے...!“ فریدی نرم لہجہ میں بولا۔ ”خود کو قابو میں“

جناب... جشید میاں آپ بیٹھ جائیے!“

”شکریہ!“ وہ تلخ لہجہ میں بولا۔ ”میں سب سمجھتا ہوں! میں فنگر پرنس ہرگز نہیں ہوں!“

”اس کی ضرورت نہیں!“ فریدی کا لہجہ بدستور نرم تھا۔

موسیقی کی یکسانیت حمید کو بری طرح کھل رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ یہاں سے

بھاگے کسی میوزیکل کلاک کے الارم کی طرح بس ایک ہی دھن بجے جا رہی تھی۔ نہ تو

چڑھاؤ نہ کسی قسم کی دوسری تبدیلی۔

جشید فریدی کے کہنے پر بھی نہیں بیٹھا تھا۔ بوڑھا اس سب سے منہ موڑے بیٹھا

سوچ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے شدید ترین تلخی نمایاں تھی۔

دفعتاً فریدی اسے مخاطب کر کے بولا۔ ”اگر آپ محترمہ ٹپنی کی بازیابی ہمارے قوسد

چاہتے ہیں تو ایک رپورٹ لکھ کر مجھے دیجئے...! ان سب باتوں سے کوئی فائدہ نہیں خواہ

خاندانی زندگی میں کیوں تلخیاں پیدا ہوں۔“

”اچھا... اچھا...!“ بوڑھے نے سر ہلا کر کہا۔ ”لیکن یہ اب اس عمارت میں نہیں رہ سکتا“

اس نے جشید کی طرف اشارہ کیا تھا۔

جشید پھر تیزی سے ٹکاسی کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس بار فریدی نے حمید کو

کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا تھا اور یہ اشارہ بڑی حد تک معنی خیز بھی تھا۔

جشید نے کچھ دیر پہلے حمید کی توہین کی تھی اس لیے اس نے حکم کی تعمیل میں بڑی ہلچل

دکھائی۔ جلد از جلد اس سے الجھنے کا بہانہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ ہال سے نکلے ہی اس نے اسے جال

”کیا بات ہے!“ جشید بھنا کر پلٹ پڑا۔

”تم نے مجھ پر ایک الزام لگایا ہے... دوست...!“ حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”تو کیا میں نے آپ کے بارے میں غلط کہا تھا۔“

”میلی کچلی گندی عورتیں میری مشغولیات میں شامل نہیں ہیں... بہت ہی آرنیک

رکتا ہوں...!“

”جہنم میں جاؤ...!“ وہ کہتا ہوا آگے بڑھ جانے کے لیے مڑا۔

”مٹھرو دوست... میں بھی جہنم سے نکلنا چاہتا ہوں... ساتھ لیتے چلو!“

”کیا مطلب...!“ وہ دوبارہ مڑ کر حمید کو گھورنے لگا۔

”تم لوگ یہاں کس طرح زندہ ہو مجھے اس پر حیرت ہے...! خدا کی پناہ یہ موسیقی

میں منٹ ہی میں دماغ کی چولیس ڈھیلی کر سکتی ہے!“

دفعتاً جشید تیموری کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کہا۔

”...چلو میرے ساتھ۔ میں اس سلسلے میں تم سے کچھ گفتگو بھی کرنا چاہتا ہوں...!“

دو دونوں باہر آئے اور جشید نے حمید کے لیے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”اب اس وقت غصے میں تھا۔ تم خود سوچو اگر کوئی باپ اپنے بیٹوں پر اپنی داشتہ کے اغوا کا

ام لگائے تو...!“

”ٹھیک ہے! ٹھیک ہے! میں سمجھتا ہوں... اسی لیے میں نے بات نہیں بڑھائی

...! حمید نے اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ جشید گھوم کر دوسری طرف اسٹیرنگ کے

نہ جا بیٹھا۔

گاڑی کپاؤنڈ سے نکلی...! حمید آنکھوں سے جشید کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”مگر

اب صاحب تو کہہ رہے تھے کہ ٹپنی منکوحہ ہے!“

”خدا جانے...!“ جشید نے ناخوشگوار لہجہ میں کہا۔ ”عمر کی زیادتی نے ان کا ذہن

نہ کر دیا ہے!“

چند لمبے خاموش رہ کر وہ پھر بولا۔ ”انہوں نے اس سلسلے میں کسی نامعلوم انفارمر کی

ہٹا بھی سنائی تھی۔ اس میں کہاں تک صداقت ہے۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“

”تم لوگوں نے اس کی آواز ریکارڈ کرنے کی کوشش ضروری کی ہوگی!“

”ظاہر ہے!“

”میں اسے سننا چاہتا ہوں!“

”سوری۔“ کہہ کر حمید نے مجموعہ کلام میز کی دراز میں رکھ دیا اور پھر بولا۔ ”وہ انعام مر کا

”ا“

”مہلدا“ فرید چنگی بجا کر بولا۔ ”اور کچھ.....؟“

”بوڑھے کو برا بھلا کہہ رہا تھا.....!“

”قدرتی بات ہے!“ فریدی سر ہلا کر بولا۔

”کیا واقعی ٹی بی بوڑھے کی داشتہ ہے!“

”بکواس ہے! کیا جیشید نے یہ اطلاع دی ہے!“

”جی ہاں.....!“

فریدی کسی سوچ میں پڑ گیا۔ حمید کچھ دیر بعد بولا۔ ”اس نے فون نمبر دیئے ہیں۔ اگر

اپنے ٹی بی سنوانے پر آمادہ ہوں تو اسے مطلع کر دیا جائے۔“

”تم اسے چار بجے رنگ کر سکتے ہو!“ فریدی گھڑی پر نظر ڈالتا ہوا بولا۔

”تو کیا جج.....!“

”وہ کسی مرد کی آواز ہوگی..... تم فکر نہ کرو.....!“

”ان تینوں گول منول اولادوں کا کیا رویہ تھا.....!“

”کچھ بھی نہیں! سب کچھ خاموشی سے سنتے رہے تھے.....!“

”اور وہ گیارہ عدد لڑکیاں..... ان میں سے تو کسی کی بھی شکل نہیں دکھائی دی تھی.....!“

”سب باہر تھیں.....!“

”میں پوری عمارت بھی نہ دیکھ سکا!“

”لیکن میں نے تو تمہاری آنکھوں میں آکٹا ہٹ کے آثار دیکھے تھے!“ فریدی بولا۔

”وہ موسیقی مجھے جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی..... آخر وہ بند کس طرح ہوتی!“

”جب صدر دروازہ مقفل کیا جاتا ہے..... بس پوری عمارت کو ایک بہت بڑا برقی کھلوتا

نکل..... بھانت بھانت کے عجائبات نظر آئیں گے۔“

”بوڑھا میری سمجھ سے باہر ہے!“

فریدی مسکرا کر رہ گیا کچھ بولا نہیں..... حمید اسے جواب طلب نظروں سے دیکھے جا رہا

”سنو ادوں گا..... ٹی بی کرٹل صاحب کی تحویل میں ہے ان سے کہوں گا.....“

بات سمجھ میں نہیں آتی۔

”کیا بات.....!“

”کل رات تیموری صاحب نے درخواست کی تھی کہ ٹی بی کی تلاش کا کام خاموشی

جائے ورنہ آپ لوگوں کو ہنسنے کا موقع ملے گا لیکن پھر خود ہی آپ لوگوں کو بھی لوٹ کر بیٹھ

”میں نے کہہ دیا نا کہ ان کی ذہنی حالت مشکوک ہے..... اور مجھے یہ کہتے ہو

محسوس نہیں ہوتی کہ انہوں نے ایک خاص مقصد کے تحت یہ طرز زندگی اپنایا ہے!“

”خاص مقصد کے تحت!“ حمید کے لہجے میں حیرت تھی۔

”جی ہاں..... تاکہ نچلے طبقہ کی عورتوں پر زیادہ سے زیادہ ہاتھ صاف کیا جاسکے“

”خدا کی پناہ.....!“

”کہاں اترو گے!“ اس نے ناخوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”اپنے دفتر کے قریب..... تو پھر اب تم سے کہاں ملاقات ہو سکے گی! مطلب یہ ہے

اگر کرٹل صاحب تمہیں ریکارڈ کی ہوئی آواز سنانے پر آمادہ ہو جائیں تو تم سے کس طرح

قائم کیا جائے.....!“

”تقری اور تقری سکس ایٹ چورنگ کر لینا.....!“

پھر وہ حمید کو اس کے دفتر کے قریب گاڑی سے اتار کر چلا گیا تھا۔

”جہنم میں جاؤ!“ حمید دور ہوتی ہوئی گاڑی کو گھورتا ہوا بڑبڑایا۔

ایک کھٹنے بعد فریدی بھی واپس آ گیا تھا..... حمید آرام کرسی پر نیم دراز اختر شیرانی کا

نظموں سے جی بہلا رہا تھا۔

”کیا رہی؟“ اس نے حمید کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”بہی وادی ہے اے ہدم جہاں ریحانہ رات تھی.....!“

”کیا بکواس ہے.....!“

”اوہ.....!“ حمید چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔

”میں نے جنہیں کئی بار تنبیہ کی ہے کہ شعراء کرام کو دفتر نہ لایا کرو۔“



”میں تمہارے بھائی محمود تیموری سے کبھی نہیں ملا وہ کسی قسم کے آدمی ہیں۔“  
 ”بے حد سعادت مند.....! والد صاحب کے بے حد فرمانبردار..... دن کو رات اور

ان کو دن کہہ دیں۔ ان کی خوشی کی خاطر.....!“  
 ”یہ لوگ چھپے رہتے ہیں؟“ حمید بولا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ ملک میں نہیں ہیں۔“  
 ”میں کچھ نہیں جانتا!“ وہ بیزاری سے بولا۔ ”مجھے کسی میں دلچسپی نہیں رہی!“  
 ”آپ کے متعلقین تو سیونٹھ بیون ہی میں رہ گئے ہیں!“  
 ”کون سے متعلقین.....؟“

”مطلب یہ کہ آپ کے بیوی بچے.....!“  
 حمید ہنس پڑا۔ پھر بولا۔ ”میرا کوئی نہیں ہے! میں بالکل تنہا ہوں..... ورنہ اتنی آسانی

اس جہنم سے چھٹکارا نہ ملتا.....!“  
 ”حیرت ہے کہ تم بھی اسے جہنم سمجھتے ہو!“  
 حمید کچھ نہ بولا..... اس کے چہرے پر بیزاری کے علاوہ اور کسی قسم کا تاثر نہیں تھا۔  
 ”اچھا..... کیپٹن حمید..... شکریہ.....!“ اس نے کچھ دیر بعد کہا اور حمید کی گاڑی سے اتر

کرا پی گاڑی میں جا بیٹھا۔

اسکے چلے جانے کے بعد بھی حمید نے اپنی گاڑی وہیں روک رکھی۔ دن بھر کی تپش کے بعد  
 ہوم خاصا خوشگوار ہو گیا تھا۔ پارک کی کھلی فضا میں کچھ دیر ٹھہر کر دن بھر کی تھکن اتارنا چاہتا تھا۔  
 دفعتاً وہ لڑکی یاد آگئی جس کے پھیلانے ہوئے کھڑاگ نے یہاں تک پہنچا دیا تھا۔ آخر  
 ”کیا چاہتی تھی۔ اگر یہ منشیات کی تجارت کرنے والے دو مخالف گروہوں کا ٹکراؤ تھا تو پھر اس  
 نے بڑے شہباز تیموری کو اس میں کیوں ملوث کرنے کی کوشش کی تھی۔

تو پھر کیا چچ بچ بڑھا شہباز ہی.....! شہباز جو اپنی انسان دوستی کے جھنڈے گاڑتا پھر  
 ”ہے..... ایسے ہی کسی گروہ کا سربراہ بھی ہے، سب کچھ ممکن ہے! یہاں کیا نہیں ہوتا۔

اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کی طرف چل پڑا..... ذہن نے شہباز سے پھر اسی  
 لڑکی کی طرف چھلانگ لگائی..... تو پھر وہ شہباز ہی کے گھرانے کی کوئی لڑکی ہرگز نہیں ہو سکتی۔  
 اسے وہ شام بھی یاد آئی جب وہ ایک گونگی لڑکی کے روپ میں سیونٹھ بیون کی کپاؤنڈ

تھا۔ بالآخر بولا۔ ”کیا بوڑھے پر شبہ کیا جاسکتا ہے!“  
 ”فی الحال کوئی بھی شبہ سے بالا تر نہیں ہے!“

اسی شام کو چار بجے حمید نے جمشید سے فون پر رابطہ قائم کر کے اطلاع دی کہ  
 انفارمر کی آواز کا ٹیپ سنایا جاسکتا ہے! فریدی نے ٹیپ ریکارڈر اس کے حوالے کر دیا تھا  
 جمشید نے حمید کو بتایا کہ وہ پندرہ منٹ بعد آ لکچو میں مل سکے گا۔  
 آ لکچو سے اٹھ کر وہ دونوں ایک پبلک پارک میں پہنچے تھے اور حمید نے گاڑی پارک  
 بیٹھے بیٹھے اسے ٹیپ سنایا تھا۔

”سوال تو یہ ہے کہ ٹپنی..... کیوں.....؟ وہ کیوں استعمال کی گئی۔“ جمشید پر نظر  
 میں بڑبڑایا۔

”کیا یہ آواز تمہارے لیے کوئی اہمیت رکھتی ہے!“ حمید نے سوال کیا۔  
 ”قطعاً نہیں!“ وہ سر ہلا کر بولا۔ ”میرے لیے بالکل اجنبی ہے اور اصل قصہ یہ ہے  
 کیپٹن حمید کہ ہمارے کچھ کاروباری حریف ہمیں نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ٹپنی  
 میں سے کسی کی آواز کاربانی ہو۔ ذرا ایک بار پھر تو سنو نا ٹیپ!“

حمید نے دوبارہ ٹیپ چلایا..... جمشید بہت غور سے سن رہا تھا۔ حمید نے اس کے چہرے  
 کے اتار چڑھاؤ پر نظر رکھی لیکن اسے انہماک کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

”دشواری تو یہ ہے کہ آپ لوگ کسی کے خلاف شبہ بھی تو ظاہر نہیں کر رہے!“ حمید نے  
 کچھ دیر بعد کہا۔

اس پر جمشید تلخ سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”قبلہ والد صاحب نے ہم لوگوں کے خلاف شبہ  
 ظاہر تو کر دیا تھا..... کیا تم نے نہیں دیکھا کہ میں نے احتجاجاً سیونٹھ بیون سے اپنا تعلق منقطع  
 کر لیا ہے۔“

”مجھے اس ٹریجڈی پر افسوس ہے.....!“

”اور مجھے اس پر حیرت ہے کہ تم لوگ بھی انفارمر کی آواز نہیں پہچانتے۔“ جمشید بولا۔  
 ”تم اس طرح کہہ رہے ہو جیسے تم نے پہچان لی ہو۔“  
 ”جب تم جیسے ماہر لوگ نہیں پہچان سکے تو میں پیچھا کس شمار میں ہوں!“

”ہیلو.....!“ حمید چیخا رہ گیا..... لیکن دوسری طرف اب سنا تھا۔

## آخری کوشش

ریسیور میز پر ڈال کر اس نے تجربہ گاہ کی طرف دوڑ لگائی تھی۔ وہاں سے دوسری لائن والے فون پر اپنے محکمہ کے آپریشن روم سے رابطہ قائم کر کے پوچھا! ”کیا بوتھ نمبر تیرہ سے ہمارے نمبر پر کوئی کال ہو رہی تھی.....!“

”جی ہاں.....!“ دوسری طرف سے جواب ملا۔ ”وہ آپ سے گفتگو کر رہی تھی پھر چیخی تھی اور سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ کرنل صاحب کو اطلاع دے دی گئی ہے!“

”وہ کہاں ہیں.....؟“

”فون نمبر تقرری سکس ایٹ ناٹ پر ملے تھے!“

حمید نے سلسلہ منقطع کر کے مذکورہ نمبر ڈائل کیے لیکن دوسری طرف صرف گھنٹی بجتی رہی۔ ریسیور نہیں اٹھایا گیا تھا..... ریسیور رکھ کر وہ پھر سٹنگ روم کی طرف بھاگا۔

دو یا تین منٹ کے اندر ہی اندر اس کی گاڑی سڑک پر نکل آئی تھی اور اس کا رخ اُپر کلاس ہاؤسنگ سوسائٹی کی طرف تھا۔

بوتھ نمبر تیرہ کے قریب بھیڑ نظر آئی اور حمید کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی! بھیڑ ہٹا کر وہ بوتھ کے دروازے تک پہنچا فریدی اندر کھڑا فرش پر پہلے ہوئے تازہ تازہ خون کو دیکھے جا رہا تھا۔

حمید کی آمد پر چونکا اور اس کا اس کا بازو دھچکے ہوئے بوتھ سے باہر نکل آیا۔

”لل..... لاش بھوادی؟“ حمید نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”کیسی لاش.....؟“

”لل..... لڑکی..... کی!“

”جب میں پہنچا ہوں تو یہاں کوئی لاش ویش نہیں تھی۔ البتہ ایک آدمی بوتھ کا دروازہ

سے برآمد ہوئی تھی..... تو گویا شروع ہی سے وہ ان لوگوں کی طرف اشارہ کرتی رہی تھی۔ گھر پہنچ کر فریدی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اس نے سوچا کہیں اس دوران میں اس کی ٹیلیفون کال نہ آئی ہو لیکن ملازموں سے دریافت کرنے پر مایوسی ہوئی۔ ذہن کی جو کچھ ہوئی تھی اسے مایوسی ہی کہنا چاہیے کیونکہ اسے اس کی کال کا انتظار رہتا تھا۔

چائے کے دوران میں اچانک اس کی یہ آرزو پوری ہو گئی۔ پیالی ہاتھ میں لیے ڈرائیو روم تک دوڑا چلا آیا۔

دوسری طرف وہی لڑکی تھی۔ کھٹکتی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولی۔ ”کہو دوست کیا حال ہیں.....“

”تم نے بڑی مصیبت میں پھنسا دیا ہے! بوڑھا میری جان کو آگیا ہے!“

”پھر اسے کیا بتایا.....!“

”جی بات بتانا میرے پیشے کے منافی ہے.....! تم بتاؤ آخر تمہارا گروہ اس گروہ کے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے.....؟“

”کہاں کی ہانک رہے ہو پیارے دوست.....!“

”ایک بار پھر کہو!“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”کیا کہوں.....؟“

”پیارے دوست!“ آج تک کسی لڑکی نے اتنے پیار سے مخاطب نہیں کیا۔ جواب میں پھر کھٹکتی ہوئی ہنسی سنائی دی تھی۔

”کہو نا..... ایک بار پھر کہو.....!“

”شاید کسی دوسرے انسٹرومنٹ پر میرے نمبر ڈھٹ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

”ہرگز نہیں!“ حمید بولا۔ ”میں تمہیں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ اس گروہ کا قلع قمع ہو جانے کے بعد تمہارے گروہ کی طرف ضرور توجہ دی جائے گی۔ لہذا تم اس سے پہلے ہی اپنا تحفظ کر لو۔“

”میری فکر نہ کرو..... پیارے دوست..... او..... اف.....!“

ایسی ہی زبردست چیخ تھی کہ حمید کا سر جھنجھٹا اٹھا..... بالکل ایسا ہی لگا تھا جیسے اچانک کسی نے لڑکی کی پشت میں خنجر اتار دیا ہو۔

”اس پجاری کو یہ نہیں معلوم کہ اس خون کا تجزیہ بھی کیا جائے گا!“

”آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”وہ کسی آدمی کا خون تو نہیں ہے!“

”کیا بوتھ کی نگرانی مسلسل جاری ہے؟“

”نہیں.....!“

”ادنبہ ہو گا کچھ!“ حمید نے اکتاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے شانوں کو جنبش دی۔

فریدی نے گھڑی پر نظر ڈالی..... آٹھ بج رہے تھے۔

”میرا خیال ہے کہ یہ رات اس سلسلے میں بے حد اہم ثابت ہوگی!“ اس نے لنگن کا

وازہ کھولتے ہوئے کہا! ”اپنی گاڑی میں میرے پیچھے آؤ!“

لنگن آگے بڑھی تھی اور جب حمید کی گاڑی بھی حرکت میں آئی تو اس کی رفتار تیز ہو گئی۔

دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ہائی سرکل ٹائٹ کلب میں داخل ہوئی تھیں۔

لنگن ہی کے قریب حمید کو بھی پارک کرنے کی جگہ مل گئی..... فریدی گاڑی سے اترتا ہوا

بولا۔ ”میں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔“

”اس لیے میں کل دوپہر تک کا انتظام بھی اسی وقت کر لوں گا.....!“ حمید نے طنزیہ

لہجے میں کہا۔

کھانا کھا کر وہ نو بجے تک ڈائننگ ہال ہی میں بیٹھے رہے! حمید کو اس پر حیرت تھی۔

”کیا فلور شوتا ہی دلچسپ ہے؟“ اس نے بالآخر کہا۔

”جی نہیں!“ خشک لہجے میں جواب ملا۔ ”محض وقت گزاری!“

”گھر کیا برا تھا اس کے لیے.....!“

”کان نہ کھاؤ..... دس منٹ بعد اٹھ جائیں گے!“

”دس منٹ بعد اس سے بھی اچھی رقا صدمہ اپنے فن کا مظاہرہ کرے گی!“

”اچھی بات ہے اٹھو!“ فریدی اٹھتا ہوا بولا۔

باہر نکل کر حمید پارکنگ شیف کی طرف بڑھا ہی تھا کہ فریدی اس کا بازو پکڑ کر بولا۔ ”جی

نہیں! گاڑیاں یہیں رہیں گی!“

کھولے کھڑا فرش پر پھیلے ہوئے خون کو دیکھ رہا تھا۔

”کون تھا.....؟“

”احتمالاً باتیں نہ کرو..... کوئی بھی ہو سکتا ہے..... فون کرنے آیا تھا.....!“

”تو اس کا یہ مطلب کہ فوری طور پر لاش بھی غائب کر دی گئی!“

فریدی کچھ نہ بولا۔ وہ اس جگہ آئے جہاں لنگن پارک تھی۔

”تو کیا یونہی.....!“ حمید بولا۔

”جی نہیں!“ فریدی کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی! ایک آدمی بوتھ کے دروازے پر موجود

ہے.....! ابھی دوسرے بھی پہنچ کر ضابطے کی کارروائی کریں گے۔ میں زیادہ دیر یہاں نہیں

ٹھہر سکتا! جشید کا کیا رہا۔

”اس نے دوبارہ ٹیپ سنا تھا.....؟“

”ری ایکشن!“

”گھرے انہماک کے علاوہ اور کچھ نہیں محسوس کر سکا! ظاہر ہے کہ آواز کے بارے میں

تو اس نے لاعلمی ہی ظاہر کی ہوگی کیونکہ ٹیپ جعلی تھا.....!“

”میں نے تمہاری رائے نہیں معلوم کی تھی!“ فریدی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”فی الحال بُرا ماننے کے موڈ میں نہیں ہوں.....!“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”بالآخر وہ پجاری بھی ماری ڈالی گئی!“

فریدی نے لاپردائی سے شانوں کو جانف دی اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ حمید کو اس کا

یہ رویہ گراں گزرا تھا لیکن وہ خاموش ہی رہا۔ لڑکی کی حیرت اور کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ اسے

پھر یاد آ گئی۔

دفعتاً فریدی اس کی طرف مڑ کر بولا۔ ”تم بالکل گھماڑ ہو!“

”کس بناء پر.....!“ حمید کا لہجہ بھی اچھا نہیں تھا۔

”ہمیں مجرم کی راہ پر لگا کر اپنا ڈراپ سین کرنا چاہتی ہے تاکہ اس معاملے سے نپٹ کر

ہم اسے تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں۔“

”ہو سکتا ہے! ویسے ضروری نہیں کہ آپ کا یہ نظریہ درست ہی ہو۔“

”کیا مطلب!“

”چلو.....!“ وہ اسے کپاؤنڈ کے پھانک کی طرف دھکیلتا ہوا بولا۔

سڑک پر پہنچ کر اس نے ایک ٹیکسی رکوائی اور ڈرائیور سے ارجن پورہ چلنے کو کہا۔ حمید نے اب بالکل خاموشی اختیار کر لی تھی، ایسے مواقع پر عموماً اسے ضدی ہو جایا کرتی تھی کہ اب یہ نہیں پوچھے گا۔

فریدی نے بھی اپنے اس رویہ کی وضاحت نہ کی البتہ ارجن پورہ کی ایک نیم تاریک عمارت کے بالائی منزل کے آٹھویں فلیٹ کا قفل کھولتے وقت وہ بڑبڑایا تھا۔ ”تمہاری باپ کے بھی سڑے بٹے کپڑے اور جوتے یہاں مل جائیں گے۔“

”اب کیا بھنگی بنانے کا ارادہ ہے!“ حمید بھنا کر بولا۔

تھوڑی دیر بعد وہ معمولی مزدوروں کے سے لباس میں فلیٹ سے برآمد ہوئے تھے اور ان کے چہروں میں بھی کسی حد تک تبدیلی ہوئی تھی۔

پھر دوسری بار ٹیکسی میں بیٹھے وقت حمید کو معلوم ہوا تھا کہ ان کی منزل وہی بستی تھی جہاں بوڑھا شہباز تیوری رہتا تھا۔

”تو میرا اندازہ غلط نہیں تھا!“ حمید بڑبڑایا۔

”یہ ایک اندھی چال ہے.....!“ فریدی نے کہا۔ ”اگر اس میں ناکامی ہوئی تو اس مسئلے پر از سر نو غور کرنا پڑے گا۔“

”اس کے بیٹے جشید کا قول صادق ہوتا نظر آ رہا ہے!“

”دیکھتے جاؤ!“

بستی کے باہر ہی فریدی نے ٹیکسی رکوائی تھی اور کرایہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا تھا۔

”کواریز بھی بستی کے آخر میں سب سے اگت تھلگ تعمیر کرایا ہے!“ حمید آہستہ سے بولا۔

”خاموشی سے چلتے رہو!“ فریدی نے مڑے بغیر کہا تھا۔

بستی کے تاریک گوشوں سے گزرتے ہوئے وہ شہباز کے کواریز کے عقبی میدان تک پہنچے تھے جہاں دور دور تک پی ڈبلیو ڈی کا تعمیراتی سامان بکھرا پڑا تھا۔

”اوہو..... ادھر تو چوکیدار بھی ہوں گے!“ حمید آہستہ سے بولا۔

”تنت..... تم کون ہو.....!“

”ہوئے دو.....!“ فریدی نے لا پرواہی سے کہا۔ وہ کواریز کی پچھلی دیوار کے قریب پہنچ

پہنچے۔

چاروں طرف گہری تاریکی تھی.....! فریدی حمید کا شانہ دبا کر آہستہ سے بولا۔ ”چھت

پہنچا ہے۔“

”پی ڈبلیو ڈی والوں کی سیرمی اٹھالاؤں!“ حمید نے بوکھلا کر کہا۔

”فضول باتیں نہ کرو..... آؤ..... ہم یہ آسانی اوپر پہنچ سکیں گے!“

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اوپر چڑھتا چلا گیا تھا دیوار کے سرے پر شاید مزید تعمیر کے

لے آدمی آدمی انٹیں باہر نکلی چھوڑ دی گئی تھیں۔ ان کے سہارے اوپر پہنچنا نہایت آسان تھا۔

دوسرے ہی لمحے حمید بھی اس کی تقلید کر رہا تھا..... اوپر پہنچ کر وہ بیٹھے ہی بیٹھے نینوں کی

لطف بڑھنے لگے۔

نیچے ایک کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی۔ وہ زینوں کے قریب پہنچے ہی تھے کہ نیچے سے

ایک گرجدار آواز آئی۔ ”بتاؤ ورنہ..... زندہ دفن کر دوں گا۔“

وہ جہاں تھے وہیں ٹھنک گئے۔ دوسری آواز اتنی بلند نہیں تھی کہ الفاظ سمجھ میں آ سکتے۔

”احتیاط سے نیچے اترو..... کام بن گیا ہے!“ فریدی نے سرگوشی کی۔

کمرے میں گہرے نیلے رنگ کا بلب روشن تھا..... وہ کھڑکی کی دونوں اطراف دیوار

سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔

بوڑھا شہباز کرسی سے بندھا بیٹھا تھا اور اس کے سامنے ایک نقاب پوش سائیلنسر لگا ہوا

ہنزل لئے کھڑا نظر آیا۔

”زبان کھولو ورنہ.....!“ نقاب پوش نے پستول کو جنبش دی۔

”مم..... میں..... میں کچھ نہیں جانتا!“ بوڑھا بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

حمید آہستہ آہستہ اپنی کھوپڑی سہلانے لگا۔

”تم جھوٹے ہو! تمہی نے پولیس کو میری راہ پر لگایا ہے!“ نقاب پوش غالباً دانت پیس

لہلاتھا۔

”تمہیں اس سے سروکار نہ ہونا چاہیے.....!“

”جب میں تمہیں جانتا ہی نہیں تو پولیس کو کیسے تمہارے پیچھے لگاؤں گا!“

”میں پوچھا رہا ہوں کہ تم نے انہیں کس حد تک بتایا ہے!“

”تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی!“

دفعۃً فریدی نے مہرقتی سے دروازے کے سامنے پہنچ کر نقاب پوش پر چھلانگ لگا دی۔  
حمید کا ریوالتور پہلے ہی نکل آیا تھا۔

نقاب پوش کا پستول اس کی گرفت سے نکل کر دور جا پڑا اور اب وہ خود فریدی کی گردن میں تھا۔

دفعۃً بوڑھے نے چیخنا شروع کر دیا۔ ”دوڑو..... دوڑو..... بچاؤ..... بچاؤ.....!“

”خاموش!.....“ حمید اسے ریوالتور دکھا کر بولا۔

دوسری طرف نقاب پوش فریدی کی گرفت سے نکل جانے کے لیے اپنا انتہائی زور صرف کر رہا تھا۔

”خاموشی سے ہتھکڑیاں پہن لو..... ورنہ تمہارے منحنے اتار کر بے بس کر دوں گا۔“  
فریدی نے اسے فرش پر گراتے ہوئے کہا۔

”تت..... تم کون ہو.....!“ نقاب پوش ہکھلایا۔

”حمید ہتھکڑیاں!.....“

”کہاں ہیں!.....“

”میری پتلون کی دائیں جیب سے نکالو.....!“

حمید کے نام پر ایک بار پھر نقاب پوش نے گلو خلاصی کیلئے زور لگایا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔  
بوڑھا حیرت سے آنکھیں پھاڑے گم سم بیٹھا تھا..... حمید نے ہتھکڑیاں نکالیں اور تھوڑی

سی جدوجہد کے بعد نقاب پوش کے ہاتھوں میں ڈال دیں۔

”یہ..... کون ہے؟“ بوڑھا بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”منشیات کی غیر قانونی تجارت کرنے والے ایک گروہ کا سربراہ؟“ فریدی نے سرد لہجے

س کہا۔

”لیکن..... میں..... مجھ سے کیا سروکار..... میں کیوں؟“ بوڑھا بدحواس ہو کر بولا۔

”آپ ہی سے تو سروکار ہے!“

اس پر نقاب پوش نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن حمید کی ٹھوکرا سے دوبارہ فرش

نے آئی۔

”تم کون ہو.....!“ بوڑھا فریدی کو گھورتا ہوا بولا۔

”آپ کا خادم..... فریدی.....!“

”اوہ..... اوہ..... خداوند! یہ سب کیا ہو رہا ہے!“

”فہرینے..... ابھی بتاتا ہوں..... حمید اس کے چہرے سے نقاب ہٹاؤ.....!“

حمید نقاب ہٹانے کے لیے جھکا ہی تھا کہ اس نے اچھل کر اس کی پیشانی پر ٹکرماری اور

بڑبڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ پھر تو حمید پر گویا شیطان سوار ہو گیا تھا۔ اس بُری طرح اس کی

ات کی تھی کہ اس نے ذرا ہی سی دیر میں ہاتھ پاؤں ڈال دیئے تھے۔ اس کے بعد اس نے

کے پیر بھی باندھ دیئے۔

چہرے سے نقاب ہٹتے ہی بوڑھا کر بناک آواز میں چیخا۔ ”نہیں!“ اور دونوں ہاتھوں

بانی آنکھیں ڈھانپ لیں۔

”یہ اس کا چھوٹا بیٹا جشید تیوری تھا.....!“

”خداوند!..... یہ کیا ہو گیا.....!“ بوڑھا شہباز گلوگیر آواز میں بولا۔

”مجھے بے حد افسوس ہے!“ فریدی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں نے اس کو اس غلط فہمی

نہ لانے کی کوشش کی تھی کہ اس کے خلاف اطلاعات بہم پہنچانے والے آپ ہی تھے..... ورنہ

بات آسانی سے ہاتھ نہ لگتا۔“

”اوہ..... اسی لیے..... یہ مجھے مار ڈالنے پر تل گیا تھا اور مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں نے

بناک کو کس حد تک بتایا ہے..... اے میرے پروردگار آخر اسے کس چیز کی کمی تھی کہ یہ اس

نشت میں اتر آیا۔“

”چار افراد کے قتل کا الزام بھی ہے اس پر.....!“ فریدی بولا۔

”اللہ مجھ پر رحم کرے!“ بوڑھا کرہا۔

جشید آنکھیں بند کیے پڑا تھا.....! ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بے ہوش ہو گیا ہو۔  
حمید نے فریدی کے اشارے پر بوڑھے کو کرسی سے کھول دیا لیکن شاید اب اس  
اتنی سکت بھی نہیں رہ گئی تھی کہ خود سے کھڑا ہو سکتا۔

پھر ایک گھنٹے کے اندر ہی اندر بوڑھے کو ”سیونتھ ہیون“ اور جشید کو فریدی کے  
حوالات میں پہنچا دیا گیا تھا۔

حمید کو اس پر حیرت تھی کہ آخر فریدی نے جشید کو یہ کس طرح باور کرایا تھا کہ اس  
باپ ہی نے اس کی خبری کی تھی۔

فریدی سے پہلا سوال اس نے اسی سے متعلق کیا۔

”جو ٹیپ تم نے جشید کو سنایا تھا اسے ایک بار پھر سنو!“ فریدی بولا۔

”میں سن چکا ہوں.....!“

”کیا ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ بوڑھا تیوری آواز بگاڑ کر بولنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”خدا کی پناہ.....!“ حمید چونک پڑا۔ چند لمحوں فریدی کو حیرت سے دیکھتا رہا پھر بولا

”میرے ذہن میں یہی غلط تھی! لہجے میں کسی حد تک شناسائی کی جھلکیاں تھیں۔“

”اب تم پوچھو گے کہ اس طرف ذہن کیونکر گیا؟“

”قدرتی بات ہے.....!“

”اس کے ہاتھ کی انگشتی اس کے لیے چھانسی کا پھندا بن گئی جس پر فرعون کا سر بنا ہوا

ہے۔ شروع سے بتانا پڑے گا..... تم یوں نہیں سمجھو گے؟ تمہیں یاد ہو گا لڑکی نے تمہارے تونے

سے مجھے یہ پیغام دیا تھا کہ اگر کہیں کوئی بھیڑیا نظر آئے تو اس کی کھال اتارنے کی ضرورت

کوشش کروں.....!“

”اوہو! اسے تو میں بھول ہی گیا تھا.....!“

”اب کیفے دارا کے فیجر سرفراز کی لاش کی طرف واپس چلو..... اس کے جوتے کے تونے

سرخ مائل کچھڑ سے آلودہ تھے اور اس میں ابرک کے ٹکڑے بھی چپکے ہوئے تھے۔ جھیل کے

آس پاس کہیں بھی سرخی مائل مٹی نہ مل سکی اور پھر ابرک کے ٹکڑے..... دراصل انہی ابرک کے

ٹکڑوں نے رہنمائی کی..... جھیل سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک فیکٹری ہے جہاں بجلی کا

بنایا جاتا ہے۔ ابرک کے ٹکڑوں کی وجہ سے ذہن اس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہاں بجلی کی  
لہریں بنائی جاتی ہیں اس لیے ابرک کا اشاک بھی رہتا ہے۔ گو دام کے سامنے ایک جگہ کا  
ٹپ کر رہا تھا۔ جس کی وجہ سے آس پاس کچھڑ ہو گئی تھی اور یہ سرخ مائل تھا۔ اس میں  
کے ننھے ننھے ٹکڑے بھی شامل تھے پھر رات کو فیکٹری کی تلاشی کی ٹھہری..... وہاں تین  
بار تھے۔ کام صرف دن ہی میں ہوتا ہے۔ رات کی شفٹ نہیں چلتی۔ بہر حال چونکداروں  
باجائے میں خوب آواز دوا ملوای گئی اور تلاشی کا کام شروع کر دیا گیا۔ فیکٹری کے تہہ خانے  
میں ایک اور فیکٹری نظر آئی جہاں منشیات کی پیکنگ ہوتی تھی..... جانتے ہو پیکنگ کس طرح  
ہوتی تھی۔“

حمید نے غیر ارادی طور پر سر کو منحنی جنبش دی۔

”جب تم نے لڑکی کا پیغام مجھ تک پہنچایا تھا تو میں نے کیا کہا تھا.....!“

”غالبا آپ نے یہی کہا تھا کہ بھیڑیے تک میں پہلے ہی پہنچ چکا ہوں!“

”ٹھیک.....! وہاں بھیڑیوں کی کھالوں میں منشیات کی پیکنگ ہوتی تھی اور یہ بھیڑیے

ایکشن پسر کی حیثیت سے مل کے باہر بھیجے جاتے تھے۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک فرم

بیت عرصے سے یہ کاروبار کر رہی ہے لیکن شہر کے کسی گوشے میں بھی اس فرم کا دفتر نہ مل سکا۔“

”لیکن فیکٹری کا مالک تو سامنے کی چیز ٹھہرا۔“

”ہاں..... آں! وہ بھی بلیک میل کیا گیا تھا۔ اس کام پر اسے بلیک میل کر کے آمادہ کیا

تھا لیکن وہ بلیک میل کی شخصیت سے آگاہ نہیں تھا۔“

فریدی خاموش ہو کر سگار سلگانے لگا۔ پھر بولا۔ ”ہاں تو بات اس انگشتی کی تھی جس پر

لہون کا سر بنا ہوا ہے۔ کچھ بھیڑیوں کے نیچے جہاں کھال کی سلائی ہوئی تھی۔ ویکس پر مہریں

لگائی گئی تھیں، یعنی ویکس پر فرعون کے سر کی چھاپ تھی۔ جب تک لڑکی نے تمہیں بوڑھے

تیری سے الجھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میرا ذہن اس خاندان کی طرح متوجہ نہیں ہوا

نہ..... بہر حال میں نے ہی بوڑھے کو اس پر آمادہ کیا تھا کہ وہ لڑکوں کی موجودگی میں مجھے

ٹپ کر کے ملنے کا قصہ چھیڑے.....!“

”تو آپ نے جشید کے بڑکے اٹھنے کی بناء پر مجھے اس کے پیچھے جانے کو کہا تھا!“

”نہیں حمید صاحب!“ اس کی محرک صرف انگشتی بنی تھی اور پھر جب اس نے انہیں کال آئی۔

کی آواز کا ٹیپ سننے کی خواہش ظاہر کی تھی تو مجھے پچاس فیصد یقین ہو گیا تھا کہ جمشید بنی کا رو بار کی پشت پر ہے لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ آج ہی بوڑھے پر حملہ کر بیٹھا۔ اندازہ تھا جو اتفاق سے درست نکلا۔

”تو پھر میں کیا کروں!“ حمید بولا۔

”ٹیپ میں آپ ہی کی آواز تھی.....؟“

”پھر کس کی ہوتی..... شہباز تیموری کی آواز بارہا سنی تھی اس کے مخصوص لہجوں سے واقف تھا اس لیے ملتی جلتی آواز کی نقل تیار کر لینا کچھ مشکل نہیں تھا۔ بہر حال جمشید نے اپنے جرائم اعتراف کر لیا ہے۔ اس کے ہاتھوں وہی لوگ مارے گئے جو سربراہ کی شخصیت سے واقف تھے..... سرفراز کو خود اسی نے مارا تھا..... یاسمین فریدوں کو ہیڈ ویٹر فاروق سے قتل کرایا اور جب اسے معلوم ہوا کہ فاروق اپنا بیچ یاسمین کے کمرے میں ہی چھوڑ آیا ہے تو اس نے اسے شراب میں زہر دے دیا۔ ڈیوڈ تلارام کی بیوی کو اس نے اپنے ایک گرگے سے قتل کرایا تھا۔ وکیل نے اسے اطلاع دی تھی اور اس نے فوری طور پر اپنے ایک گرگے کو فون کیا تھا جو تار جام ہی کا باشندہ ہے۔ اس نے ڈیوڈ کی بیوی کو قتل کر دیا۔ اس وقت تک وہ بھی گرفتار کر لیا گیا ہوگا۔ ملک سے باہر بھیجی جانے والی غشیات رقاصہ کے توسط سے ڈیوڈ تک پہنچتی تھیں اور ڈیوڈ انہیں ایک ویرانے میں پہنچاتا تھا جہاں سے دوسرے لوگ انہیں فیکٹری تک لے جاتے تھے۔“

”اوکے!“ کہہ کر حمید نے ریسپور کرڈیل میں رکھا اور نیشنل لائبریری کی طرف دوڑ گیا۔ پورے ہال میں صرف ایک ہی لڑکی نارنجی رنگ کے شلوار سوٹ میں نظر آئی۔ حمید اس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اس نے چونک کر اسے گھورا تھا..... حمید اس کے قریب ہی آئی کھسکا کر بیٹھتا ہوا آہستہ سے بولا۔ ”بوتھ نمبر تیرہ میں پایا جانے والا خون کسی حرماں نصیب مرغ کا تھا مس فریدہ تیموری!“

”کک..... کیا مطلب.....!“ وہ ہکلائی۔

”جھیل کے کنارے جب آپ نے گیلی مٹی سے شوق فرمایا تھا تو ایک چٹان پر اپنے بڑے ہاتھ کا نشان چھوڑ آئی تھیں.....!“

”خدا مجھے معاف کرے!“ وہ طویل سانس لے کر مسکرائی۔ ”مٹی سے اس لیے شوق لیا تھا کہ گھونگریا لے بالوں والی دگ پانی ہی میں رہ گئی تھی!“

”جب آپ سب کچھ جانتی تھیں تو ایسا خطرناک طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

میں قطعاً نہیں جانتی تھی کہ اس کا لے کارو بار کی پشت پر جمشید بچا ہوں گے۔ صرف اتنا نام تھا کہ وہ سیونٹھ بیون ہی کا کوئی فرد ہو سکتا ہے۔ جب میں نے دیکھا کہ گوگی لڑکی سے بات کے بعد بھی آپ لوگ سیونٹھ بیون کی طرف متوجہ نہیں ہوئے تو مجبوراً ٹپنی دادی والا بچہ چلا کر دادا جان کو آپ لوگوں کے پیچھے لگا دیا..... یہ تدبیر کامیاب ہوئی اور جمشید بچا بالآخر لیے گئے۔“

”زیادہ سے زیادہ لڑکیوں کے پیچھے دوڑ لگاؤ..... جی بھر کے عیاشی کرو، اور بڑھاپے میں اللہ پاک سے معافی مانگ کر جنت الفردوس کو سدھارو!“ فریدی کا لہجہ بے حد تلخ تھا۔

اس کے بعد حمید کی ہمت نہیں پڑی تھی کہ انفارمر لڑکی کے بارے میں کسی قسم کی گفتگو کرتا۔ دوسرے دن شام کو جب وہ کافی پی کر گھر سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہیں سے فریدی کی

## جاسوسی دنیا نمبر 116

# عظیم حماقت

(مکمل ناول)

”بڑی بیدردی سے ذکر کر رہی ہوں!“

”سیونتھ ہیون میں کوئی کسی کا نہیں ہے۔ سب اپنے اپنے عذاب میں مبتلا ہیں۔ جان نے وہ ٹھنڈا جہنم تعمیر کیا اور خود الگ ہو گئے۔“

”آخر آپ نے اس کی جرأت کیسے کر ڈالی تھی.....!“

”پچھلے سال ایک ایسی غریب بیوہ سے ملاقات ہوئی تھی جس کا واحد سہارا ایک نوجوان تھا جو اپنی دن بھر کی کمائی نیشیلے سگرٹوں پر گنوا دیتا تھا۔ بس اسی دن سے تہیہ کر لیا تھا کہ غیر کی کالی تجارت کرنے والوں کا پیچہ لگا کر پولیس کو مطلع کرتی رہوں گی۔ معلوم نہیں! چھوٹے موٹے تاجر میرے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے اور پھر اچانک ایک دن معلوم ہوا سیونتھ ہیون بھی اس میں ملوث ہے..... وہاں سے ایک بڑی کھپ کینے دارا میں پہنچائی تھی۔ میں نے ان لوگوں کا طریق کار سمجھنے کی کوشش کی۔ ان کے ایک ٹھکانے سے واقف ہو گئی، لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اصل مجرم کون ہے۔ بہر حال اب شاید میں بھی عدالت میں گھسیٹی جاؤں.....!“

”قطعی نہیں! ہم آپ جیسی نیک ہستیوں کو ان چکروں سے محفوظ ہی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرے اور کرنل صاحب کے علاوہ اور کسی کو بھی اس کا علم نہیں! آپ کو تو ایک نامعلوم عورت ہی کی حیثیت سے ریکارڈ میں رہنے دیا جائے گا۔“

”شکریہ..... لیکن میں دادا جان کو سب کچھ بتا چکی ہوں اور انہوں نے غلطی دادی کوڑے سے سمجھایا ہے کہ وہ بھی اسے راز ہی میں رکھیں۔“

”یہ میک اپ وغیرہ کرنا آپ نے کہاں سے سیکھا.....!“

”ایک فینسی ڈریس ایکسپرٹ سے، کئی سال پہلے یورپ میں اس کی شاگردی کی تھی!“

”گوگلی لڑکی سے دوبارہ ملنے کا اشتیاق باقی رہا جاتا ہے.....!“

”ملنے رہیے گا کبھی کبھی.....!“ وہ مسکرائی۔

”میں تمہاری عظمت کو سلام کرتا ہوں!“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔

ختم شد



## پیشرس

### پتھر کی لڑکی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ..... مبارک باد قبول فرمائیے۔ لیکن آپ نے تو ۵۰ روپے مہنگائی الاؤنس کی رسید تک نہ دی۔ جب تنخواہ میں ۳۵ روپے اضافہ ہوا تھا تو آپ نے ایک چونی مجھے بھی عنایت فرمائی۔ اب ۵۰ روپے کے اضافے پر بھی صرف چونی ہی کا سوال ہے۔ یہ اضافہ دوسروں نے تو اسی وقت کر دیا تھا جب اچانک کاغذ کی قیمت میں فی ٹن قریباً سو فیصد کا اضافہ ہوا تھا لیکن میں اسی نیک گھڑی کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا کہ شاید آپ کی تنخواہوں میں اضافہ ہو جائے، سو اللہ پاک نے میری آرزو پوری کی، (اگر آپ میری کتابیں نہ پڑھتے ہوتے تو آپ کی تنخواہوں میں ہرگز اضافہ نہ ہوتا) بہر حال! اللہ نے چاہا تو آپ کی تنخواہوں میں مزید اضافہ ہو گا۔ بس میرے ناول پابندی سے پڑھتے رہیے (پروفیسروں کی تنخواہیں اسی لیے بہت زیادہ ہو گئی ہیں کہ میرا ہر ناول کئی کئی بار پڑھتے ہیں) دھماکے کے سلسلے میں آپ کا استفسار بہت بڑھ گیا ہے۔ کیا عرض کروں؟ فلم کے لیے کہانی اور میوزک ضروری ہیں۔ میوزک نام ہے سر اور تال کا، لیکن دھماکے کا سابقہ زیادہ تر ”ہڑتال“ سے پڑتا رہا ہے۔ چاہے وہ قومی پیمانے پر رہی ہو یا اسٹوڈیو کی حد تک..... بہر حال توقع ہے کہ آپ اگست میں دھماکہ دیکھ سکیں گے۔

عظیم حماقت حاضر ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

ابن صفی

۱-۷-۷۴

اس دیو کو دیکھ کر ان کے دیوتا ہی کوچ کر گئے۔ پھر بہتروں کے تو پاؤں ہی اکھڑ گئے تھے اور جدھر جس کے سینگ سمائے تھے بھاگ نکلا تھا۔ چیخوں میں ہلکی، بھاری، سریلی اور کربہ ہر طرح کی آوازیں شامل تھیں۔

دیو جہاں تھا وہیں کھڑا چراغ الہ دین کے فلمی جن کی طرح قہقہے لگاتا رہا۔ پکنک منانے والے اپنا سامان تک چھوڑ بھاگے تھے، جس میں کھانے پینے کی چیزیں، ٹرانزسٹروں کے علاوہ ”عدد گاڑیاں بھی شامل تھیں۔

ایک بیک خوفزدہ ہو کر بھاگ نکلنے میں ارادے کو دخل نہیں تھا۔ اضطرابی طور پر اس قسم کے افعال سرزد ہو جاتے ہیں۔ لہذا جب انہیں ہوش آیا تو ان کے قدم رکنے لگے۔

پھر پندرہ یا بیس منٹ بعد ایک ایک کر کے وہ دوبارہ اسی مقام پر آ پہنچے تھے، جہاں سے خوفزدہ ہو کر بھاگے تھے، ان میں چھ لڑکیاں تھیں اور چار لڑکے! جن کی عمریں بیس بائیس سال سے زیادہ نہ رہی ہوں گی۔ وہ ڈری ڈری نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر ایک ایک لڑکی بولی۔ ”ارے گاڑیاں.....!“

اور وہ پھر سب ہی طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگے تھے۔ کیونکہ دونوں گاڑیوں کے پیچے بیکار ہو چکے تھے۔ ان کی ہوائنکل چکی تھی۔

”یہ..... یہ..... کیا ہوا۔“ کوئی بولا۔

”کیا ضرورت تھی اس طرح بھاگنے کی۔ وہ تنہا ہی تو تھا۔“ ایک لڑکے نے غصیلے لہجے

”کیا کر سکتے ہیں۔ شاہراہ یہاں سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہمارے فرشتے بھی

رات وہاں تک نہ پہنچ سکیں گے۔“

”تو پھر.....؟“ بیک وقت ساری لڑکیوں نے سوال کیا۔

”شاید ہمیں یہیں رات گزارنی پڑے۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ ایک لڑکی ہسٹریائی انداز میں چیخی۔

سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لڑکی کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور آنکھیں حلقوں سے ابلی

پڑی تھیں۔

دفعتاً اس نے دیو کے سے انداز میں ہنستا شروع کر دیا۔ آواز حیرت انگیز طور پر بھاری

ہوئی تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔

”سارہ..... سارہ.....“ وہ بیک وقت چیخے۔

لیکن لڑکی اسی آواز قہقہہ لگاتی رہی۔ پھر وہ ویسی ہی بھاری بھر کم مردانہ آواز میں

بولی۔ ”میں اشقر جن ہوں۔ تم نے میرے گھر میں گندگی پھیلائی ہے۔ میں تم لوگوں کو معاف

نہیں کر سکتا۔“

قہقہہ پھر جاری ہو گیا۔ وہ سب بری طرح سہمے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

بجروہی نو جوان آگے بڑھا، جو کچھ دیر قبل مردانگی کا دعویٰ کر چکا تھا۔

”یہ کیا بکواس ہے؟“ اس نے کڑک کر پوچھا۔

”بیچھے ہو۔“ سارہ قہقہہ روک کر مردانہ آواز میں بولی۔

”یہ مذاق ختم کرو۔“

”اتنی لڑکے! میں اشقر جن ہوں۔ اس وقت اس لڑکی پر میرا قبضہ ہے۔“

”سارہ بکواس مت کرو۔“

”تم لوگوں کو سننا ضرور ملے گی۔“ سارہ نے قہقہہ لگایا اور پھر وہ قہقہہ یک بیک نسوانی

نہنوں میں تبدیل ہو گیا۔ اب سارہ اپنی اصل آواز میں چیخے جاری تھی۔ اس کی آنکھیں بند

تھیں اور وہ آگے پیچھے جھول رہی تھی۔ ایک بار نیچے ہی چلی آئی۔ وہ سب اس کی طرف جھپٹے۔

میں کہا۔

”تم شاید یہیں ٹھہرے رہے تھے۔“ دوسرے کا انداز طنزیہ تھا۔

”لیکن ہوا کیسے نکل گئی.....؟“

جیسے ہم سب بھاگ نکلے تھے۔“

”بہت اچھے.....!“ ایک لڑکا خوفزدہ سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”تم شاید یہ کہنا چاہتے

کہ ڈر کے مارے ہوا نکل گئی۔“

اس پر سب ہی سہمے ہوئے انداز میں ہنستے تھے۔

”اب کیا کریں؟“ کسی نے کہا۔

”کیا کر سکتے ہیں۔ میرے پاس دو فالتو پیسے ہیں اور تمہارے پاس۔“ ایک

دوسرے سے سوال کیا۔

”صرف ایک.....!“

”مرے بے موت.....! اب واپسی کیونکہ ہو گئی۔“

”مم..... مگر..... وہ کون تھا اور کہاں چلا گیا۔“ ایک لڑکی بولی۔

”ارے سامان تو دیکھو۔“ کسی نے ہانک لگائی۔

”سب کچھ موجود ہے۔“

”کک..... کہیں پھر نہ دکھائی دے۔“ ایک لڑکی ہکلائی تھی۔

”پتھر اکٹھے کر لو۔“ ایک لڑکا آگے بڑھ کر خود اعتمادی کے ساتھ بولا۔ ”دیکھتے ہی پتھر

شروع کر دیتا۔“

”پہلے کیوں بھاگے تھے۔“

”وہ اضطرابی فعل تھا۔ اب دیکھ لیں گے وہ کتنی بڑی خبیث روح ہے۔“

”ایسا نہ کہو..... ایسا نہ کہو!“ ایک لڑکی خوفزدہ سی آواز میں بولی۔

”خاموش رہو!“ وہی نو جوان سخت لہجے میں بولا۔ ”اگر اب کسی نے ذرہ برابر بھی خوف

ظاہر کیا تو اچھا نہ ہوگا۔“

”یا ختم بھی کرو!“ دوسرا بولا۔ ”سورج غروب ہونے والا ہے۔ ہمیں کچھ کرنا چاہئے۔“

پانی کی بوتل لائی گئی اور بیہوش سارہ کے چہرے پر چھینٹے مارے جانے لگے۔ لیکن بے حس و حرکت پڑی گہری سانس لیتی رہی۔

”پانی کی بوتل لاؤ۔“

”پتا نہیں کیا چکر ہے۔“

”وہ سچ مچ کوئی خبیث روح ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ جیالا نوجوان سر ہلا کر بولا۔ ”لیکن ضروری نہیں ہے کہ کوئی اس

روح آنے پر آمادہ ہی ہو جائے۔“

”ہاں..... یہ بات تو ہے۔“

”لیکن! بہر حال یہ کرنا ہی پڑے گا۔“ چنگیزی طویل سانس لے کر بولا۔ ”میں جاؤں

بمقام فکر نہ کرو۔ ایک باسکٹ میں کافی کا قہر موس اور پانی کی بوتل کے ساتھ کھانے کی کچھ

چیزیں رکھ دو۔ سڑک تک پہنچتے پہنچتے خاصی رات ہو جائے گی۔“

سارہ اب بھی بیہوش تھی اور وہ سب گاڑیوں کے آس پاس اکٹھا تھے۔

چنگیزی کے مشورے کے مطابق ایک باسکٹ اس کیلئے تیار کر دی گئی۔ روانگی سے قبل اس

نہانی گاڑی کے ڈیش بورڈ کے ایک خانے سے ریوالور نکالا تھا اور جیب میں ڈال لیا تھا۔

سب سے پہلے وہ اس جگہ پہنچا جہاں وہ عفریت دکھائی دیا تھا۔ بائیں جانب والی

طمان میں اس نے دور دور تک نظر دوڑائی، لیکن کہیں کوئی غیر معمولی چیز دکھائی نہ دی۔ پھر وہ

پنے خوفزدہ ساتھیوں سے ”خدا حافظ“ کہہ کر دائیں جانب والی ڈھلان میں اترنے لگا۔ یہ

مذاق اس کا دیکھا بھالا ہوا تھا۔ اس طرف سے سڑک کا فاصلہ نسبتاً کم ہوتا۔

اس کا تعلق وادی گلبار کے سب سے زیادہ معزز خاندان سے تھا۔ خان دارا کا بھتیجا تھا

نئے وادی گلبار کا بادشاہ ہی کہنا چاہئے۔ سرکاری عملہ اس کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں

اسکتا تھا۔ اس کے باوجود بھی چنگیزی نے سڑک سے زیادہ دور پٹنگ منانے کی مخالفت کی

نا۔ لیکن جہاں چار چھ سر پھرے اکٹھا ہوں، وہاں کسی ایک کی کون سنتا ہے۔

وہ جگہ حقیقتاً اس علاقے کی خوبصورت ترین تفریح گاہ بن سکتی تھی لیکن چنگیزی وہاں کے

مقامات سے بخوبی واقف تھا۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ ماورائی خطرے کا تصور تک اس کے

خائیں نہ رہا ہو۔

ان اطراف میں سانپوں کی بھی بہتات تھی اور سب سے بڑا خطرہ تو بروہانیوں کا تھا۔ یہ

نہایت ہی اور بت پرست قبائلی تھے۔ بروہانی قبیلے میں صدیوں سے عورتوں کی کمی چلی آرہی

تھی۔ اس لیے دوسری اقوام کی عورتوں کا اغوا ان کے لیے مذہبی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

پانی کی بوتل لائی گئی اور بیہوش سارہ کے چہرے پر چھینٹے مارے جانے لگے۔ لیکن بے حس و حرکت پڑی گہری سانس لیتی رہی۔

”اب کیا کریں؟“

”کس مصیبت میں پڑ گئے۔“

”یہ جگہ سچ مچ آسب زدہ معلوم ہوتی ہے۔ دیکھو میرے سارے رنگ کھٹے کھڑے ہو گئے ہیں۔“

”کچھ کرو..... فضول باتوں میں وقت نہ گنواؤ۔“

”کیا کر سکتے ہیں!“

”اسے اٹھا کر گاڑی میں لے چلو!“

”چلو اٹھاؤ.....!“

چار لڑکیاں آگے بڑھیں۔ بیہوش لڑکی سارہ ایک گاڑی میں پہنچائی گئی۔ اس کا جسم اڑا کر رہ گیا تھا۔

وہ سب سجد پریشان تھے اور بار بار اسی جانب دیکھنے لگتے تھے جدھر سے دیو نمودار ہوا

تھا۔ اس کے سر پر دو عدد چھوٹے چھوٹے سینگ بھی تو تھے اور ڈاڑھی ایسی تھی جیسے کسی نیلے پر

جھاڑیاں اگ آئی ہوں۔ البتہ سرانڈے کے چھلکے کی طرح شفاف تھا۔ ورنہ وہ چھوٹے

چھوٹے سینگ بالوں ہی میں چھپ کر رہ جاتے۔ اس کی ہنسی ہیبت ناک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا

تھا جیسے بادل گرج رہے ہوں۔

”تت..... تمہارے پاس تو ریوالور تھا۔“ ایک نے اس نوجوان سے کہا، جو بہت زیادہ

دلیری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

”گاڑی میں تھا..... میرے پاس نہیں تھا۔“

”چنگیزی تم ہی ہمت کرو!“ دوسرا بولا۔ ”تمہارے علاوہ شاید ہی کوئی پیدل سڑک تک

یہی آواز نکالنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ وہ آواز بالکل اسی جن یا دیو کی آواز سے  
 تھی.....  
 اس کے ذہن میں دیو کا مسلسل تہقہہ گونجنے لگا اور وہ پھر چلتے چلتے رک گیا۔ تہقہہ اس  
 کے ذہن کی پیداوار نہیں تھا۔ وہ اسے اپنے کانوں سے سن رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ  
 فضاء میں دور دور تک چکراتا پھر رہا ہو.....!

اندھیرا پوری طرح پھیل گیا تھا۔ چنگیزی کے جسم سے ٹھنڈا پسینہ چھوٹ پڑا۔ جہاں تھا  
 وہاں رک کر ایک پتھر کی اوٹ میں پوزیشن لینے لگا..... ریوالور جیب سے نکل آیا تھا لیکن  
 حالت کا احساس جلد ہی ہو گیا۔ بھلا اندھیرے میں پوزیشن کس کے خلاف لے رہا تھا۔ کیا وہ  
 اس تہقہہ کی سمت کا تعین کر سکا تھا۔ پھر پوزیشن لینا چہ معنی دارد..... اس نے محسوس کیا کہ وہ  
 خائف ہو کر ایک پتھر کی اوٹ میں دبک گیا ہے۔ ریوالور نکال لینا بھی خوفزدگی ہی کا نتیجہ تھا۔  
 تہقہہ کچھ دیر تک سنائی دیتا رہا پھر سناٹا چھا گیا اور یہ سناٹا اس تہقہہ سے بھی زیادہ  
 بیکار لگ رہا تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک اسی جگہ دبکا رہا۔ پھر اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک عجیب طرح کی خوشبو کا  
 احساس ہوا اور ساتھ ہی سر بھی چکر گیا۔ اس کے بعد اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑتے چلے گئے  
 تھے اور پھر ذہن بھی گہری تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ اس نے اپنے ذہن پر قابو پانے کی انتہائی  
 کوشش کر ڈالی تھی، لیکن ناکام رہا تھا۔

پھر دوبارہ ہوش آنے پر بڑی دیر تک اپنی بصارت ہی پر یقین نہیں آیا تھا۔ یہی سمجھا  
 ٹانڈ خواب دیکھ رہا ہے۔

اس کے چاروں طرف تاریکی رنگ کی خوشگوار دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ شائد سورج کچھ ہی  
 پہلے طلوع ہوا تھا اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اپنی گاڑی کی بچھلی سیٹ پر  
 بیٹھ سہا ہے تھے۔ اس کی دونوں جانب لڑکے بھی جاگ نہیں رہے تھے۔

ایک بیک چنگیزی نے انہیں جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ سب ہی جاگ پڑے تھے۔  
 ”لل..... لڑکیاں.....؟“ وہ بھی بیک وقت بھلائے۔

”کہاں ہیں لڑکیاں؟“ چنگیزی نے پوچھا۔

سہل الحصول عورتیں ان کی دانست میں نعت غیر مترقبہ ہوتی تھیں۔ لہذا چنگیزی نے ان  
 لیے ان اطراف میں پنک مٹانے کی مخالفت کی تھی کہ ان کے ساتھ پوری چھ عورتیں  
 تھیں۔ بروہانیوں کا کوئی گروہ انہیں گھیر لیتا تو وہ چار عدد مردان کا کیا باڈل لیتے۔

بہر حال لڑکیاں اس سے متفق نہیں ہوئی تھیں۔ وہ اس خوبصورت اسپاٹ کو دیکھنا  
 چاہتی تھیں۔ پھر انہوں نے چنگیزی کی غیرت کو بھی لگا کر تھا کہ وہ خان دادا کا بھتیجا  
 کے باوجود بھی بزدلی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

چنگیزی تخلص نہیں تھا بلکہ اس کی رگوں میں سچ مچ چنگیز خان کا خون دوڑ رہا تھا۔  
 لیے اسے بھی آگیا تھا تاؤ اور پھر اسی اسپاٹ پر پنک مٹانے کی ٹھہر گئی تھی۔

لیکن وہ دیو کوئی بروہانی تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پوری  
 گلابار میں خود اس قبیلے کے علاوہ اور کسی بھی قبیلے میں زیادہ قد آور لوگ موجود نہیں ہیں اور  
 دیو تو بہت ہی زیادہ لمبا چوڑا تھا۔ اتنا قد آور اور جسم آدمی تو خود اس کے قبیلے میں نہیں تھا۔

وہ سوچتا ہوا سڑک کی جانب بڑھتا رہا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد  
 کی ضرورت پیش آنے والی تھی۔ پھر دفعتاً اسے سارہ کی بیہوشی یاد آئی۔ کون جانے اب  
 اسے ہوش آیا ہو گا یا نہیں..... خدا کی پناہ..... اس کی تو آواز ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ بالکل  
 دیو کے سے انداز میں تہقہہ لگا رہی تھی.....!

اوہ..... کیا نام تھا..... وہ نام یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا..... کسی جن کا نام لیا تھا۔  
 اس نے عورتوں پر جن آنے کے بہت سے قصے سن رکھے تھے لیکن اس سے پہلے ایسی کوئی  
 عورت نظر سے نہیں گزری تھی۔ ان کہانیوں پر بھی اسے یقین نہیں تھا، لیکن سارہ کی آواز  
 خود اس کی آواز تو ہرگز نہیں معلوم ہوتی تھی۔

وہ سہاچتا رہا اور پھر اسے وہ نام بھی یاد آگیا۔ ”اشقر جن“ اس نے یہ نام پہلے کہاں  
 تھا۔ یادداشت پر زور دینے لگا۔ اشقر جن اشقر جن..... اوہ اشقر دیو زاد..... داستان امیر  
 میں ان کے گھوڑے کا نام تھا۔ دیو اور پری کے اتصال کا نتیجہ..... کوہ قاف سے لائے  
 امیر حمزہ.....!

اشقر جن..... واہ..... لیکن سارہ کی وہ حرکت اداکاری تو نہیں تھی۔ ہرگز نہیں اتنی

”دو اس گاڑی میں تھیں اور دو اس گاڑی میں..... لال..... لیکن ہم سب یہاں ہیں۔“  
 ”چلو اترو.....!“ چنگیزی نے بائیں جانب والے ساتھی کو دھکا دیا۔

دوسری گاڑی بھی تھوڑے ہی فاصلے پر موجود تھی۔ وہ سب اس کی طرف دوڑنے لگے۔  
 چاروں لڑکیاں گاڑی میں موجود تھیں اور وہ بھی جاگ نہیں رہی تھیں۔ ان میں سے ایک آوازیں دے کر جگائی گئی اور اس نے بقیہ کو جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ پھر اس کے حلق سے ایک خوفزدہ سی چیخ نکلی تھی اور وہ سارہ کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھے جا رہی تھی۔

سب بیدار ہو گئی تھیں..... لیکن سارہ اب بھی بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی اور پھر سبھی پاگلوں کی طرح چیخنے لگے۔ سارہ پتھر کی طرح سخت ہو گئی تھی۔ پتھر..... بیجان..... کی آنکھوں بند تھیں..... پتھر سانس نہیں لیا کرتے... اس لیے زندگی کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا اس کے باوجود بھی وہ فوری طور پر وہاں سے روانہ ہو سکتے تھے۔ گاڑیوں کے پیچھے کی لاعلمی میں حیرت انگیز طور پر کارآمد ہو گئے تھے۔

کچھ دیر بعد اس نے جیپ روکی تھی اور فٹ پاتھ پر اتر گیا تھا۔ تعاقب کرنے والی لڑکی کچھ آگے بڑھ کر فٹ پاتھ سے جا لگی۔

قاسم اونٹ کی طرح منہ اٹھائے چالیس منزلہ عمارت ”الجمہوریہ“ کی طرف چل پڑا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتا تماشہ بن کر رہ جاتا۔ لوگ اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے تھے اور پلٹے رک کر اس طرح دیکھنے لگے جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہو۔

اٹھائیسویں منزل کے لیے روانگی لفٹ کے ذریعہ ہوئی تھی اور وہ لفٹ میں تنہا تھا۔

اٹھائیسویں منزل تک پہنچتے پہنچتے اس کی کمر اور شانوں میں درد ہو جاتا تھا کیونکہ لمبے

جسم کو موڑے بغیر وہ لفٹ میں سما ہی نہیں سکتا تھا..... لفٹ ہوائے ایک گوشے میں دبکا

بیانی روکنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ قاسم کی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ یہ بات پہلے ہی

سے ہو گئی تھی کہ وہ اسے لفٹ میں تنہا لے جایا کرے گا اور اس کی طرف دیکھا نہیں کرے

نہ اس کے عیوض اسے روزانہ پانچ روپے ملتے تھے۔ قاسم لفٹ میں داخل ہوتے ہی اس

سبٹ پر پانچ روپے کا نوٹ رکھ دیتا تھا۔

معمول کے مطابق اس وقت بھی یہی ہوا تھا۔

## جاسوسی کا پہاڑ

قاسم کی روز کپاؤنڈ کے پھانک میں برآمد ہو کر سڑک پر آئی اور بہت دھیمی رفتار سے مغرب کی طرف بڑھنے لگی۔ اس نے عقب نما آئینے کی پوزیشن اس طرح بدلی تھی جیسے کہ تعاقب کرنے والے کو نظر میں رکھنا چاہتا ہو۔

کچھ دور چل کر اس نے رفتار بڑھائی۔ شاید مطمئن ہو گیا تھا۔ اس کا تعاقب کسی نے بھی نہیں کیا۔

لیکن جب تیرہویں شاہراہ کے چوراہے سے سچ مچ اس کا تعاقب شروع ہوا تو اسے تعاقب کا شبہ تک نہ ہوسکا۔

روز تھوڑی دیر بعد ایک بستی کی کسی دور افتادہ عمارت کے کپاؤنڈ میں داخل ہوئی تھی۔ قاسم گاڑی سے اتر کر برآمدے میں پہنچا۔ صدر دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ قفل کھول کر

لفٹ ہوائے لفٹ کو گراؤنڈ فلور پر واپس لایا تو ایک خوش شکل اور دہلی پتلی عورت نے انتظار تھی اور اتفاق سے اس لفٹ کے قریب کوئی ایسا آدمی بھی موجود نہیں تھا جسے اوپر جانا ہو۔

لفٹ ہوائے لفٹ کو گراؤنڈ فلور پر واپس لایا تو ایک خوش شکل اور دہلی پتلی عورت نے انتظار تھی اور اتفاق سے اس لفٹ کے قریب کوئی ایسا آدمی بھی موجود نہیں تھا جسے اوپر جانا ہو۔

”نہیں جناب.....!“

”اچھا تو تم ہی مؤقلہ سے پوچھ لو کہ انہیں کیا تکلیف ہے۔“

”وہ صرف آپ سے گفتگو کرنا چاہتی ہیں۔“

”ہم ممکن..... گفتگو میں نہیں کرتا..... زیروٹو کرتا ہے۔“

”وہ موجود نہیں ہیں.....!“

”کہہ دو کہ گفتگو والا موجود نہیں ہے۔ پھر کبھی تشریف لائیں۔“

”وہ کسی طرح مانتی ہی نہیں!“

”جوان ہے.....!“ قاسم نے منہ چلا کر پوچھا۔

”جی ہاں.....!“

”اچھا تو لاؤ اسے..... مگر گفتگو تم ہی کرو گی۔“

”بہت اچھا جناب!“

قاسم سیدھا ہو بیٹھا اور آنکھوں میں کچھ اس قسم کی خونخواریت پیدا کرنے کی کوشش نے لگا تھا کہ آنے والی موکلہ کانپ کر رہ جائے لیکن ہوا یہ کہ موکلہ کی شکل دیکھ کر خود قاسم ٹھکی بندھ گئی..... یہ موکلہ خود اسکی اپنی بیوی تھی جس کی لاعلمی میں یہ کھڑا گ پھیلا بیٹھا تھا۔ بوکھلاہٹ میں نہ جانے کون کون سی حرکتیں سرزد ہو جاتیں لیکن اسے فوراً یاد آ گیا کہ وہ نو میک اپ میں ہے۔ پہچان تو ہو سکے گی نہیں لہذا جی کڑا کر کے خاموش بیٹھے رہو۔

سیکرٹری موکلہ کو کرسی پیش کرتی ہوئی بولی۔ ”باس صرف سننے ہیں۔ بولتے نہیں!“

بیوی قاسم کو گھورے جارہی تھی اور قاسم بھی آنکھیں پھاڑے بیٹھا تھا۔

”آپ اپنا مسئلہ بیان کیجئے!“ سیکرٹری بولی۔ ”ہم معقول معاوضے پر نہ صرف مسئلے کا

سماتے ہیں بلکہ عملی طور پر بھی مدد کرتے ہیں۔“

”میرا مسئلہ میرا شوہر ہے۔“ قاسم کی بیوی ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

”کیا آپ طلاق لینا چاہتی ہیں؟“

”کیا آپ اوپر تشریف لے جائیں؟“ لفٹ ہوائے نے بڑے ادب سے پوچھا۔

”اسی فلور پر جہاں اسے چھوڑ آتے ہو!“ عورت نے جواب دیا۔

”اوہ.....!“ لفٹ ہوائے کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

”دفتر کس نام سے ہے؟“ عورت نے اسے نظر انداز کر کے پوچھا۔

”پتا نہیں جناب..... ویسے بہت لوگ پتا پوچھتے ہوئے آتے ہیں۔“

وہ لفٹ میں داخل ہو گئی۔ اسے بھی لفٹ ہوائے نے اٹھائیسویں فلور پر چھوڑا۔

اس دوران میں قاسم اپنی میز پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے گھنٹی بجائی اور ایک نجیم شیم؟

عورت نے کمرے کا دروازہ کھول کر کہا۔ ”لیس باس.....!“

”ادھر آ کر بیٹھو.....!“ قاسم نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”لیس باس.....!“ اس نے مؤدبانہ قیاس کی تھی۔

”رپورٹ.....!“ قاسم اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”کیس نمبر جناب.....؟“

”قیس نمبر.....!“ قاسم اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”قیس نمبر بھی تم ہی بتاؤ۔“

”وہ..... وہ.....!“ عورت بھلائی۔

”زیروٹو کہاں ہے؟“

”ابھی نہیں تشریف لائے جناب!“

”لاٹ صاحب کا بچہ ہے سال..... روز لیٹ آتا ہے..... جاؤ..... غیر حاضری لگاؤ۔“

”بہت بہتر جناب!“ اس نے کہا اور اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی! قاسم اس

چلنے کے انداز کو بڑی لگاؤ سے دیکھ رہا تھا۔

وہ چلی گئی! دروازہ بند ہونے پر اس نے بڑی لمبی سانس کھینچی تھی۔ پھر کرسی کی پشت

ڈھیر ہو جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ انٹرکوم سے آواز آئی۔ ”ایک موکلہ فوری طور پر ملنا چاہتی

”ہرگز نہیں!“

”پھر ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟“ سیکرٹری نے پوچھا۔

”میں اپنے شوہر کو پٹوانا چاہتی ہوں۔“

قاسم نے سختی سے دانت بھینچ لئے لیکن دم بخود بیٹھا رہا۔

”ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتے محترمہ۔“ سیکرٹری بولی۔

”ارے یہ تو عین ثواب کا کام ہو گا۔“ قاسم کی بیوی نے قاسم کی طرف دیکھ کر بولی۔

”میں نہیں سمجھتی محترمہ!“

”اگر اسکی دونوں ٹانگیں توڑ دی جائیں تو میں فی ٹانگ دس ہزار روپے تک دے سکتی ہوں۔“

”معقول رقم ہے!“ سیکرٹری سنجیدگی سے سر ہلا کر بولی اور قاسم اسے قہر آلود نظروں سے

دیکھنے لگا تھا۔

”تم لوگ اس مسئلے پر اچھی طرح غور کر لو۔“ قاسم کی بیوی اٹھتی ہوئی بولی۔ ”میں آ

پھر آؤں گی۔“

سیکرٹری اسے رخصت کرنے صدر دروازے تک گئی تھی اور پھر قاسم کے کمرے

واپس آ گئی تھی۔

”کیا خیال ہے جناب؟ رقم تو خاصی ہے۔“ اس نے قاسم سے کہا۔

”خیال.....؟ قاسم دباڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ اور بھی کہتا لیکن جلد ہی سنبھل گیا۔ وہ آ

میک اپ میں صرف باس تھا..... قاسم نہیں.....!

سیکرٹری اسے سہی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ قاسم کو کچھ نہ سوجھی تو بولا۔ ”قہاں مرنا

زیر وٹو.....!“

”وہ..... وہ..... جناب زیر وٹو کی یہ حرکت میری سمجھ میں نہ آ سکی!“

”قونسی حرکت؟“

”اس عورت کے پیچھے ہی پیچھے وہ بھی آفس میں داخل ہوا تھا لیکن اس کی شکل دیکھنے

ہی بھاگ کھڑا ہوا۔“

”ہاں..... ہاں..... اب تو بھاگے ہی غاسلا..... کھیر کھیر..... دج نلوں غا۔“

”میں نہیں سمجھتی جناب!“

”پپ رہو..... میں قون ہوں؟“

”زیر وٹو جناب!“

”وہ کون ہے؟“

”زیر وٹو.....!“

”تم کون ہو؟“

”زیر وٹو جناب!“

”ٹھیک ہے..... جاؤ اپنا کام کرو!“

”لیکن اس عورت کا مسئلہ.....؟“

”مسئلے کی ایسی تیسی..... جو کہہ رہا ہوں قرو.....!“

وہ کمرے سے چلی گئی اور قاسم کرسی پر گر کر ہانپنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ پھر کھلا تھا اور کرائم رپورٹر انور کی شکل دکھائی دی تھی۔

قاسم بھڑک اٹھا۔ ”اتنی دیر سے کیوں آئے؟“

”پہلے تم بتاؤ سب خبریت ہے نا۔“ انور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا مسکرایا۔

”تم بھانے قیوں تھے۔ سب سالے مصیبت میں پھنسانے والے ہی ملتے ہیں۔“

”کیا پہچان لیا بیگم صاحبہ نے؟“

”میں نہیں جانتا.....!“

”آخر بات کیا تھی.....؟ کیوں آتی تھیں!“

”میں قہتا ہوں..... خاموش رہو!“

”زیر قہری.....!“ انور نے انٹرکوم کی طرف جھک کر سیکرٹری کو آواز دی۔ ”یہاں آؤ.....!“

”نہیں۔ یہاں نہیں!“ قاسم دباڑا۔ ”وہیں جا کر پوچھ لو.....!“

انور نے اسے گھور کر دیکھا تھا اور سیکرٹری کے نمودار ہونے سے پہلے ہی کمرے سے نکل

جاتا تھا۔

قاسم نے انٹرکوم کا سوئچ آف کیا اور بہ آواز بلند سوچنے لگا۔ ”دیخو سالی اب کیا کل

”اے جاؤ..... کسی اور تو الو بنانا..... قانونی طور پر جائز نہیں ہے..... ہونہ۔“  
 ”میں غلط نہیں کہہ رہا۔“

”کیا ہم چوری چھپے یہ قائم کر رہے ہیں۔ ارے ہمارا اشتہار تو اخباروں میں چھپتا ہے۔“  
 ”سمجھنے کی کوشش کرو..... میں نے اشتہار ہی کچھ اس قسم کا بنایا ہے کہ عام طور پر ہمارا“  
 ”نفسیاتی مسائل سے متعلق سمجھا جائے لیکن دوسرے ضرورت مند سمجھ لیں کہ ہم اس سے“  
 ”بے زیادہ کچھ کر سکیں گے لہذا ایسے لوگ جو پولیس سے مدد نہیں لینا چاہتے۔ ہمارے پاس“  
 ”ڈے آتے ہیں اور تم یہ بھی دیکھ چکے ہو کہ ہمارے پاس کچھ نفسیاتی مریض بھی آئے ہیں۔“  
 ”یہ اس ناکام لیڈی ڈاکٹر کو زیر و قہری بنانا پڑا ہے۔ دو ہزار روپے ماہوار وہ اپنی پرنکشن“  
 ”نہیں کما سکتی تھی۔ اپنے مطب میں بیٹھی کھیاں مارا کرتی تھی۔“  
 ”میں سمجھ گیا۔“ قاسم پر تشویش لہجے میں بڑبڑایا۔

”اس لیے اب مجھ بتا دو کہ تین دن تم کہاں غائب رہے۔“  
 ”ہرگز نہیں بتاؤں گا۔“

”آخر کیوں.....؟ ہمارے معاہدے میں رازداری تو نہیں شامل تھی!“  
 ”اے جاؤ..... اب قیام بزنس میں تمہیں یہ بھی بتا دوں گا کہ زیر و قہری مجھ سے محبت“  
 ”نے لگی ہے۔“

”دیکھو بیٹے جاسوسی کے پہاڑ... میں نے تمہیں پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ اس چکر میں نہ پڑنا۔“  
 ”کوئی آفت آگئی!“

”یہ جو آکر فی الحال چلی گئی ہے۔ ضرور کوئی آفت لائے گی۔ تم دیکھ لینا۔“  
 ”اے ہاں..... یہ تو ہے!“ قاسم دفعتاً بدحواس ہو گیا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر بھرائی ہوئی“  
 ”از میں بولا۔“ ”اچھی بات ہے! ایک ہفتے کی چھٹی کر دو..... لیکن زیر و قہری.....؟“  
 ”وہ کہیں بھاگی نہیں جاتی۔ شہر ہی میں موجود رہے گی۔“

”اچھا..... اچھا.....!“

”میں تو چلا..... تم بھی چلتے پھرتے نظر آؤ۔ زیر و قہری کو سمجھا دوں گا۔“  
 ”مگر بیٹا..... اسے یہ نہ بتانا کہ مولا کون تھی..... وہ سمجھتی ہے کہ ابھی میری شادی نہیں

”کھلاتی ہے..... پنوائس غی مجھے..... میری ٹانگیں تڑوائیں گی..... ایک ٹانگ کے دس ہزار“  
 ”روپے..... اچھا..... اچھا..... دیکھو غا۔ اے ہاں..... میرا جو دل چاہے غا کروں غا“  
 ”چپاتی سالی بیٹم.....!“  
 ”بات یہیں تک پہنچی تھی کہ انور واپس آ گیا۔“

”اب وہ دونوں ایک دوسرے کو گھورے جا رہے تھے۔ پھر انور سنجیدگی سے بولا۔“ ”تم“  
 ”سے ہم بزنس کر رہے ہیں۔ آخر آج ہی کیوں.....؟“  
 ”میں قیام جانوں.....!“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارا اشتہار دیکھ کر آئی ہوں..... سچ سچ تمہاری ٹانگیں تڑوا“  
 ”چاہتی ہو۔“

”بس بس..... کھاموش.....!“

”یا پھر ہو سکتا ہے کہ تمہارے اچانک غائب ہو جانے کی بنا پر انہیں شبہ ہوا ہو۔ آخر“  
 ”مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ تین دن کہاں غائب رہے تھے۔“

”ٹاپ سیکرٹ!“ قاسم مسکرا کر بولا۔ ”نہیں بتایا جاسکتا۔ اے میں جاسوسی کا پہاڑ ہوں۔“  
 ”اگر میری لاعلمی میں اپنے طور پر کچھ کر بیٹھے تو تمہاری پریشان حالی کی ذمہ داری“  
 ”پر نہ ہوگی۔“ انور خشک لہجے میں بولا۔

”میں قہتا ہوں کھاموش رہو۔“

”اور میں کہتا ہوں فی الحال دفتر میں تالا ڈالو اور گھر بیٹھ رہو۔“

”زیر و قہری کا کیا حال ہوگا۔“

”بدستور ملازم رہے گی۔ دفتر بند کر دینے سے اس کی ملازمت پر کیا اثر پڑے گا۔“

”مگر میں دفتر کیوں بند کروں!“

”تمہاری بیگم صاحبہ کے توسط سے یہ خبر حید تک ضرور پہنچے گی اور کرنل صاحب اسے ہر“  
 ”پسند نہیں کریں گے۔“

”بہت دیتے ہیں قمرل وٹل..... میں قیام سے کم ہوں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہمارا یہ بزنس قانونی طور پر جائز نہیں ہے۔“



”یہ بہت اچھا کیا۔“ حمید بولا۔

قاسم کی بیوی اسے غور سے دیکھتی ہوئی ہنس پڑی۔

”اوہ! تو تمہیں اب تک یقین نہیں کہ میں اس میں ملوث نہیں ہوں۔“

”کیسے یقین آ جائے! انہیں بھی جانتی ہوں اور آپ کو بھی۔“

”سنو! میں اس کا دوست ہوں۔ اسے کسی ایسے کام کی ترغیب نہیں دے سکتا۔ جس کی

باپ وہ قانون کی گرفت میں آ جائے۔“

”قانون تو آپ لوگوں کے ہاتھوں میں کھلوتا ہے۔“

”اب مجھے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔“ حمید ناخوشگوار لہجے میں بولا۔ ”کیا تم مجھے اس

فارت کا پتا بتا سکو گی جہاں اس نے گاڑی تبدیل کی تھی اور میک اپ کیا تھا۔“

”آپ نہیں جانتے؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی مسکرائی۔

”بس اب اس مسئلے پر گفتگو نہیں ہوگی۔“ حمید بھڑک اٹھا۔

قاسم کی بیوی ٹٹولنے والی نظروں سے اسے دیکھ جاری تھی۔

”چلے یقین آ گیا کہ آپ لاعلم ہیں!“ اس نے بالآخر کہا اور حمید نے ایک طویل سانس لی۔

آج قاسم کی بیوی نے اسے فون کر کے گھر نہیں بلایا تھا بلکہ خود آئی تھی..... فریدی گھر

میں موجود نہیں تھا۔

”سوال تو یہ ہے کہ تمہیں دفعتاً اس حد تک شبہ کیوں ہوا کہ تم اس کے تعاقب میں نکل

فری ہوئیں۔“ حمید نے تھوڑی دیر بعد سوال کیا۔

”بغیر بتائے تین دن گھر سے غائب رہے تھے۔“ قاسم کی بیوی کچھ سوچتی ہوئی

بولی۔ ”مجھے یقین ہے کہ یہ سلسلہ بہت دنوں سے جاری ہے۔“

”یہ کس بنا پر کہہ سکتی ہو؟“

”دفتر جانا دو تین دن کی بات نہیں اور اب تو میں نے اشتہارات کے تراشے بھی اکٹھا کر

لے تھے۔ ان میں تین ماہ قبل کے اشتہارات بھی شامل ہیں۔ ادارے کا نام ”راز دار“ ہے۔“

”راز دار حمید۔“ حمید چونک پڑا۔

”کیوں؟ کیا بات ہے!“ وہ اسے غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔

ہوئی!“ قاسم شرما کر بولا۔

لیکن انور اس کی پوری بات سننے بغیر ہی کمرے سے نکل گیا تھا۔ قاسم نے یراسا سنا  
کر بند دروازے کو گھونٹہ دکھایا اور پھر اس طرح پیٹ سہلانے لگا جیسے مرد لاشی ہو۔

## فریدی پر حملہ

”یقین کرو..... میں کچھ بھی نہیں جانتا۔“ حمید نے زج ہو کر بُرا سامنہ بنایا۔

”تو جناب! خود ان میں تو اس کی صلاحیت نہیں ہے کہ کسی سہارے کے بغیر کوئی کام کر بیٹھیں۔“ قاسم کی بیوی نے خشک لہجے میں کہا۔

”یہ بھی درست ہے!“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”اچھا اس عورت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جو اس کی سیکرٹری بنی ہوئی تھی۔“

”میں نہیں جانتی..... وہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے۔“ قاسم نے کچھ نہیں بتایا۔

”میں نے اسی عورت سے نام پوچھا تھا۔“ قاسم کی بیوی ہنس کر بولی۔ ”زیر و قبری!“

”کیا مطلب؟“

”اس نے یہی بتایا ہے..... بہت تیز عورت معلوم ہوتی ہے۔“

”دفتر میں..... اس عورت کے علاوہ کوئی اور بھی تھا۔“

”نہیں..... میں کہتی ہوں حمید بھائی اگر آپ انہیں اس حلیے میں دیکھ لیتے تو کسی

طرح بھی اپنی ہنسی نہ روک سکتے۔ یہاں تو سنجیدگی برقرار رکھنے کے سلسلے میں پیٹ میں درد ہو گیا تھا۔“

”تو اب وہ گھر سے باہر نہیں نکل رہا۔“

”جی نہیں! کہتے ہیں ایک ہفتے تک آرام کروں گا۔“

”تم نے اس پر ظاہر تو نہیں ہونے دیا کہ وہ میک اپ میں پہچانا جا چکا ہے۔“

”قطعاً نہیں! میں نے اپنے معمولات میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔“

”وہ تو کسی ماہر نفسیات کا کھڑاگ ہے۔“  
 ”جی نہیں!“

ارے ہاں..... لیڈی ڈاکٹر فوزیہ کا ادارہ ہے۔ اس دوران میں کئی پارٹیوں میں اس سے ملاقات ہو چکی ہے۔ ذہنی امراض کی معالج ہے ”راز دار“ اسی کا اسٹیلشمنٹ ہے۔

”ذرا حلیہ تو بیان کیجئے اس لیڈی ڈاکٹر کا۔“  
 حمید لیڈی ڈاکٹر فوزیہ کا سراپا بیان کرنے لگا۔

”آپ زیر و تھری کا حلیہ بیان کر رہے ہیں۔“ وہ اپنا اوپری ہونٹ بھینچ کر بولی۔  
 ”اگر یہ بات ہے تب تو پھر مجھے سنجیدہ ہونا پڑے گا۔“

”چلئے..... میں آپ کو وہ عمارت دکھاؤں..... جہاں سے وہ حضرت میک اپ میں برآمد ہوئے تھے۔“

”ضرور چلوں گا۔“

”قفل شکنی کے آلات بھی رکھ لیجئے گا۔ عمارت مقفل ہی ہوگی۔“

عمارت گھنی آبادیوں سے دور واقع تھی۔ وہاں پہنچ کر حمید کو ایسی تدبیروں سے قفل کھولنا پڑا تھا کہ اسے دوبارہ بند بھی کیا جاسکتا۔

وہاں ایک کمرے میں میک اپ کے سامان اور ملبوسات کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ شاید دوسرے کمرے استعمال ہی نہیں کئے گئے تھے۔

”ناممکن.....“ حمید بڑبڑایا۔

”کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟“ قاسم کی بیوی اسے غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔

”بلاشبہ وہ اپنے طور پر اس حد تک نہیں جاسکتا۔“

”میں سمجھتی ہوں..... اسی لئے تو خیال آپ کی طرف گیا تھا۔“

”شہر میں اونٹ بدنام.....!“

”بہر حال میں کچھ نہیں جانتی۔ اس معاملے کو آپ ہی دیکھیں گے۔“

”ایک آدمی ابھی ہے۔ جس نے ایک آدھ بار اسے اپنی مقصد برآری کے لئے

استعمال کیا۔

”کون ہے؟“

”لیکن وہ مشکل ہی سے اعتراف کرے گا۔“

”مجھے بتائیے ناکون ہے؟“

”اشارہ کا کرائم رپورٹر انور.....!“

”وہ رشیدہ والا.....!“

”ہاں..... وہی..... اگر تم اس کے منہ پر تھوڑا سا جھوٹ بول سکو تو میں اگلوں گا۔“

”میں نہیں سمجھی!“

”بتاتا ہوں.....“ حمید کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیا تم نے اسے کبھی دیکھا ہے۔“

”قاسم صاحب کے پاس تصویر دیکھی تھی۔“

”یعنی اسے دیکھ کر پہچان لوگی۔“

”ہوسکتا ہے۔“

”بہر حال اسے دیکھتے ہی تمہیں میساختہ کہنا ہوگا کہ یہی صاحب تھے۔“

”میں نہیں سمجھی۔“

”تم نے اسے ”راز دار“ کے آفس میں دیکھا تھا۔“

”مگر میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا..... تمہیں کہنا یہی ہوگا کہ وہاں تمہیں دیکھتے ہی کھسک گیا

تھا۔ شاید سمجھا تھا کہ تمہاری اس پر نظر نہیں پڑی۔“

”اوہ..... میں سمجھ گئی..... لیکن اس کی جرح کے جواب میں گڑبڑا گئی تو؟“

”تمہیں صرف اتنا ہی کہنا پڑے گا۔ اس کے بعد تم اس کی کسی بات کا جواب نہ دوگی۔“

”ٹھیک ہے..... میں تیار ہوں.....!“

انور اتفاق سے آفس ہی میں مل گیا۔ حمید اور قاسم کی بیوی کو دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔

”ایسا نظر آنے لگا تھا جیسے قاسم کی بیوی کو پہلی بار دیکھا ہو۔“

”آپ کی تعریف؟“ وہ اپنی بائیں آنکھ دبا کر مسکرایا اور قاسم کی بیوی بولی۔ ”یہی صاحب تھے۔“

حمید انور کو گھورے جا رہا تھا۔

بڑے ڈھیل دے دی ہے۔ آج کل تمہارے علاوہ اور کسی سے نہیں ڈرتا۔ کیا فائدہ کہ تم اپنا بچہ کھو بیٹھو۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ مردہ سی آواز میں بولی۔

حمید کا خیال درست نکلا۔ ”رازدار“ کا دفتر قاسم کے نام پر نہیں حاصل کیا گیا۔ اس کی کرایہ دار ڈاکٹر فوزیہ تھی اور وہ عمارت..... جہاں قاسم بھیس بدلا کرتا تھا۔ اس کے اپنے پیسے کی ملکیت ثابت ہوئی۔ حال ہی میں خریدی گئی تھی۔ کرائے کے لیے خالی تھی لیکن عام

اب کی لائسنس میں اس پر سے ”Toilet“ بورڈ ہٹا دیا گیا تھا۔

حمید نے انور کو سچ سچ اپنے آفس میں طلب کر لیا۔ وہ آیا تھا اور مضحکہ اڑانے والے انداز میں بولا تھا۔ ”وقت ضائع کر رہے ہو۔ میرے خلاف کچھ بھی ثابت نہ کر سکو گے۔ قاسم کی بیوی نے مجھے وہاں ضرور دیکھا ہو گا۔“

”تمہیں اعتراف ہے۔“ حمید اسے گھورتا ہوا بولا۔

”گلے گلے پانی میں۔“

”کیا یہ ثبوت نہیں ہے۔“

”کس بات کا.....؟“

”تم لوگوں نے غیر قانونی طور پر سرانصرسانی کا ادارہ قائم کر رکھا ہے۔“

”ہوش کے ناخن لو پیارے شرلاک! ڈاکٹر فوزیہ میری معالج ہے۔ آج کل میری ذہنی

توانا ٹھیک نہیں ہے۔ دو ماہ سے اس کے زیر علاج ہوں۔“

”قاسم کا وہاں کیا کام؟“

”میں کیا جانوں..... ہو سکتا ہے اس نے بھی اپنے علاج کے سلسلے میں ڈاکٹر فوزیہ سے

تعلق کیا ہو۔“

”نہیں چلے گی۔“

”یہ تو ایسی چلے گی پیارے شرلاک کہ تمہیں دن میں تارے نظر آ جائیں گے۔“

”حمید نے بے بسی سے طویل سانس لی۔ اسے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ نہیں چلے

نہ پھر بھی دھونسانے کے لیے اسے طلب ہی کر لیا تھا۔ اس طرح کم از کم قاسم کی بیوی کی پریشانی

”کیا قصہ ہے؟ اس نے بھی تیکھے لہجے میں پوچھا۔

”رازدار؟“ حمید نے سرد لہجے میں کہا۔

”کیا بکواس ہے!“

”اس بار تمہیں نہیں بخشوں گا۔ شاید کرنل صاحب بھی اس معاملے میں دخل اندازی

سکیں۔“ حمید نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔“

”آؤ چلیں!“ حمید نے قاسم کی بیوی سے کہا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔

”بات تو سنو!“ انور اٹھتا ہوا بولا۔

”وقت نہیں ہے..... آفس میں طلب کر کے سنوں گا۔“

انور نے لا پرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر استہزاء کا مسکراہٹ تھی۔

یہ دونوں نکلے چلے آئے۔

”اب کیا ہو گا۔“ قاسم کی بیوی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اس میں اسی کا ہاتھ ہے۔ لیکن شاید اسے ثابت نہ کیا جاسکے۔“

اس کا انحصار قاسم کے اعتراف ہی پر ہو گا۔“

”میں نہیں سمجھی۔“

”الجمہوریہ کا وہ اپارٹمنٹ قاسم کے نام سے حاصل نہ کیا گیا ہو گا۔ خیر میں دیکھوں گا۔“

”وہ ڈاکٹر فوزیہ!“

”تم جانتی ہی ہو کہ قاسم کچھ شیم عورتوں کے پیچھے کس طرح بھاگتا ہے۔“

”میں دیکھ لوں گی اس کتیا کو بھی۔“

”تمہیں مزید دخل اندازی کا مشورہ نہیں دوں گا۔ اب یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ قاسم کی

دانست میں ایسی ہی بنی رہو۔ جیسے تم نے اسے رازدار کے دفتر میں پہچانا نہیں تھا۔“

”میرا تو خون کھول رہا ہے۔“

”خود کو قابو میں رکھ۔ ورنہ وہ قابو سے باہر ہو جائے گا۔ عام صاحب نے بھی آخر کار تھک

”تمہاری بیوی سارے شہر میں زیر و تھری کو تلاش کرتی پھر رہی ہے۔ اگر پولیس کو علم ہو تو غضب ہو جائے گا۔“

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“ قاسم آہستہ سے بولا۔ ”ابھی ابھی کہیں سے واپس آئی ہے۔“

”میں غلط نہیں کہہ رہا۔“ حمید طویل سانس لے کر بولا۔

”یقین اس نے مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔ پہچان ہی نہیں سکی تھی۔“

”اس وہم میں نہ رہنا۔ بہت چالاک عورت ہے۔ ڈاکٹر فوزیہ کو تلاش کر لینے کے بعد

تمہاری خبر لے گی۔“

”اے یہ عورت مجھے پاگل کر دے غی۔ میں کہاں مرجاؤں۔“

”دوسری عورت کا خیال ترک کرو!“

”میں زیر و تری کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا..... سمجھے زیر و تری!“

حمید پر معنی انداز میں سر کو جنبش دے کر بولا۔ ”عورت کے بغیر زندہ رہنا سیکھو۔“

”نہیں سیکھتا!“ دوسری طرف سے قاسم دھاڑا۔ ”قیام عورت کے ابا میاں ہو.....!“

”تمہارے بھلے کو کہتا ہوں۔“

”میرے بھلے کی ایسی تیمی..... پہلے سالے تم نے مجھے جنجال میں پھنسا یا اب جیرو

قری سے چھڑا دینا چاہتے ہو۔ میں سمجھ گیا..... میری بیوی کو بھی تمہی نے اطلاع دی ہو

ٹی..... چار سو میں سالے..... جانتے ہو میرے بیاسی ہزار خرچ ہوئے ہیں!“

”جنہم میں جاؤ!“ کہہ کر حمید نے ریسپور کرڈیل پر رکھ دیا۔

پھر وہ ہنس پڑا تھا۔ قاسم کو مزید پریشان کرنے کے لیے ایک پلاٹ اس کے ذہن میں

نم لے رہا تھا۔ لیکن فی الحال وہ اسے عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تھا۔ خیر واپسی پر سہی..... اس

نے سوچا اور گھر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ساڑھے پانچ بجے تک اسے ایئر پورٹ پہنچنا تھا۔

دفتر کے دروازے ہی تک پہنچا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ پھر میز کی طرف پلٹ آیا۔

”ہیلو..... حمید اسپیکنگ!“ اس نے ریسپور اٹھا کر ماؤتھ پیس میں کہا۔

دوسری طرف سے سار جنت شاہد کی آواز سنائی دی۔ ”فوراً ایئر پورٹ پہنچے! کسی نے

فائر کے کرٹل فریدی کو زخمی کر دیا ہے۔“

تورفع ہو سکتی تھی۔ ظاہر تھا کہ ان حالات میں خود انور قاسم کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا۔

بہر حال وہ اب بھی انور کو خونخوار نظروں سے گھورے جا رہا تھا۔

”اور کچھ.....؟“ انور نے طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”تم جا سکتے ہو!“

”لیکن اب اگر تم نے پھر کبھی اس طرح مدعو کیا تو تمہارے لیے ایک عدد جھنجھو

ٹائیوں کا ڈبہ ضرور لاؤں گا۔“

حمید دانت پیس کر رہ گیا۔ انور جاتے جاتے دروازے کے قریب رک کر ایک بار بار

اس کی طرف مڑا تھا اور بائیں آنکھ دبا کر باہر نکل گیا تھا۔

”دیکھوں گا بیٹا تم کو.....!“ حمید گردن جھٹک کر بڑا بڑا بڑا۔

ٹھیک اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے بے دلی سے ریسپور اٹھایا۔ دوسری طرف

سے فریدی کی آواز سن کر چہرے پر کسی قدر بحالی کے آثار نظر آئے تھے۔

”میں ایئر پورٹ پر تمہارا منتظر ہوں۔“

”ایسی کوئی بات طے تو نہیں تھی۔“ حمید بولا۔

”ایئر جنسی..... چھ بجے والی فلاٹ سے رام گڑھ روانہ ہوتا ہے۔“

”یونہی اٹھ کر چلا آؤں۔“

”نہیں! میرا اور اپنا سوٹ کیس بھی لیتے آنا۔ جلدی کرو وقت کم ہے۔“

”زیادہ عرصہ قیام رہے گا۔“

”فی الحال یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہری آپ!“

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے کی آواز آئی اور حمید نے پُر فکر انداز میں ریسپور

کرڈیل پر رکھ دیا۔ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر قاسم کے نمبر ڈائل کئے۔ اس کی بیوی کو صورت

حال سے مطلع کرنا چاہتا تھا لیکن دوسری طرف سے قاسم کی دھاڑ سنائی دی۔

”میں انور بول رہا ہوں۔“ حمید نے انور کی آواز بنانے کی کوشش کرتے ہوئے

کہا۔ ”گھر سے باہر قدم نہ نکالنا۔“

”قیوں؟ اتنے ڈر پوق ہو غئے ہو پیارے..... ہی ہی ہی ہی.....!“

”کیا بکواس ہے۔“ حمید بوکھلا کر بولا۔

”گولی بائیں بازو میں لگی ہے۔“

”خدا کی پناہ! میں چیخ رہا ہوں۔“ حمید نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اپنے پیروں پر کھڑا بھی نہ رہ سکے گا۔

## ٹماٹر

پتا نہیں کس طرح وہ ایئر پورٹ پہنچا تھا۔ دفتر سے سیدھا ادھر ہی نکلا چلا گیا تھا۔ اس خبر کے بعد سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہ سوٹ کیسوں کے لیے گھر بھی جاتا۔

فریدی نے اس دوران میں اس سے کسی اہم معاملے کا بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ ان کے پاس کوئی ایسا کیس بھی نہیں تھا جس کے سلسلے میں اچانک رام گڑھ جانے کی ضرورت پیش آ سکتی۔ پھر یک بیک رام گڑھ کا سفر کیا معنی رکھتا تھا اور یہ حملہ ایئر پورٹ ہی پر ہوا تھا جب کہ وہ چھ بجے والی فلائٹ سے رام گڑھ جانے والے تھے۔

سارجنٹ شاہد ایئر پورٹ پر موجود تھا۔ اس نے بتایا کہ ایسولنس کار فریدی کو پولیس ہاسپٹل لے گئی ہے۔

”لیکن یہ ہوا کیسے..... بازو کی ہڈی تو متاثر نہیں ہوئی۔“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ فائر سائینلر لگے ہوئے رینج پستول سے کیا گیا تھا۔“

”جس وقت گولی لگی..... وہ کہاں تھے؟“

”کسی کو فون کر کے ٹیلیفون بوتھ سے برآمد ہو رہے تھے۔“

”کون سا بوتھ ہے..... مجھے دکھاؤ۔“

”وہ بعد میں دیکھئے گا۔ کرنل صاحب نے کہا تھا کہ جیسے ہی آپ یہاں پہنچیں آپ کو

پولیس ہاسپٹل بھیج دیا جائے۔“ شاہد نے کہہ دیا۔ یہ ابھی حال میں ہی فریدی کی ماتحتی میں آیا تھا۔ خوش شکل توانا اور جوان العمر تھا۔

”یہاں کون چھان بین کر رہا ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”ابھی تو کوئی بھی نہیں۔ صرف میں ہی ہوں۔ پہلے سے کرنل صاحب کے ساتھ تھا۔“

”ہوں..... اچھا تو تم یہیں ٹھہرو..... میں ابھی واپس آتا ہوں۔ اس بوتھ کے قریب کسی

بچی نہ جانے دینا۔“

”پہلے ہی اس کا انتظام کر چکا ہوں۔ دو ڈیوٹی کانسٹیبل اس کے سامنے موجود ہیں اور

ان جگہ سے بھی لوگ ہٹا دیئے گئے ہیں۔ جہاں سے فائر کیا جاسکتا ہے۔“

”کنڈیشن کیسی ہے؟“

”وہی جو کسی زخمی شیر کی ہو سکتی ہے۔“ شاہد طویل سانس لے کر بولا۔

اس کے بعد حمید ہاسپٹل کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ شاہد کے آخری جملے نے اسے بڑی

زحار سے بندھائی تھی کہ حالت بہتر ہی ہوگی۔ بیہوش ہو جانے والوں کو زخمی شیر نہیں کہا جاسکتا۔

ہاسپٹل پہنچتے ہی اپنے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ اس نے فریدی کو آرام کرسی پر

نیم دراز پایا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

”کوئی خاص بات نہیں۔ ہڈی محفوظ ہے۔“ اس نے حمید کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے

کہا۔ ”حملہ آور نے شاید دل کا نشانہ لیا تھا۔ لیکن ٹریگر دباتے وقت ہاتھ بہک گیا۔“

حمید کچھ نہ بولا۔

”کیا دل ہی دل میں مجھے برا بھلا کہہ رہے ہو۔“ فریدی نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”نہیں! سوچ رہا ہوں کہ مجھ سے راز داری برتنے کا انجام یہی ہونا چاہئے۔“

”کیسی راز داری؟“

”آخر اچانک رام گڑھ کا پروگرام کیسے بن گیا تھا۔“

”ایک بجے تک مجھے علم نہیں تھا کہ رام گڑھ جانا پڑے گا۔“

”بہر حال اس طرح آپ کو رام گڑھ جانے سے روک دیا گیا۔“

”ضروری نہیں ہے کہ یہی بات ہو۔ حملہ آور ہاتھ نہیں آسکا۔ فائر بے آواز تھا اور مجھے

نہیں ہے کہ ٹیلیفون بوتھ کے سامنے والے ٹوائٹ سے کیا گیا تھا، جس کا دروازہ کشم چیک

بٹن کی طرف بھی کھلتا ہے۔“

نے اسے میری نسلی اکڑ پر محمول کیا ہو۔ بہر حال یہ بھی حقیقت ہے کہ میں اس کیس میں پوری طرح ملوث تھا لیکن تم نے عدالت کے فیصلے کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ اس سے تو یہی ثابت ہوتا ہے نا کہ تم ذاتی طور پر مجھ سے کوئی پرغاش نہیں رکھتے۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ تم میری موجودہ پریشانی رفع کرنے میں میری مدد کرو گے۔ مجھے یقین ہے اس پریشانی سے مجھے تمہارے علاوہ اور کوئی نجات نہیں دلا سکتا۔ میں خود آتا لیکن اس پریشانی کی بناء پر یہاں سے ہل بھی نہیں سکتا۔ کیا میں امید کروں کہ تم کچھلی ساری باتوں کو بھلا دو گے۔

”خان دارا“

حمید نے خط ختم کر کے فریدی کی طرف دیکھتے ہوئے متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

”اب تم اور شاہد رام گڑھ جاؤ گے۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”اور مجھے خان دارا سے ملنا پڑے گا۔“

”اس کی تشفی کے لیے۔ اس سے کہہ دینا کہ میں کسی وقت بھی پہنچ سکتا ہوں۔ تم اسے کہنے ہو کہ فی الحال میری بجائے تم کیوں پہنچے ہو۔ اگر وہ خود اپنی اس پریشانی کا ذکر کرے تو بدور نہ کسی قسم کی پوچھ گچھ مت کرنا۔“

”لیکن یہ شاہد کیوں؟ اپنی سالیوں کے قصے سنا کر مجھے زندہ درگور کر دے گا۔“

”وہ ساتھ جائے گا۔“ فریدی نے حمید کو گھورتے ہوئے کہا۔

”جیسی آپ کی مرضی!“

”لیکن اب رواں لگی کی دوسری صورت ہوگی۔ عادل آباد تک کار سے سفر کر دے گا اور انار پورٹ پر ایک آدمی تمہارا منتظر ہوگا، جو پہلی فلائٹ سے تمہیں رام گڑھ بھجوا دے گا۔“

”خود ہی تمہیں پہچان کر مل بیٹھے گا۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں!“

اس سے رخصت ہو کر حمید نے گھر کی راہ لی۔ یہ حملہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ خان دارا اس سے زیادہ چونکا دینے والا تھا لیکن حملے میں خود اس کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ وہ تو اس خط سے بغیر بھی حملہ کر سکتا تھا۔ کسی کو شبہ بھی نہ ہو پاتا کہ حملہ خان دارا کی طرف سے ہوا ہوگا۔

”معاظے کی نوعیت کا علم ہوئے بغیر میں آپ سے متفق نہیں ہو سکتا۔“

”کیوں.....؟“

”ضروری نہیں کہ آپ کا کوئی غیر متعلق دشمن آپ پر اسی دوران میں حملہ آور ہو۔“

”آپ کسی فوری ضرورت کے تحت رام گڑھ جارہے ہوں۔“

”کام فی الحال نجی ہی ہو سکتا ہے۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”میں نہیں سمجھا۔“

”میں کسی سرکاری کام سے رام گڑھ نہیں جا رہا تھا۔“

”بات کو طول دے کر آپ میری الجھنوں میں اضافہ کر رہے ہیں۔“

”بیٹھ جاؤ!“ فریدی نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آج ایک بجے خان دارا کا ایک خصوصی قاصد اس کا خط لایا تھا۔“

”خان دارا.....!“ حمید چونک پڑا۔

ہاں..... یہ دیکھو!“ فریدی نے ایک لفافہ جیب سے نکال کر حمید کی طرف بڑھا دیا۔

خان دارا نے لکھا تھا۔

کرمل فریدی!

میرے دادا اور تمہارے دادا ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے۔ تمہارے باپ کا دل میرے باپ کی طرف سے صاف نہیں تھا۔ لیکن انہوں نے کبھی اس دشمنی کا کوئی ثبوت نہیں پیش کیا۔ تم ان خاندانی رنجشوں کے قائل نہیں تھے۔ دادا کا انتقام پوتے سے لینے کو غیر انسانی فعل سمجھتے تھے۔ لیکن لارڈ زوپن ڈیل والے کیسٹل میں تم نے مجھے بھی شامل کر لیا..... زوپن ڈیل نے عدالت میں سارا الزام اپنے سر لے لیا اور میں باعزت طور پر بری کر دیا گیا۔ تم چاہتے تو مجھ پر دوسرے الزامات عائد کر کے میری گلو خلاصی کو ناممکن بھی بنا سکتے تھے۔ لیکن تم نے ایسا نہیں کیا۔ مجھے تم سے شرمندگی تھی۔ اس لیے کبھی تمہارا سامنا نہیں کر سکا۔ ہو سکتا ہے تم

فی دہن بات خواہ کہیں سے شروع ہوئی ہو اس کا اختتام شاہد کی سسرال ہی پر ہوتا۔ کیوں اس کی بات کرتا تھا۔ ہر وقت بولتے ہی رہنا چاہتا تھا۔ خاموشی کے عالم میں عجیب سا کرب اس کی بات سے جھانکنے لگتا تھا۔

اس وقت بھی یہی حالت تھی۔ کنکھیوں سے حمید کی طرف دیکھتا اور پہلو بدلتے لگتا۔ حمید اس کیفیت سے بے خبر نہیں تھا۔ دفعتاً شاہد بول ہی پڑا۔

”میرے سسر صاحب اس بڑھاپے میں بھی بڑی اچھی ”ڈرائیونگ“ کرتے ہیں۔“

”اے باپ دادا بھی ہیں تمہارے یا پیدائش بھی سسرال ہی میں ہوئی تھی؟“

”بہت اچھے ہیں کیپٹن!“ شاہد نے برامانے بغیر کہا۔

”برا کون ہے اس دنیا میں.....!“

”اچھا تو آپ اپنا ہی کوئی قصہ سنائیے۔ خاموشی سے میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔“

”میرا کوئی قصہ نہیں آج کل۔ لڑکیاں اتنی موڈرن ہو گئی ہیں کہ شلجم لگنے لگی ہیں۔“

”شلجم.....؟ کیا بات ہوئی..... میں نہیں سمجھا۔“

”میرے لیے قطعی سکس اپیل نہیں رکھتیں۔ عورت میں نسائیت نہ ہو تو اسے شلجم ہی تو کہیں گے۔“

”یہاں آپ میرے چچیا سر سے بالکل متفق ہیں۔“

”یہ چچا سر کیا چیز ہے؟“

”سر کے بھائی کو چچیا سر کہتے ہیں..... سر کے سارے کو میا سر کہتے ہیں۔ سر کے.....!“

”ٹٹ اپ!“

”اوہ..... کھی کھی کھی کھی.....“ وہ شرمندگی سے ہنسا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی!“ حمید نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”جی..... کیا بات!“

”تم اپنی بیوی کا ذکر کبھی نہیں کرتے۔“

شاہد ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

”کیوں؟ کیا بات ہے؟“ حمید اسے کنکھیوں سے دیکھتا ہوا بولا۔

”بیوی؟ بیوی کا دو سال ہوئے انتقال ہو گیا۔“

گھر پر شاہد اس کا منتظر تھا۔ اس نے سب سے پہلے فریدی کی خیریت معلوم کی تھی۔  
 ہوا تھا۔ ”شائد معاملہ دبا دیا گیا ہے۔“

”کیسا معاملہ؟“

”ارے کرنل صاحب پر حملہ ہوا اور بات آئی گئی ہوگی۔ بھلا کیا بات ہوئی۔ میں نے کوفون پر اطلاع دے دی تھی۔ سنتے ہی رو پڑی۔“

”اس کی اطلاع بھی دے دی سالی کو؟“ حمید نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”کک..... کیوں..... کیا غلطی کی!“

”باہر کے معاملات پر سالیوں سے گفتگو کرنے والے گدھے ہوتے ہیں۔“

”وہ تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ شائد اسی لیے آپ نے بیوی نہیں پالی۔“

”فضول باتیں نہ کرو..... کیا تم تیار ہو!“

”جی ہاں! رواں گی کس وقت ہوگی۔ کرنل صاحب نے فون پر کہا تھا کہ عادل آباد تک سزا

بائی روڈ ہوگا۔“

”ویسے یہ بتاؤ! رام گڑھ میں بھی تو تمہاری کوئی سالی نہیں رہتی۔“

”سالی کی نند رہتی ہیں۔“ شاہد خوش ہو کر بولا۔ ”ککل بالا میں آپ کو ملواؤں گا

سے..... بہت خوش اخلاق ہیں!“

”کتنے بچے ہیں؟“ حمید نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”پانچ تو تین سال پہلے تھے..... اب کی نہیں معلوم۔“

”آٹھ ہو چکے ہوں گے۔“ ”اس حساب سے تو آٹھ ہی ہونے چاہئیں۔“

”کس حساب سے۔“ حمید پھر غرایا۔

”سالانہ ہائے کے حساب سے۔“ شاہد کہتے کہتے ہنس پڑا۔

”دانت بند کرو اور سامان گاڑی میں رکھواؤ..... جس عورت کے آٹھ بچے ہوں وہ خوش

اخلاق ہو ہی نہیں سکتی۔“

شاہد نے سامان گاڑی میں رکھوایا تھا اور وہ عادل آباد کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ حمید ڈرائیو کر رہا تھا اور شاہد اگلی سیٹ پر اس کے برابر ہی بیٹھا ہوا تھا۔ حمید نے خاموشی ہی میں ممانیت

”ادہ..... مجھے افسوس ہے۔“ حمید نے کہا لیکن سوچنے لگا کہ پھر آخر سرال کیوں؟  
 ”کیا بیماری تھی؟“ اس نے کچھ دیر بعد پوچھا۔  
 ”کچھ بھی نہیں..... اچھی بھلی تھی..... امروہ کے درخت پر سے گر پڑی تھیں۔“  
 ”امروہ کے درخت پر سے.....؟“  
 ”جی ہاں..... شاخ ٹوٹ گئی تھی۔“  
 ”درختوں پر چڑھنے کا شوق تھا؟“  
 ”جی نہیں بچپن ہی سے عادت تھی۔ کسی بات پر غصہ آتا تو درخت پر چڑھ کر بیٹھ جاتی تھی۔“  
 ”میں ہوں، تو آس پاس کے سارے درخت کٹوا دیتا۔“  
 ”درخت کٹوا دینے کی دھمکی پر بیہوشی کے دورے پڑنے لگتے تھے۔“  
 ”کوئی نفسیاتی مرض تھا۔“  
 ”میری ساس صاحبہ تو کہتی ہیں کہ آسیب تھا۔“  
 ”تم پڑھے لکھے آدمی ہو کہ ایسی باتیں کرتے ہو۔“  
 ”وائرس اور جراثیم بھی تو نہیں دکھائی دیتے، لیکن ان کا وجود ہے۔ اسی طرح آسیب بھی ہوتا ہوگا۔“  
 ”منطق کو تو سرالی نہ بناؤ۔“  
 وہ پھر غمزہ سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔  
 ”نوجے رات کو وہ عادل آباد پہنچے اور حمید نے گاڑی اتر پورٹ پر روکی تھی۔  
 ایک ایسا شخص وہاں ان کا منتظر تھا جسے حمید نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس نے انہیں  
 حیرت انگیز طور پر پہچانا تھا۔ گاڑی رکتے ہی تیر کی طرح ان کی طرف آیا تھا۔  
 انہوں نے رات کا کھانا بھی اسی کے ساتھ کھایا اور گیارہ بجے والی فلائٹ سے رام گڑھ کی  
 طرف پرواز کر گئے۔  
 ڈیڑھ بجے رام گڑھ پہنچے۔ وہاں بھی ایک ایسا آدمی موجود تھا، جو انہیں شب ببری کی جگہ  
 تک لے گیا۔ یہ بھی حمید کے لیے اجنبی ہی تھا۔  
 ”شاہد صاحب یہیں مقیم رہیں گے اور آپ صبح کو وادی گلبار کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔“

## بھکی باپ

شانہ مین سوئچ آف کر دیا گیا۔ اس کے باوجود بھی حمید برآمدے تک پہنچ ہی گیا۔  
 تہوں کی چھاؤں میں ایک سایہ سا دوڑا جا رہا تھا۔ حمید نے برآمدے سے نیچے چھلانگ لگائی  
 ”رسائے کے پیچھے دوڑنے لگا۔ دفعتاً سایہ چھیننے لگا۔“ ڈیڈی ڈیڈی! بھوت نہیں ہے..... بھوت  
 نہ تو غائب ہو جاتا..... وہ تو میرے پیچھے دوڑا آ رہا تھا۔“



دوڑوں سائے ان کی طرف بڑھنے لگے اور حمید نے شاہد سے کہا۔ ”تم مین سوچ آں کر دو۔“ وہ تیزی سے برآمدے کی طرف پلٹ گیا۔ مین سوچ آں ہوتے ہی برآمدے کا بلب بھی بجی ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ برآمدے میں کھڑے ایک دوسرے کو گھورے جا رہے تھے۔ لڑکی بیس ایکس بال کی رہی ہو گی۔ شب خوابی کے لباس میں ملبوس تھی۔ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور ہنسی خمار آلود تھیں۔ جموٹی طور پر خاصی دلکش تھی۔ مرد چالیس اور پچاس کے درمیان تھا۔ جسمانی رات کے لحاظ سے طاقتور اور توانا معلوم ہوتا تھا۔

”تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟“ اس نے حمید کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بھوت ہیں! مرگٹ سے آئے ہیں!“

”آدمیت کے جامے میں رہ کر گفتگو کرو۔“

”آخر اس لڑکی نے مجھ پر پلپلے ٹماڑ کیوں پھینکے تھے۔ تم دیکھ رہے ہو میرا حلیہ!“ حمید نے نیلے لہجے میں کہا۔

”یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ تم بھوت نہیں ہو!“

”اور تم بھوت سمجھے تھے۔“

لڑکی کے باپ نے سر کی جنبش سے اقرار کیا۔

”کس بنا پر؟“

”یہ عمارت ہمیشہ بند رہتی ہے۔ کبھی کبھی رات کو اس کی کھڑکیاں روشن نظر آتی ہیں اور پھر شادریانی..... اتفاق سے ایک روشن کھڑکی میں آج تم دکھائی دیے۔ ہم سامنے والے بنگلے میں بستے ہیں! نوشی کتنی بے خوف ہے تم نے دیکھ ہی لیا۔“

”نوشی کیا چیز ہے جناب؟“ حمید نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ..... یہ..... اس کا نام نوشی ہے۔“ اس نے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”بڑی خوشی ہوئی۔“ حمید چپک کر بولا۔ ”میرا نام خوردنی ہے اور یہ میرا ساتھی کشیدنی ہے۔“ اس نے شاہد کی طرف ہاتھ اٹھایا تھا۔

”کیا تم میرا مذاق اڑانا چاہتے ہو۔ میں خانزادہ اشرف ہوں۔“

یہ کسی لڑکی کی آواز تھی۔ حمید کی رفتار سست ہونے لگی۔

پھر دور سے کسی مرد کی آواز آتی۔ ”آنے دو..... سر پھانز دوں گا۔ میرے ہاتھ میں ڈنڈا ہے۔“ ادھر عقب سے شاہد پکار رہا تھا۔ ”کیپٹن..... کیپٹن..... آپ کہاں ہیں۔ کیا بات ہے؟“ ”بھوتی معلوم ہوتی ہے!“ حمید دباڑا۔

”خبردار.....!“ دور سے مردانہ آواز آتی۔ ”ٹھہر جاؤ..... ورنہ گولی مار دوں گا۔“

”ڈنڈے سے.....؟“ حمید نے چیخ کر پوچھا۔

پھر اس نے سائے کو رکتے دیکھا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے قریب ایک اور سائے اضافہ ہو گیا۔

ادھر شاہد بھی حمید کے پاس آ پہنچا تھا۔ ان سے دونوں سایوں کا فاصلہ اتنا ہی تھا کہ ان کی گفتگو صاف سن سکتے تھے۔

”آؤ..... آؤ..... رک کیوں گئے۔“ نسوانی آواز نے انہیں مخاطب کیا۔

”ڈنڈا ہے نا تمہارے ڈنڈی کے ہاتھ میں!“ حمید بولا۔

”تم کون ہو؟“ مردانہ آواز آئی۔

”تمہاری بیٹی مجھے اچھی طرح جانتی ہے۔ اسی سے پوچھو۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب بھی وہی بتائے گی۔“

”میں کیا جانوں۔“ لڑکی تنک کر بولی تھی۔

”اچھا..... اچھا..... ختم کرو.....!“ مردانہ آواز آئی۔ ”ہم تمہیں بھوت سمجھے تھے۔ لیکن تم بھوت نہیں معلوم ہوتے۔“

”میں نے آج تک نہیں سنا کہ بھوتوں پر ٹماڑ پھینکے جاتے ہوں۔“ حمید بھنا کر بولا۔

”تم کوئی بھی ہو، ہمیں افسوس ہے۔“ مردانہ آواز آئی۔

”تشکیلیں دیکھو بغیر معاف نہیں کر سکتا۔“

”میں بھی تمہاری شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔“ مردانہ آواز میں اس بار غضبناک تھی۔

”اچھی بات ہے..... تو چلو میرے ساتھ۔“

”کیا وہ دنوں پاگل تھے۔“ شاید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا اور پھر ہنس پڑا۔  
 ”اب شاید تم پاگل ہونے والے ہو۔“ حمید اسے گھورتا ہوا بولا۔  
 ”آپ بہت خوش قسمت ہیں جہاں بھی جاتے ہیں کوئی لڑکی پہلے ہی سے منتظر ہوتی ہے۔“  
 ”میرا خیال ہے کہ کچھ دنوں کے بعد مجھے پھر ماریں گی..... ذرا اس نامعقول کھڑکی کو بھی  
 بند کر دینا۔“

”شاید نے کھڑکی بند کر دی اور احقناہ انداز میں حمید کی شکل دیکھتا رہا۔  
 ”سنو.....!“ حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”یہ چیخڑ چھاڑ محض اتفاقہ نہیں ہو سکتی۔ کرٹل صاحب رام

لڑھ آ رہے تھے اور ان پر فائر ہوا تھا۔“

”ٹمائز اور ریوالور کی گولی میں فرق ہوتا ہے کیپٹن.....!“

”تم محتاط رہنا..... میں تو صبح وادی گلبار چلا جاؤں گا۔ کیوں نہ ایک گھنٹے کی نیند لے لیں۔“

”جیسی آپ کی مرضی! ویسے میں آپ کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا۔“

”وہ کیوں جناب؟“

”نہ مجھ پر فائر ہوا تھا اور نہ ٹمائز پھینکے گئے تھے۔“

”جاؤ!“ حمید دروازے کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا اور شاید چپ چاپ چلا گیا۔

حمید بڑی طرح تھک گیا تھا۔ لیکن روشنی بند کر کے لیٹا تو نیند کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔  
 ذہن پر عجیب سی الجھن مسلط تھی۔ آخر خان دارا جیسا آدمی کن پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا ہے جن کا

غل فریدی کے علاوہ اور کسی کے پاس نہیں..... فائر..... ٹمائز..... پھر وہ لڑکی.....!“

پھر کچھ دیر بعد اس پر غشی کی طرح نیند طاری ہوئی تھی۔ پتہ نہیں کب تک سوتا رہا۔ گھنٹی کی تیز  
 آواز نے اسے بیدار کیا تھا بوکھلا کر اٹھ بیٹھا۔ سر ہانے رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ بائیں

ہاتھ سے آنکھیں ملتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھایا..... ”ہیلو.....!“

”کیپٹن پلیمز.....!“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”میں ہی بول رہا ہوں۔“

”رات والے واقعے کے بعد مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ میں آپ سے ملوں۔“

”اوہو..... تو آپ ہیں..... وہ جو مجھے اس عمارت تک پہنچا گئے تھے۔“

”اندر تشریف لے چلے خانزادہ صاحب، آپ کی صاحبزادی نے مجھے تباہ کر دیا اور اسے  
 مجھے الزام دے رہے ہیں۔“

”چلو..... چلو..... اس حماقت کی تلافی کر دیا جائے۔“ خانزادہ آگے بڑھتا ہوا بولا۔ حمید  
 اپنے بڈروم تک لیتا چلا آیا تھا۔

”یہ دیکھئے! بستر بھی تباہ ہو گیا ہے۔“

”مجھے افسوس ہے۔“ خانزادہ بولا۔ لیکن لڑکی کی آنکھوں میں شوخ سی چمک تھی۔ ایرا

تھا جیسے اپنے کارنامے پر بے حد مسرور ہو۔

”آج تک یہی نہیں معلوم ہو سکا کہ اس بیٹگلے کا مالک کون ہے۔“ خانزادہ نے حمید کو غور سے

دیکھتے ہوئے کہا۔

”صاحب کوئی بھی مالک ہو۔ آخر آپ کی صاحبزادی کو ٹمائز بازی کا حق کس نے دیا ہے۔“

”دیکھو بر خوردار! مجھے بار بار شرمندہ نہ کرو۔“

”آپ اپنی صاحبزادی کو کچھ نہ کہیں گے۔“

”قطعاً نہیں! سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جب کہ اسے میری تائید حاصل تھی۔“

”تب تو آپ سے مل کر بے حد خوش ہوئی۔“ حمید نے مصافحے کیلئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”دونوں نے گرجوٹی سے مصافحہ کیا۔ شاید انہیں حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔“

”کہاں سے آئے ہو؟“ خانزادہ نے حمید سے پوچھا۔

”مرنگ سے..... ہمارا خلائی جہاز لیکم جھیل کی سطح پر موجود ہے۔“

”جنہم میں جاؤ!“ اس نے غصیلے لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف مڑ گیا۔

لڑکی دروازے کے قریب پہنچ کر مڑی تھی اور حمید کو زبان دکھا کر تیزی سے آگے بڑھ گئی تھی۔

”جاؤ صدر دروازہ بند کر آؤ۔“ حمید نے طویل سانس لے کر شاید سے کہا۔

وہ چلا گیا تھا اور حمید بستر صاف کرنے لگا تھا..... شاید نے واپسی میں دیر نہ لگائی تھی۔

سرودا واقعے سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے بڑی طرح بے چین تھا۔

”کیا قصہ تھا کیپٹن؟“

”کاش مجھے معلوم ہوتا۔“ حمید نے کہا اور جو کچھ گزری تھی کہہ سنائی۔

”جی ہاں.....!“

”اور ہم پر جو کچھ گزری تھی اس سے باخبر بھی ہیں!“

”جی ہاں!“

”معاملہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا۔“

”آپ فکر نہ کیجئے۔ ہم دیکھ لیں گے..... ناشتے کے لیے کچن میں سب کچھ موجود ہے۔ آپ کو تھوڑی سی تکلیف کرنی پڑے گی۔ گیراج میں جیب موجود ہے۔ ناشتے کے بعد روانہ ہو جائیے۔ شاہد صاحب یہیں رہیں گے۔“

”خانزادہ اشرف کے بارے میں بھی کچھ بتاؤ۔“

”فی الحال اس سے زیادہ نہیں جانتا کہ وہ سامنے والے بنگلے میں رہتا ہے۔“

”ایک لڑکی بھی ہے۔“

”جی ہاں..... اچھا خدا حافظ۔“

سلسلہ منقطع ہونے کی آواز سن کر حمید نے ریسور رکھ دیا۔

”خدا ہی حافظ ہے۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا تھا۔

شاہد کو جگانا پڑا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر حمید نے گیراج سے جیب نکالی۔ فیول چیک کیا۔ ٹینگی لبریز تھی۔ تین گیلن پٹرول ڈبوں میں بھی ملا۔

”اچھا..... تو بس اب میں چلا۔“ حمید نے شاہد سے کہا۔

”واپسی کب تک ہوگی؟“

”حالات پر منحصر ہے۔“

”کیا مجھے اسی عمارت تک محدود رہنا ہوگا۔“

”نہیں! ایک آدھ بار سالی کی نند کے گھر تک بھی ہو آنا۔“

”..... دیکھئے..... اب آپ ہی نے شروع کیا ہے۔“

حمید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عقب سے آواز آئی ”آخاہ..... تو روانگی ہو رہی ہے۔“

”وہ دونوں مڑے۔ سامنے خانزادہ اشرف کھڑا مسکرا رہا تھا۔“

”آپ کو اعتراض ہے کوئی؟“ حمید جھلا کر بولا۔

”سنو مسٹر!“ دفعتاً خانزادہ چیخ کر بولا۔ ”میرے پڑوس کی کوئی عمارت سنگنگ کا اڈا نہیں

ہوتی۔“

”آپ ہوش میں ہیں یا نہیں!“

”یہ تو ابھی معلوم ہو جائے گا کہ میں ہوش میں ہوں یا نہیں۔“

”بھلا کس طرح معلوم ہو جائے گا؟“

”جب کسٹم والوں کا چھاپہ پڑے گا۔“

”کیا آپ نے انہیں مطلع کر دیا ہے؟“

”کیوں نہ کر دیتا..... میں ایک ذمہ دار شہری ہوں۔“

اتنے میں اس کی لڑکی نوشی بھی آتی دکھائی دی۔

”کو کسٹم بھی چلی آرہی ہیں چھاپہ مارنے۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔“ خانزادہ غرایا۔

”ڈیڑھ پونڈ چرس لے کر پیچھا چھوڑ دیجئے۔“

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“

”کیا بات ہے ڈیڈی؟“ لڑکی قریب پہنچ کر بولی۔

”داغ ٹمائز لئے جارہا ہوں۔ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔“

”ارے تو کیا جا رہے ہو..... دو چار دن تو اور رہتے۔“

”تمہارے ڈیڈی ہمیں اسمگلر سمجھتے ہیں۔ کسٹم والوں کو ہمارے خلاف اطلاع دے چکے ہیں

نالیے اب تو بھاگنا ہی پڑے گا۔“

”یہ کیا کیا ڈیڈی؟“ وہ خانزادہ کی طرف مڑی۔

”پھر کیا کرتا؟“

”کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ یہ لوگ اسمگلر ہیں۔“

”تم مجھ سے کس لہجے میں گفتگو کر رہی ہو۔“ خانزادہ اسے گھورتا ہوا بولا۔

”ہاں! یہ بُری بات ہے..... باپ ہیں۔“ حمید نے فہمائشی انداز میں کہا۔

”میں تنگ آگئی ہوں۔ یہ اسی طرح دوسروں کے بارے میں بیباکی سے اظہار کر دیتے ہیں۔“

”بہن! رو بہک جاتی ہے..... ویش آل.....“  
حمید نے ریسور کریدل پر رکھ دیا اور اپنی ٹاک پکڑ کر ہلانے لگا۔

## جیلی کا ڈھیر

”مجھے بید افسوس ہے کیسین..... تم نے بہت بُری خبر سنائی!“ خان دارا نے پر تھکر لہجے

کہا۔

”آپ فکر نہ کریں گے..... وہ جلد ہی پہنچیں گے۔“ حمید بولا۔

”مجھے یقین ہے کہ فریدی پر اسی لیے حملہ ہوا ہے کہ وہ یہاں آ رہے تھے۔“

”مجھے آپ کے یقین پر حیرت ہے۔“ حمید اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

”کیوں.....؟“

”اگر آپ کو یقین ہے تو پھر آپ حملہ آور سے بھی واقف ہوں گے۔“

”صرف اسی حد تک کہ وہ کوئی میرا دشمن ہے اور میری بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا

ہے۔ میرے معاملات سے اس حد تک باخبر ہے کہ کرنل فریدی بھی محفوظ نہ رہ سکا۔“

حمید خاموشی سے سنتا رہا وہ سوچ رہا تھا کہ خان دارا خود ہی اصل معاملے کی طرف آ رہا

ہے۔ لہذا براہ راست قسم کے سوالات سے اجتناب کرنا چاہئے۔ لیکن خان دارا نے بات آگے

بڑھائی۔

پھر حمید کو مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسی بوریٹ کا

”ٹما ہوگا۔ رام گڑھ کے اس بنگلے ہی میں بھلے تھے۔ جہاں خان دارا کے رشتے داروں سے

ملاقات ہوئی تھی اور فون پر خانزادہ اشرف کے بارے میں انکشاف سن کر باہر آیا تھا تو لڑکی

آنکھیں میچتی تھیں اور اسے رام گڑھ کے لیے روانہ ہونا پڑا تھا۔

رات کے کھانے پر خان دارا سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ وہ پہلے ہی کی طرح دکھائی

”تم مجھ سے تنگ آ گئی ہو!“

”میں غلط نہیں کہہ رہی۔“

”جہنم میں جاؤ۔“ خانزادہ نے کہا اور تیزی سے پھانک کی طرف مڑ گیا۔

حمید کبھی لڑکی کی طرف دیکھتا کبھی باپ کی طرف، جو اسے وہاں چھوڑ کر چلا جا رہا تھا۔

لڑکی نے اپنی داہنی کینٹی کے قریب انگلی نچائی۔

”کیا.....؟“ حمید کے لہجے میں حیرت تھی۔

”جی ہاں..... خاندان والے انہیں جھکی اور سکی سمجھتے ہیں۔ پچھلی رات انہوں نے ہی مجھے ٹاڑ

پھینکنے کی ترغیب دی تھی۔

”کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟“

”جی ہاں! کہنے لگے ٹماڑ مارو..... بھوت ہوگا تو فوراً غائب ہو جائے گا۔“

”بھلا ٹماڑ اور بھوت.....؟“

”میں بتاتی ہوں۔“ وہ حمید کی بات کاٹ کر بولی۔ ”بہت دن گزرے ڈیڈی کے والد یعنی

میرے دادا کو ٹماڑ کے کھیت میں بھوت دکھائی دیا تھا۔ انہوں نے اضطرابی طور پر ایک ٹماڑ توڑا تھا

اور بھوت پر کھینچ مارا تھا۔ بس بھوت غائب!“

”سوال یہ کہ جب تم انہیں سکی سمجھتی ہو تو ان کے مشورے پر عمل کیوں کر بیٹھی تھیں۔“

”ادھر چلو..... تو بتاؤں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”تم اندر جاؤ.....!“ حمید نے شاہد سے کہا اور لڑکی سے بولا۔ ”اب یہیں بتا دو۔“

شاہد چلا گیا تھا۔ لڑکی شرمیلی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ ”تم مجھے اچھے لگے تھے۔ میں نے کہا

اسی طرح جان پہچان پیدا کی جائے۔ یقین کرو۔ تم بالکل میری والدہ مرحومہ کی طرح مسکراتے ہو

اور غصے میں بھی بالکل ویسے ہی لگتے ہو۔“

حمید کچھ کہنے والا تھا کہ برآمدے سے شاہد کی آواز آئی۔ ”آپ کی فون کال ہے۔“

حمید لڑکی کو چھوڑ کر بیڈ روم میں آیا۔ فون پر دوسری طرف سے کہا جا رہا تھا۔ ”خان زادہ

اشرف وادی گلبار کے خان دارا کا بہنوئی ہے۔ کسی زمانے میں ملک کا مانا ہوا میکسیر یا لو جسٹ سمجھا

جاتا تھا۔ لیکن پھر ذہنی توازن کھو بیٹھا۔ بہت دنوں مینٹل ہسپتال میں رہا۔ اب ٹھیک ہے۔ لیکن ابھی

کچھ دیر بعد نوشی آئی تھی اور دروازے ہی میں ٹھٹھک کمرہ گئی تھی۔

”آؤ..... آؤ.....!“ خان دارا نے کہا۔

حمید نے مسکرا کر نوشی کی طرف دیکھا تھا۔

”ہی..... ہی..... تو تھے.....!“ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہوئی بولی۔

”کیا بک رہی ہو۔“

”بھوت..... نماڑ والا.....!“

”یہ یعنی..... کیپٹن حمید.....!“

”جج..... جی..... ہاں۔“

”لا حول ولا قوۃ..... تو تم لوگوں نے میرے مہمان کو پریشان کیا تھا۔“

”مم..... میں..... کیا کرتی.....!“

”اوہ..... آپ پریشان نہ ہوں۔“ حمید جلدی سے بولا۔ ”مجھے آپ کے ڈیڈی کے

بے میں معلوم ہو چکا ہے۔“

”آؤ بیٹھو.....!“ خان دارا نے کہا۔

”معافی چاہتی ہوں۔ اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”اچھا..... اچھا..... جاؤ۔“

نوشی سر جھکائے ہوئے چلی گئی۔

”دس سال کی تھی تب ہی ماں مر گئی۔ باپ ذہنی طور پر غیر متوازن ہے۔“ خان دارا

نخندہی سانس لے کر کہا۔

”تو اب اشرف صاحب کیا کرتے ہیں۔“

”کچھ بھی نہیں..... جائیداد پر گزارا ہے۔“

”بعض لوگ ساری زندگی دکھوں میں گزار دیتے ہیں۔“

”میں نے چاہا تھا کہ نوشی ہمارے ہی ساتھ رہے لیکن وہ خود اس پر رضامند نہیں ہوئی۔“

”باب سے بھگڑا ہوتا ہے تو کچھ دنوں کے لیے یہاں چلی آتی ہے پھر یہ سوچ کر واپس

آتا ہے کہ اشرف کو اس کی ضرورت ہے۔“

دے رہا تھا۔ حمید نے سوچا چلو خانزادہ اشرف اور اسکی نوشی ہی سے متعلق کچھ گفتگو ہو جائے۔

”پچھلی رات رام گڑھ میں بڑی پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔“ اس نے خان دارا کی طرف

دیکھے بغیر کہا۔ ”ایک صاحب ہیں خانزادہ اشرف اور انکی بیٹی..... دونوں نے زندگی تلخ کر لیا۔“

”کیا مطلب!“ خان دارا کھانا چھوڑ کر حمید کی طرف متوجہ ہو گیا اور حمید نے پوری بات

دہراتے ہوئے کہا۔ ”پتہ نہیں وہ لوگ کیا چاہتے تھے۔ اگر یہاں نہ آتا ہوتا تو دیکھتا۔“

دفترا خان دارا ہنسنے لگا۔ ”تو..... وہ تم تھے..... لا حول ولا قوۃ.....!“

”میں نہیں سمجھا خان.....“ حمید نے حیرت سے کہا۔

”اس کے بعد ان دونوں میں بھگڑا ہو گیا تھا اور وہ یہاں چلی آئی تھی۔“ نان دارا

بدستور ہنستے ہوئے کہا۔

”یہاں..... کون.....؟ وہ نوشی!“

”ہاں..... ہاں..... وہ میری بھانجی ہے۔“

”خدا کی پناہ..... تو اس کا یہ مطلب یہ کہ اشرف صاحب آپ کے بہنوئی ہیں۔“

”ہاں بھئی..... تم نہیں جانتے ورنہ تمہیں اشرف پر غصہ نہ آتا۔ پندرہ سال پہلے کی بات

ہے کہ وہ یہاں کا معزز ترین آدمی تھا۔ ملک کے گئے چنے بیکٹر یا لوجسٹ میں اس کا شمار ہوتا

تھا۔ اچانک دماغ الٹ گیا۔ علاج ہوا۔ کئی سال بعد کسی قدر ہوشمندی کی باتیں کرنے لگا۔

لیکن پوری طرح صحت آج تک نصیب نہیں ہوئی۔ تم اپنے ہی معاملے کو دیکھ لو۔ پچھلی رات

اس نے نوشابہ کو سوتے سے جگا کر تمہیں پریشان کرنے پر مجبور کیا تھا۔“

”تب تو مجھے افسوس ہے۔“

”ٹھہرو.....! میں نوشابہ کو بلواتا ہوں۔“ خان دارا ہنس کر بولا۔ ”وہ تمہیں میرے ساتھ

دیکھ کر متحیر رہ جائے گی۔“

حمید نے طویل سانس لے کر سر کو جنبش دی۔

خان دارا نے ملازم کو طلب کر کے اس سے کچھ کہا اور وہ چلا گیا۔

”کیا خیال ہے؟ اس کی حیرت کا عالم دیکھنے کے قابل ہوگا۔“

”یقیناً.....!“ حمید زبردستی ہنس پڑا۔

”کیا حرج ہے..... ابھی تو ناشتے میں دیر ہوگی۔“

فریدی نے خان دارا کے بھتیجے چنگیزی کی کہانی شروع کر دی۔ دیو کے ذکر پر حمید چونکا لیکن کچھ بولا نہیں تھا۔ خاموشی سے پوری داستان سن کر بولا: ”آپ نے وہ لاش دیکھی، پھر ہو گئی ہے۔“

”خان دارا مجھے وہ لاش دکھانے کے لیے لے گیا تھا لیکن لاش کی بجائے اسی جگہ جلی کا بت بڑا ڈھیر ملا۔“

”جلی کا ڈھیر.....؟“

”ہاں.....!“

”کیا اس نے وہ لاش پولیس کے حوالے نہیں کی تھی۔“

”نہیں.....! کیونکہ اس کا بھتیجا بھی ملوث تھا اس لیے اس نے وہ لاش اپنے ہی پاس رکے رکھی اور چنگیزی کے ساتھیوں کو ہدایات کر دی ہے کہ وہ فی الحال اس کا تذکرہ کسی سے

”کب آئے.....؟“ حمید پیچھے ہٹا ہوا بولا۔ ”پچھلی رات..... گیارہ بجے..... تم یہاں بھی نہ کریں۔“

جلد سو گئے تھے۔“

”بہر حال وہ آپ سے مشورہ کئے بغیر اس سلسلے میں کچھ نہیں کرنا چاہتا تھا۔“ حمید بولا۔

”یہی کہہ رہا تھا۔ لیکن لاش کو اتنے دنوں تک اپنے پاس روکے رکھنا قانوناً درست نہیں

ہے۔ فوری طور پر اس کی اطلاع مقامی حکام کو کر دینی چاہئے تھی۔“

”لیکن یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ جلی کا وہ ڈھیر کبھی لاش رہا ہوگا۔“

”کوئی وجہ نہیں یقین کر لینے کی۔“

”پھر دوسری بات یہ کہ کیا وہ لڑکی دنیا میں تنہا تھی جس کے غائب ہو جانے پر کسی کو بھی

تشویش نہیں ہوئی۔“

”یہ نکتہ بھی قابل غور ہے۔“ فریدی سر ہلا کر بولا۔ ”میں نے اسی لیے کہا تھا کہ اس کہانی

وفاقی الحال محض کہانی ہی سمجھو۔ پہلے مرحلے پر چنگیزی اور اس کے دوستوں سے گفتگو ہوگی۔

”یہ میرا خیال ہے کہ دیو کے تذکرے پر تم چونکے تھے۔“

”کہیں بھی دیو کا نام نہ سنا ہوں تو قاسم کا ذیل ڈول آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔“

”اس کا قصہ بھی سن چکا ہوں۔ تمہارے جانے کے بعد انور ہاسپٹل پہنچا تھا۔ تم سے

حمید کچھ نہ بولا۔ پھر بوریت۔ وہ تو سمجھا تھا شاید اس لڑکی کی موجودگی اس پر ہنسنا رفع کر دے گی۔ لیکن یہاں تو داستان غم چھڑ گئی۔

کھانے کے بعد کچھ دیر خان دارا کا ساتھ رہا۔ پھر وہ مہمان خانے کی طرف واپس

گیا تھا۔ یہاں وہ بالکل تنہا تھا اسے فریدی پر تاؤ آنے لگا۔ آخر کو رام گڑھ ہی میں کیوں

گیا تھا۔ اسے یہاں کب تک جھک ماری پڑے گی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ تھکن اور پچھلی

سونے کی وجہ سے جلد ہی نیند آگئی۔ ورنہ تنہائی اسے مزید جھنجھلاہٹوں میں مبتلا کر دیتی۔

دوسری صبح خود ہی بیدار ہوا تھا۔ کسی کو جگانے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔

ٹوائیلٹ سے نکل کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھ ہی رہی تھا کہ کسی نے دروازہ

دستک دی۔ پھر دروازہ کھلتے ہی ذہن کو جھکا سا لگا تھا۔ فریدی سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”آپ.....؟“

”نہیں..... بھوت.....!“

”کب آئے.....؟“ حمید پیچھے ہٹا ہوا بولا۔ ”پچھلی رات..... گیارہ بجے..... تم یہاں بھی نہ کریں۔“

جلد سو گئے تھے۔“

”اچھا ہی ہوا تھا۔ ورنہ اس تنہائی میں پاگل ہو جاتا۔ آپ کے زخم کا کیا حال ہے۔“

”ٹھیک ہے..... کوئی خاص بات نہیں..... کام کے قابل ہوں.....!“

”بھوت کے حوالے سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ خان دارا سے گفتگو کر چکے ہیں۔“

فریدی بستر کے قریب والی کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ”ہاں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔“

”اس کی پریشانی بھی.....!“

”وہ بھی..... لیکن میں فی الحال اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”کیا مطلب؟“

”ضروری نہیں کہ وہ پریشانی ہی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خان دارا مجھے اس معاملے

الجمہانا چاہتا ہو۔“

”کیا آپ مجھے نہیں بتائیں گے کہ پریشانی کیا ہے۔“

”ضرور بتاؤں گا..... کیا ابھی سنا چاہتے ہو۔“

تک میری سمجھ میں نہیں آسکی۔ کسی نے اس کی گمشدگی کی بھی پرواہ نہ کی.....!“  
 ”مجھے خود بھی اس پر حیرت ہے لیکن میں نے چنگیزی سے اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہیں کی۔“  
 ”کوئی خاص وجہ؟“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”آپ ہی اس سے پوچھ گچھ کریں تو بہتر ہے۔ ان حالات سے دوچار ہونے کے بعد آپ ہی کا خیال ذہن میں آیا تھا اور میں سب کچھ آپ پر چھوڑتا ہوں۔“  
 ”خیر..... خیر..... میں دیکھوں گا۔“

وہ کے قریب چنگیزی کے دوستوں کا قافلہ مہمان خانے میں داخل ہوا تھا۔ چنگیزی بہت چھ لڑکے اور تین لڑکیاں۔

خان دارا انہیں دیکھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ فریدی نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ چنگیزی نے فریدی سے اپنے ساتھیوں کا تعارف کرایا۔ وہ سبھی خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے کھلائے ہوئے تھے۔

”سب سے پہلے میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کی مدد کرنے آیا ہوں اس لیے مجھ سے کوئی بات چھپائی نہ جائے۔“ فریدی نے انہیں مخاطب کیا۔

وہ کچھ نہ بولے لیکن ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ ”ایسا ہی ہوگا۔“  
 ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر چنگیزی نے اسپاٹ پر جانے کی سختی سے مخالفت کی تھی۔“

”جی ہاں۔“ ایک لڑکا بولا۔ پھر سب نے اس کی تائید کی۔  
 ”لیکن اس کے باوجود بھی۔“ فریدی ایک ایک کا چہرہ دیکھتا ہوا بولا۔ ”آپ سب وہیں

ہائپنچے۔ کیا آپ بتا سکیں گے۔ اس تجویز کی ابتداء کس کی طرف سے ہوئی تھی۔“  
 ”غالباً فلورڈا نے سب سے پہلے کہا تھا۔“

فریدی نے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کی رنگت کچھ اور زرد نظر آنے لگی تھی۔  
 ”وہ تھوک نکل کر بدقت بولی۔“ ”حقیقتاً تجویز خود سارہ ہی کی تھی۔“

”وہ کس طرح؟“  
 ”پلٹک کا پروگرام دو دن پہلے بنا تھا اور وہ مجھے اس اسپاٹ کے بارے میں بتاتی رہی تھی۔“

”کتنی کہتی رہی تھی کہ وہیں چلنا چاہئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب دوسروں کے سامنے

شائد اس نے اکڑ کر گفتگو کی تھی۔“  
 ”واپسی پر اسے بھی دیکھ لوں گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔ اس نے اعتراف کر لیا ہے۔“  
 ”کس بات کا اعتراف کر لیا۔“

”اسی نے قاسم کو ”راز دار“ کے قیام کی ترغیب دی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ پرائیویڈ کیس لیے جائیں اور آمدنی میں اضافہ ہو اور انور کو بھی کسی اور نے خیال دلا یا تھا۔“  
 ”کس نے؟“

”ڈاکٹر فوزیہ نے..... انور کو بہت دنوں سے جانتی ہے اور اس کی صلاحیتوں سے بھی واقف ہے۔ سرمایہ قاسم کا تھا۔ اس کے لیے تو بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ خود کو اس ادارے کا سربراہ سمجھتا تھا۔“

”انور نے آخر آپ کے سامنے خود بخود اعتراف کیوں کر لیا۔“  
 ”قاسم اسے بتائے بغیر غائب رہنے لگا تھا۔ انور جب بھی معلوم کرنے کی کوشش کرتا

اپنے پاس ہونے کا حوالہ دے کر اسے خاموش کر دیتا۔“  
 ”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔“

”انور کا خیال ہے کہ وہ شاید کسی غیر قانونی حرکت میں کسی کا آلہ کار بن رہا ہے اور اسے ”ناپ سیکرٹ“ کہتا ہے۔ تین تین دنوں کیلئے غائب ہو جاتا ہے۔ شہر ہی میں نہیں ہوتا۔“

”بہر حال قاسم کے لیے تو ڈاکٹر فوزیہ ہی کافی ہوتی۔ انور کو اس نے خواہ مخواہ گھسیٹا۔“  
 فریدی کچھ نہ بولا۔

اتنے میں ایک ملازم نے آکر ناشتے کی میز لگ جانے کی اطلاع دی۔  
 حمید کا ذہن الجھ گیا تھا۔ ناشتے کی میز پر خان دارا بھی موجود تھا۔ فریدی اور اس کے

درمیان گفتگو ہوتی رہی تھی۔ حمید کچھ نہیں بولا تھا۔  
 خان دارا کہہ رہا تھا۔ ”میں نے چنگیزی کے ان دوستوں کو بلایا تھا جو وہاں موجود تھے۔

تھوڑی دیر بعد پہنچ جائیں گے۔ چنگیزی خود انہیں لینے گیا ہے۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“ فریدی نے کہا۔ چند لمحوں کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”وہ لڑکی ساڑہ اب

## گھوڑے بھڑکے

لوگوں کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ محل کا ایک حصہ تباہ ہو گیا تھا۔ چنگیزی اور اس کے ساتھی تتر بتر ہو گئے تھے۔ فریدی اور حمید تباہ رہ گئے۔ آگ محل کے دوسرے حصوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”یہ وہی حصہ ہے جہاں ایک کمرے میں جیلی کا ڈھیر دیکھا تھا۔“ فریدی حمید کا بازو دبا رہا۔

رہا۔

”سوال تو یہ ہے کہ وہ ڈھیر ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی کیوں نہیں ضائع کر دیا گیا تھا؟“

بدنے کہا۔

”سوالا کھروپے کا سوال ہے۔“

حمید کچھ اور کہنے والا تھا کہ خان دارا دکھائی دیا۔ بدحواسی میں ادھر ادھر دوڑتا پھر رہا تھا۔

”یہی نے آگے بڑھ کر اسے روکا۔“ کوئی تھا تو نہیں ادھر؟“

”خدا جانے..... خدا جانے..... میں کچھ نہیں جانتا..... پہلے آپ پر فار ہوا۔ پھر..... پتا نہیں کون کیا چاہتا ہے۔“ خان دارا مضطربانہ انداز میں بولا۔

پھر فریدی اس حصے کی طرف بڑھ گیا تھا جہاں سے شعلے اٹھ رہے تھے۔

حمید کو وہیں رکنے کا اشارہ کرتا گیا تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔“ خان ہاتھ ملتا ہوا بولا۔

حمید نے کچھ عجیب سی بات محسوس کی تھی۔ اس کے رویے میں..... خان دارا جیسے لوگ حال میں خود سری کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن یہ تو اس وقت بالکل کیچوا لگ رہا تھا۔ اسے وہ اتنی بھی یاد آیا جب اس کا کلواؤ فریدی سے ہوا تھا۔ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا لیکن اس کی اکڑ نہ کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

”آپ فکر نہ کیجئے! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ حمید بالا خر بولا۔

یہ مسئلہ پیش ہوا تھا تو خود قطعاً نہیں بولی تھی اور یہ لوگ سمجھے کہ تجویز میری اپنی ہے۔ بہر حال چنگیزی کے علاوہ اور سب نے میری تجویز سے اتفاق کیا تھا۔“

”اسے تم کب سے جانتی ہو؟“

”دو ماہ سے۔ میرے ہی توسط سے وہ بقیہ دوستوں سے متعارف ہوئی تھی۔“

”کہاں رہتی تھی۔ اس کے متعلقین کون لوگ ہیں۔“

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ قالین بانی کے بانی کے ایک کارخانے میں سپروائزر تھی۔ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں جانتی۔ کبھی اس کے گھر بھی نہیں گئی۔ ہم سب ایک کینے میں اکٹھے ہوا کرتے تھے۔“

”پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟“

”قالین بانی کے کارخانے ہی میں۔ مجھے ایک قالین کی ضرورت تھی۔ اس نے مجھے

بہتر مشورے دیئے تھے اور پھر ہم دوست بن گئے تھے۔“

پھر فریدی نے قالین بانی کے کارخانے کا نام اور پتہ نوٹ کیا تھا۔

”کیا آپ لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں رہتی تھی۔“ فریدی نے کچھ

دیر بعد ان سبھوں سے سوال کیا۔

اس کا جواب نفی ہی میں ملا۔

”آپ میں سے کسی کے اس سے خصوصی تعلقات بھی تھے؟“ فریدی نے اس بار صرف

لڑکوں کو مخاطب کیا۔

اس کا اعتراف بھی کسی نے نہیں کیا تھا۔

دفعتاً ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ دیواریں جھنجھنا اٹھیں۔ کھڑکیاں لرز گئیں اور زمین ہلنے لگی۔ وہ سب اٹھ کر دروازے کی طرف چھپے۔ کھلے میں نکل آئے۔ محل کے گوشے سے غلیظ دھواں اٹھ کر فضا میں بلند ہو رہا تھا۔

”شاید جیلی کا ڈھیر بھی ضائع کر دیا گیا۔“ فریدی کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔



”کیا ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تو یہی نہیں معلوم کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔“  
 ”ہم یہی تو دیکھیں گے۔“

”اوہ..... خدا یا..... میں یہاں کھڑا کیا کر رہا ہوں۔“ خان دارا نے کہا اور دوڑتا ہوا عمارت کی طرف چلا گیا۔

حمید جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ ویسے اس نے خان دارا کو کینہ تو ز نظروں سے اٹھاتا تھا۔ ”میں اچھی طرح سمجھتا ہوں بیٹے۔“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔ ”خود تہی نے کوئی چکر چلایا ہے۔“

پھر اس کی مٹھیاں سختی سے بھینچ گئی تھیں۔ اتنے میں فریدی بھی پلٹ آیا۔

”سب محفوظ ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”جب دھماکہ ہوا تھا تو آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔“  
 ”اب کیا خیال ہے آپ کا۔“

”یہی کہ جیلی کا ڈھیر اس لیے ضائع کر دیا گیا کہ کہیں میں تجزیہ نہ کر بیٹھوں۔“

”سامنے کی بات ہے۔“ حمید نے لا پرواہی سے کہا اور فریدی اسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”آپ کے پہنچنے سے قبل وہ پتھر کی تھی۔ آپ پہنچے تو جیلی کے ڈھیر میں تبدیلی ہو چکی تھی اور اب اس لیے بالکل ہی فنا ہو گئی کہ کہیں آپ پس ماندہ کا تجزیہ نہ کر بیٹھیں۔“

”ہوں..... تو پھر.....!“

”خان دارا اپنے کسی دشمن کو غارت کرنا چاہتا ہے۔“

”غالبا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ خان دارا نے مجھے کچھ باور کرانے کیلئے یہ کھیل خود کھلا ہے۔“

”ہاں میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔“

”نتائج اخذ کرنے میں جلدی نہ کرو۔“

”مجھے تو آپ کی زندگی خطرے میں معلوم ہوتی ہے۔ ذرا محتاط رہئے گا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”اس نے آپ کو چیلنج کیا تھا۔ کچھ لوگ حقیقتاً بیدار لومڑی ہوتے ہیں جبکہ شیروں کی طرح دھاڑتے بھی رہتے ہیں۔“

”خیر..... خیر..... دیکھیں گے۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں ذرا قالین بانی کے اس کارخانے کو بھی

”سارہ اسی دیو کی آواز میں گفتگو کرتی ہوئی بیہوش ہوئی تھی۔“

”لہذا اشقر جن بکواس ہے۔“

برائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”دوسرا قتل.....!“  
 ”میرا تو ذہن ہی ماؤف ہو رہا ہے۔“ خان دارا کی آواز حلق میں چھنے لگی۔

حمید نے دل میں کہا۔ ”دراہ بے مکار! تو بھلا کب چاہتا ہے کہ تیرے خاندان کا کوئی فرد  
 ہمارے کا شکار ہو جائے۔ اچھا بیٹے! اب ہم تمہیں دیکھ ہی لیں گے۔“  
 مقامی حکام کو دھماکے کی اطلاع پہلے ہی دی جا چکی تھی۔ لاش ملنے ہی ایک بار پھر ان  
 کے رابطہ قائم کیا گیا اور حمید نے ان کے بھی یہی ذہن نشین کرایا کہ کسی نے شکور ہی سے ٹائم

لے لیا تھا اور پھر اس کا خاتمہ بھی کر دیا۔

کسی نے اس کے بیان پر جرح نہیں کی۔ ممکن تھا کہ فریدی نے پہلے ہی انہیں خصوصی  
 بات دی ہوں۔ اس کے بعد ہی قالین بافی کے کارخانے کا رخ کیا ہو۔ ایس۔ پی کے  
 ہزاروں صاف ظاہر ہوتا رہا تھا جیسے وہ خود کو بولنے سے روکے رکھنے کی کوشش کرتا رہا ہو۔  
 فریدی کی واپسی شام سے پہلے نہیں ہوئی تھی۔ شکور کے بارے میں اس نے خاموشی  
 مانتا تھا اور اس پر کوئی تبصرہ کئے بغیر سارہ کا ذکر چھیڑ دیا تھا۔

”وہ تو عجیب صلاحیتوں کی مالک ثابت ہوئی ہے۔ البتہ اس نے اپنے گھر کا جو پتہ  
 ٹری کے رجسٹر میں درج کر رکھا تھا۔ وہ قطعی غلط تھا۔ لہذا اسکی جائے رہائش کا علم نہ ہو سکا۔“  
 ”اس کی عجیب صلاحیتوں کا بھی ذکر ہو جائے۔“ حمید بولا۔

”حیرت انگیز طور پر دوسروں کی آوازوں کی نقل اتار سکتی تھی۔ میں نے ریکارڈ کی ہوئی  
 فیس سن ہیں اور اصل سے ان کا موازنہ بھی کیا ہے۔ مشکل ہی سے دونوں میں امتیاز کیا جا  
 سکے گا۔ ٹیکسٹری میں پچھلے ماہ ایک ورائٹی شور ہوا تھا جس میں اس نے اپنے اس کمال کا مظاہرہ  
 کیا تھا۔ سینئر مینیجر اور اکاؤنٹنٹ کی آوازوں کی نقل اتاری تھی اور پورا پروگرام ریکارڈ کیا گیا  
 تھا۔ اسی میں یہ آئیٹم بھی شامل تھا۔“

”خوب!“ حمید سر ہلا کر بولا۔

”بس ثابت ہوا کہ وہ مرنے سے پہلے اس دیو کی آواز کی نقل اتارتی رہی تھی اور اس  
 کے ساتھ سمجھتے تھے کہ اس پر جج مچ گیا ہے۔ یہاں اصل مجرم کا طریق کار واضح ہو جاتا  
 ہے۔ شکور کا قتل بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اپنے لیے کام کرنے والوں کو بالآخر ختم کر دیتا

”نو افراد کے علاوہ اور کوئی اس کا گواہ نہیں تھا۔ جن میں سے آٹھ افراد اچھا  
 جانتے ہیں کہ وہ تمہاری مخالفت کر کے سکھ سے نہ رہ سکیں گے۔“

”تو گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کہانی میری گڑھی ہوئی ہے۔“

”جو چاہو سمجھو.....! میں نے تو ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں کہی۔“

”اب مجھے اجازت دیجئے۔“ چنگیزی نے اٹھتے ہوئے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”ضرور..... ضرور.....!“

وہ حمید کو گھورتا ہوا چلا گیا۔ حمید سوچ رہا تھا کہ آخر فریدی اسے یہاں کیوں چھوڑ  
 ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا مقصد یہی ہو کہ ان لوگوں پر پوری طرح نظر رکھی جائے۔

وہ پھر مہمان خانے سے محل کی طرف چل پڑا۔ آخر اس دھماکے سے متعلق پوچھ پچا  
 کرتی تھی۔ خان دارا کے توسط سے محل کے سارے ملازمین کو اکٹھا کرایا۔

”کیا سب موجود ہیں۔“ حمید نے بے آواز بلند پوچھا۔

”جی ہاں.....!“ بیک وقت کئی آوازیں آئیں۔ پھر کسی نے کہا۔

”شکور..... شکور..... کدھر ہے؟“

”شکور.....!“ خان دارا نے اونچی آواز میں پکارا۔ لیکن جواب نہ ملا۔

”وہ آخر کہاں گیا؟“ خان دارا مضطربانہ انداز میں بولا۔

”اسی نے تو ہماری جانیں بچائی ہیں سرکار۔“ ایک ملازم نے آگے بڑھ کر کہا۔

”وہ کس طرح.....؟“

”کچھ دیر پہلے اس نے ادھر جراثیم کش دواء کا جھڑکاؤ کیا تھا اور سب کو مطلع کر دیا تھا۔

اس لیے کوئی ادھر گیا ہی نہیں۔ دوا بڑی بدبودار ہوتی ہے سرکار۔“

”خدا کی پناہ!“ حمید اپنی گدی سے اٹھتا ہوا بولا۔ ”اسے فوراً تلاش کرایئے خان۔“

”ہاں..... ضرور..... ضرور۔“

اور پھر کچھ دیر بعد محل کے ایک دور افتادہ حصے میں شکور کی لاش ملی تھی۔ اس کی بائیں  
 کٹہری میں سوراخ تھا جس سے خون بہہ کر فرش پر پھیل رہا تھا۔

”جس نے اس کے ذریعے وہاں ٹائم بم رکھوایا تھا اسی نے بالآخر اسے بھی ختم کر دیا۔“

”ایک پرانی وصیت کے مطابق اقتدار خان دارا کے ہاتھ آیا ہے۔ جائیداد پر اسی کا ل ہے اور دوسروں کے حصے وہی ان تک پہنچاتا ہے۔ خان دارا کے بعد یہ اقتدار کی طرف منتقل ہو جائے گا۔“

”اگر یہ دونوں نہ رہ جائیں تو پھر کیا صورت ہوگی۔“

”اس سوال کا جواب وصیت نامے کا مطالعہ کئے بغیر نہیں دے سکوں گا۔“

”اب اگلا قدم کیا ہوگا۔“

”اس پکنک اسپاٹ کو بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اور پھر دوسرے دن وہ خان دارا کی شکار گاہ سے گھوڑوں پر سوار ہو کر اس اسپاٹ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ تین بردبانی قبائلی بھی تھے۔

دراصل وہ علاقہ بردبانیوں ہی کا تھا۔ انہوں نے بھی کسی دیو کا ذکر کیا تھا جس کے جسم سے چنگاریاں نکلتی تھیں اور اندھیرے میں اس کے قہقہے دور دور تک گونجتے تھے۔ خود انہوں نے اس مخصوص میں حصے میں قدم رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ جہاں دیو دکھائی دیتا تھا۔

اس وقت بھی وہاں جانے کے لیے بدوقت تیار ہوئے تھے۔ فریدی اور حمید غیر ملکی ریلوں کے میک اپ میں تھے۔

خان دارا کے مشورے کے مطابق انہوں نے جو راستہ منتخب کیا تھا۔ اس سے صرف نوڑے ہی گزر سکتے تھے لیکن اسپاٹ سے دو میل کے فاصلے پر ایک ایسی جگہ بھی تھی جہاں نہ گاڑیاں جاسکتی تھیں۔ لہذا ایک بڑی گاڑی وہاں کھڑی کر دی گئی تھی۔ یہ بھی خان دارا ہی کے مشورے سے ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ آس پاس کسی گاڑی کی موجودگی بھی ضروری ہے۔ انہیں انہیں کن حالات سے گزرنا پڑے۔ وہ خود بھی ساتھ چلنے پر مصر تھا لیکن فریدی اس پر نہیں ہوا تھا۔

بردبانیوں کو نہیں معلوم تھا کہ وہ دونوں کون ہیں اور وہاں جانے کا اصل مقصد کیا ہے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ سیاہ خرگوشوں کا شکار کھیلنا چاہتے ہیں۔ جن کی ان اطراف میں بہتات تھی۔ پانچ آدمیوں کا یہ قافلہ اس اسپاٹ کی طرف بڑھتا رہا جہاں ایک لڑکی حیرت انگیز طور پر نہ تھی۔ بردبانی قبائلی بھی مسلح تھے اور شاید ان میں ایک آدمی ایسا ضرور تھا جسے جائے حادثہ

ہے۔ سائرہ بھی اس کی آگہ کار تھی۔ اس کے ساتھیوں کو کسی طرح بیہوش کیا گیا اور ان کی موت کے دوران میں اسے بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔“

”مقصد.....؟“ حمید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”چراغ کے جن سے پوچھ کر بتاؤں گا۔“ فریدی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”موڈ خراب معلوم ہوتا ہے۔“

”میں جادوگر تو نہیں ہوں کہ تفتیش کے اس مرحلے پر جرم کا مقصد بھی معلوم کر لوں گا۔“

”میں بتا سکتا ہوں۔“

”یکو.....“

”خان دارا اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورہ پیٹ کر کسی بڑے جرم کا ارتکاب کرنا چاہتا ہے ہو سکتا ہے وہ بڑا جرم ہم دونوں کا قتل ہی ہو۔“

”ایسی صورت میں تمہارا جسم ٹماڑوں سے داغدار ہونے کے بجائے گولیوں سے چل ہو جاتا۔ ایک ٹائم بم مہمان خانے میں بھی رکھوایا جاسکتا تھا۔“

”ہو سکتا ہے اب ایسا ہو جائے۔ خود کو شیعے سے بالاتر رکھنے کے لیے محل میں پا دھا کہ ہونا ضروری تھا۔“

”مر جائیں گے..... کیا فرق پڑتا ہے۔“ فریدی اکتا کر بولا۔

”اتنی آسانی سے مر جائیں گے۔“

”میں آسانی ہی سے مر جانے کی خواہش رکھتا ہوں۔“

”اگر ہم یہاں کی بجائے ہوٹل گلریز میں مقیم رہ کر تفتیش کریں تو کیا حرج ہے۔“

”سوچوں گا۔ خیر دوسری خبر سنو۔ انور کی ٹیلی پر سنٹر میسج آئی ہے کہ قاسم ڈاکٹر فوڈیہ

سمیت غائب ہو گیا ہے۔“

”عیش کر رہا ہوگا کہیں۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔

حمید نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”خان دارا کے مرنے سے کسے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ یا کوئی

ایسا بھی ہے جس کی موت سے خان دارا کو فائدہ پہنچ سکے۔“

ہاں کی آواز اب دور سے آرہی تھی۔  
 ”آپ کہاں ہیں؟“ دفعتاً حمید نے فریدی کو آواز دی۔

”جہاں ہو میں اسی پوزیشن میں ٹھہرو۔“ جواب ملا۔ آواز قریب ہی کی معلوم ہوتی تھی اور انہوں نے الدین کے فلمی جن کا سا قہقہہ سنا تھا۔ حمید کے قریب والا بروہانی اچھل کر بھاگا۔  
 ”ٹھہرو..... ٹھہرو.....“ حمید کہتا ہی رہا لیکن وہ نشیب میں غائب ہو گیا۔ پھر حمید نے کئی جگہ ہوتے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔ شاید سارے ہی بروہانی بھاگ نکلے تھے۔

”جانے دو.....!“ اس نے فریدی کی آواز سنی جو اس بار نسبتاً قریب سے آئی تھی اور پردہ ذرا ہی سی دیر میں اس کے قریب تھا۔ غالباً اس کی آواز کے رخ کا اندازہ کر کے اس نے پہنچا تھا۔

قہقہہ پھر سنائی دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پوری وادی قہقہے سے گونج رہی ہو۔  
 ”ہائیکروفون..... قہقہہ ریکارڈ ہو رہا ہے۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”سوال تو یہ ہے کہ اب ہم کیا کریں۔ بے آواز فائرنگ تو ہمیں آسانی سے چاٹ جائے گی۔“ حمید بڑبڑایا۔ ”بروہانی بھی بھاگ نکلے۔ گھوڑے بھی گئے۔“

”دیکھا جائے گا۔“

”یہاں تو ہمیں ہیلی کوپٹر سے آنا چاہیے تھا۔“

”یہ مناظر دیکھنے میں نہ آتے۔“

”پتہ نہیں! صرف دیو ہے یا پریاں بھی ہیں۔“

”کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے کی کوشش کرو۔“ فریدی بائیں جانب کھسکتا ہوا بولا۔

شاید دونوں گھوڑے دم توڑ چکے تھے کیونکہ اب ان کی کر بناک آوازیں نہیں سنائی دیتی تھیں۔ بالکل ایسا ہی سناٹا طاری تھا جیسے ذرا دیر پہلے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہی سراسرائی ہوئی ٹنگ ہوائیں تھیں اور وہی ہنسنے کے پھولوں کی خوشبو۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ نشیب میں اترتے رہے۔ تینوں بروہانی نہ جانے کدھر نکل بھاگے تھے۔ پتہ نہیں زندہ بھی تھے یا بے آواز فائرڈ کی نذر ہو گئے تھے۔

وہ بڑی احتیاط سے اس راستے کی طرف بڑھ رہے تھے جس سے وہ گاڑی تک پہنچ سکتے۔

کا صحیح علم تھا۔ وہی ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔

”واقعی بڑی خوبصورت جگہ ہے۔“ حمید چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔

بروہانی خوفزدہ نظر آنے لگے تھے۔ اچانک ان کے گھوڑے بھڑکنے لگے۔ بالکل معلوم ہوتا ہے جیسے انہوں نے کسی بڑے خطرے کی بوسنگھ لی ہو۔ پھر اگر وہ سبھی گھوڑوں کو وہ پڑے ہوتے تو انہیں پچھتانا پڑتا۔

## حملہ

گھوڑے لگا میں چھڑا کر بھاگ نکلنا چاہتے تھے اور وہ انہیں روکے رکھنے کے لیے زور لگا رہے تھے۔

ٹھیک اسی وقت ایک گھوڑے کے بائیں پہلو سے خون کا فوارہ چھوٹنے لگا اور فریدا نے سخت لہجے میں کہا۔ ”چھوڑ دو گھوڑوں کو اور ادھر پوزیشن لے لو..... جلدی کرو.....“

زخمی گھوڑا گر گیا تھا۔ لگا میں چھوٹتے ہی دوسرے گھوڑے ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ ایک اور گرا۔ اس بار فریدی نے ایک سمت فائر کر دیا تھا۔ وہ ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں تھا۔ دوسرے بھی آس پاس بکھر کر پوزیشن لے چکے تھے۔

بقیہ تین گھوڑے وحشیانہ انداز میں ایک جانب دوڑتے چلے گئے۔

حمید ایک بروہانی کے قریب تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”دیکھا صاحب ہم بولا تھا! ڈر نہیں آئے گا..... ہمارا گھوڑا مر گیا۔“

”خان جانے.....!“

”ہم خان سے لے گا..... اپنا جانور.....!“

”ضرور..... ہم دلوائیں گے تمہیں۔“

”اب دیکھا.....! ڈر بھوت رہتا۔“

”یہ بھوت نہیں..... بلکہ سائیلنسر لگی ہوئی رائفل تھی۔“

بروہانی نے برا سامنہ بنایا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ بھاگ نکلنے والے گھوڑوں کی

دو گھنٹے میں دو میل کی مسافت طے ہوئی تھی لیکن گاڑی کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔  
”دیکھا آپ نے.....“ حمید بھنا کر بولا۔ ”اب فرمائیے۔“

”میں نہیں سمجھا تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”ہماری واپسی سے قبل ہی گاڑی کہاں غائب ہو گئی۔“

”پتہ نہیں۔“ فریدی نے لا پرواہی سے کہا اور سگار سلگانے لگا۔

پھر وہ وہیں بیٹھ کر ایک جگہ سستانے لگے تھے۔ حمید نے پائپ میں تمباکو بھرا اور اسے سلگانے بھی نہ پایا تھا کہ کسی بھاری گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ پائپ اسے جبر میں ڈالا تھا اور بھٹی ہوئی سٹر پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ فریدی بدستور بیٹھا لا پرواہی سے سگار پیتا رہا۔  
گاڑی کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی اور پھر بائیں جانب والے نشیب سے وہ بھلا ٹرک ان کی جانب بڑھتا نظر آیا جس پر نصف درجن سے زائد مسلح لوگ موجود تھے۔ ڈرائیو کے قریب خان دارا بیٹھا ہوا تھا۔

ٹرک قریب پہنچتے ہی وہ سیٹ سے کود کر ان دونوں کی طرف چھپنا۔

”آپ لوگ بعافیت ہیں نا۔“ وہ ہانپتا ہوا بولا۔

”آپ کے دو گھوڑے ضائع ہو گئے۔“ فریدی نے کہا۔

”اس کی فکر نہ کیجئے۔ وہ تینوں جیسے ہی شکار گاہ پہنچے، ہم سب دوڑ پڑے۔“

”اوہ..... تو شاید گاڑی وہی لے گئے تھے۔“

”جی ہاں۔“ خان دارا بھرا آئی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ کہہ رہے تھے کہ گھوڑوں کے پلہ شق ہو گئے۔“

”جی نہیں!“ فریدی بولا۔ ”بے آواز فائروں نے انہیں موت کے گھاٹ اتارا ہے۔“

”بردبانی تو کہہ رہے تھے.....!“

فریدی کچھ نہ بولا۔ حمید خان دارا کو بغور دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”آپ نے دیکھا اس دیو کو۔“

”نہیں مجھے تو نہیں دکھائی دیا۔“

”بردبانوں نے دیکھا تھا۔ جب وہ بھاگ رہے تھے۔“

”کیا وہ ساتھ آئے ہیں؟“

”نہیں! شکار گاہ میں ہیں..... حالت خراب تھی ان کی۔“

پھر وہ اسی ٹرک کے ذریعے شکار گاہ تک آئے تھے۔ تینوں بردبانی بے حد خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کو بخار ہو گیا تھا۔

انہوں نے بتایا کہ انہیں وہ دیو اس وقت دکھائی دیا جب وہ ان کا ساتھ چھوڑ کر اضطراری بھاگ نکلے تھے۔

”آخر چکر کیا ہے۔“ حمید بڑبڑایا۔

”جو مقصد تھا وہ پورا نہیں ہو سکا۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”کس کا مقصد؟“

”انہیں واقعات کا..... پہلے بردبانی ڈرائے جاتے رہے تھے۔ پھر شہری ڈرائے گئے لیکن معاملہ خان دارا کا تھا اس لیے واقعے کی چلبلی نہ ہو سکی۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”میری دانست میں کوئی اس علاقے کو آسیب زدہ مشہور کر کے اسے ”ممنوعہ علاقہ“ قرار دیا جاتا ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم کئی بار ایسے حالات سے نپٹ چکے ہیں۔“

”میرا خیال ہے وہ شخص اول درجے کا احمق ہے جس نے اس ایٹمی دور میں یہ طلسم ہو کر تیب دیا ہے۔“

”ہے تو۔“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ”میری دانست میں اتنا ہی کافی ہوتا ہے جیسے جاتے لوگ پتھر کے مجسموں میں تبدیل ہو جاتے۔ یہ جن دیو اور قہقہے تو کھل کر اسے مارنا ثابت کر رہے ہیں۔“

”میں یہی کہنا چاہتا تھا۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”لیکن ہم آخر پتھر کے مجسموں کا ذکر اتنے تازے کیوں کر رہے ہیں۔ کیا آپ نے کوئی ایسا مجسمہ دیکھا ہے۔“

”نہیں۔ میں نے تو جیلی کا ڈھیر دیکھا تھا۔“

”اور وہ بھی دھماکے سے اڑا دیا گیا۔“ حمید پر تفکر لہجے میں بولا۔ ”گھوڑوں کے جسموں سے لٹائیاں برآمد کی جاسکیں گی۔“

”سارہ کہاں غائب ہو گئی۔ وہ تمہارے ساتھ کہیں گئی تھی اسکے بعد سے سراغ نہیں مل سکا۔ تم نے جس طرح آٹھ گواہوں کی زبان بند کی ہے اس طرح میری زبان بند نہیں کی جاسکتی!“

”خوب.....!“ حمید سر ہلانے بولا۔

”میں نے انکل کو مشورہ دیا تھا کہ فوراً پولیس کو اطلاع دے دی جائے لیکن انہوں نے میری بات نہیں مانی۔ آپ لوگ ذاتی تعلقات کی بنا پر بلوائے گئے ہیں۔“

”اچھا تو پھر.....؟“

”ذاتی تعلقات کی بنا پر آپ معاملے کو دبا بھی سکتے ہیں۔“

”یہ تم کہہ رہے ہو!“

”نہیں! جس نے یہ خط لکھا ہے کہہ سکتا ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو۔“

”اس خط کا انداز کہہ رہا ہے کہ ہمیں بلیک میل کیا جائے گا۔“

”کچھ اندازہ ہے کہ کون ہو سکتا ہے۔“

”پتہ نہیں.....!“

”اگر کوئی ہو سکتا ہے تو انہی آٹھوں میں سے جو تمہارے ساتھ گئے تھے۔“

”نہیں..... یہ ناممکن ہے۔“

”بھلا کس طرح۔“

”وہ سب میرے بہترین دوست ہیں۔“

”اچھے مواقع کوئی بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ انہی میں سے کوئی ہو سکتا ہے۔“

”تو پھر اب کیا کیا جائے؟“

”فکرت کرو! تم نے اچھا کیا کہ ہمیں مطلع کر دیا۔ کیا خان کو بھی خبر کر چکے ہو۔“

”نہیں! وہ موجود نہیں ہیں۔ شاید شکار گاہ واپس گئے۔ زیادہ تر وہیں رہتے ہیں۔“

”ہم دیکھیں گے..... تم یہ خط میرے ہی پاس رہنے دو۔“

”چنگیزی کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”آخر آپ لوگ بھی وہاں نہ ٹک سکے۔“

”ہاں..... اور ہم نے قہقہہ بھی سنا تھا۔“

”کون برآمد کرے گا۔ اس علاقے میں صرف تین بے آواز رائفلیں پوری ٹائلیں ہیں۔“

”فائرنگ کی سہولت تک معلوم نہ کی جاسکتی گی۔“

”حیف ہے اس بے بسی پر۔“ حمید ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

فریدی نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

”شکار گاہ سے وہ محل میں واپس آئے۔ دونوں ہی فکر مند نظر آ رہے تھے۔“

”میں رام گڑھ جا رہا ہوں۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔ ”تم چنگیزی اور خانزادہ اشرف کی

پر نظر رکھو گے۔ شکور کے بارے میں بھی زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔“

”اگر جیلی کا ڈھیر نہ ہو گیا تو۔ ویسے کب تک واپسی ہوگی آپ کی۔“

”یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔“

لیکن مہمان خانے میں گھنٹوں حمید کے خزانے کو بچتے رہے۔ پہاڑی راستوں کی تھکن

نڈھال ہو کر سویا تھا۔

آنکھ کھلی تو اندھیرا پھیل چکا تھا اور شام کی چائے بھی نیند کی نذر ہو گئی تھی لیکن مہمان خانے

کے ملازمین نے چائے اور رات کے کھانے کا وقفہ برقرار رکھنے کے سلسلے میں بڑی پھرتی دکھائی۔

چائے سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ چنگیزی کی آمد کی اطلاع ملی۔ ملازم نے آکر بتا

کہ وہ فوری طور پر ملنا چاہتا ہے۔

”تو پھر یہیں لے آؤ۔“ حمید نے ملازم سے کہا۔

چنگیزی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”کیا بات ہے..... آپ کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہیں۔“

”کچھ اور لوگوں کو بھی علم ہے کہ سارہ ہمارے ساتھ گئی تھی۔“

”کون لوگ ہیں؟“ حمید نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے یہ خط موصول ہوا ہے۔“ اس نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر حمید کی طرف

بڑھاتے ہوئے کہا۔

لفافہ معمولی ڈاک سے آیا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ٹکٹ پر مہر صاف نہیں تھی، جس سے رائی

کے مقام کے بارے میں معلوم ہو سکتا۔ خط میں لکھا گیا تھا۔

”عالمبا خان سے تعلقات بہتر نہ ہوں گے۔“

”جہاں تک انکل کا سوال ہے وہ تو انہیں ہمیشہ اچھے ہی الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔“

”کبھی کوئی جھگڑا ہوا تھا ان کے درمیان۔“

”مجھے تو یاد نہیں۔“ یہ میں یونہی پوچھ رہا تھا۔ شاید تمہیں علم نہیں کہ ان دونوں کے ہاتھوں مجھ

پر گڑھ میں کیا گزری تھی۔“

اور پھر حمید نے اسے بھی نمائروں والی کہانی سنادی۔

چنگیزی بیحد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ حمید کے خاموش ہوتے ہی بولا۔ ”انکل سے معلوم ہوا ہے کہ

نزل کا بایاں بازو زخمی ہے۔ ان پر یہاں آتے وقت حملہ ہوا تھا۔“

”یہ درست ہے۔“ حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”تب پھر میں آپ سے اس چھیڑ چھاڑ کو محض اتفاقاً نہیں سمجھتا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”انکل اشرف کسی کا آلہ کار بھی بن سکتے ہیں۔“

”خان دارا کے خلاف.....؟“

”ایسی صورت میں ممکن ہے جبکہ ان کی ذہنی صحت بھی مشکوک ہے۔ انہیں کسی بھی راہ پر لگایا

جاسکتا ہے اور نو شاہ ان کی لڑکی ہے وہ اسے کم از کم آپ کی راہ پر ضرور لگا سکتے ہیں۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”کہ وہ آپ کی ٹوہ میں رہے۔ آپ پر نظر رکھے ورنہ آپ کے پیچھے ہی پیچھے یہاں کیوں

پہنچتی۔ ہو سکتا ہے۔ نام بم بھی اسی نے رکھوایا ہو۔“

”اور شکور کو قتل بھی کر دیا ہو۔“ حمید بولا۔

”سب کچھ ممکن ہے۔“

”لیکن یہ ضروری نہیں تھا کہ رام گڑھ میں جہاں میں قیام کرتا۔ اس کے سامنے ہی اشرف

صاحب کا بنگلہ بھی ہوتا۔“

”ان کے بائیس بنگلے ہیں رام گڑھ میں۔“

”میں خان دارا سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔

”برو بانیوں نے تو اسے دیکھا بھی تھا۔“

”ہم ابھی نہیں دیکھ سکے لیکن دیکھیں گے ضرور۔“

”کیپٹن.....!“ چنگیزی حمید کو غور سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”مجھے شروع ہی سے ایسا محسوس

رہا ہے، جیسے آپ کو میری باتوں پر یقین نہ ہو۔“

”میرا کوئی ایسا دوست نہیں ہے جس کی رہائش سے میں واقف نہ ہوں۔“

”عالمبا آپ کا اشارہ سائرہ کی طرف ہے لیکن وہ براہ راست فلورا کی دوست تھی۔ اہی

نے حلقے میں اس کا تعارف کرایا تھا۔ جب اسے علم نہیں تو دوسروں کو کیسے ہو سکتا ہے۔“

”خیر چھوڑو! مس اشرف یہیں مقیم ہیں یا واپس گئیں۔“

”مقیم..... ہے۔“ چنگیزی نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”عالمبا تم انہیں پسند نہیں کرتے۔“

”باپ ہی کی طرح کر رکھا ہے۔“

”آپ کو ان کی والدہ یعنی اپنی پھوپھی یاد ہیں۔“

”کیوں؟“ چنگیزی چونک کر حمید کو گھورنے لگا۔

”بات دراصل یہ ہے کہ انہیں میری مسکراہٹ اپنی والدہ کی مسکراہٹ سے مشابہ نظر آتی ہے۔“

”کیا اسے آپ کا داغ چاٹنے کا موقع مل گیا تھا۔“

”بد قسمتی سے۔“

”لیکن اس نے ایک بار بھی آپ کا ذکر نہیں کیا۔“

”میاں عقل کے ذہن لو۔ میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے یہ سوال نہیں کیا تھا۔ وہ بھی برا

کر کرتی ہیں یا نہیں لیکن آپ نے میرے اصل سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”مجھے پھوپھی کا چہرہ یاد نہیں۔ آپ انکل سے پوچھئے گا۔“

”مس اشرف اس وقت کہاں مل سکیں گی۔“

”سیلانی ہے۔ ہو سکتا ہے انکل کے ساتھ شکار گاہ چلی گئی ہو۔ مجھے تو یہاں کہیں نہیں دھائی دی۔“

”کیا ڈاکٹر اشرف یہاں کبھی نہیں آتے؟“

”پچھلے تین سال سے تو نہیں آئے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اچھا تو پھر اسی طرف پلٹ چلیے۔ جدھر سے گاڑی لائے تھے۔“  
وہ اسی طرح زمین سے لگے ہوئے دوسری سمت مڑے تھے اور ریٹنگنا شروع کر دیا تھا۔  
نہ فارنگ کے درمیان سے گزرتے ہوئے وہ گھوڑوں کے اصطبل تک پہنچ گئے۔

”سوال تو یہ ہے کہ اس ہنگامے کا اختتام کس طرح ہوگا۔“ حمید بولا۔  
”ہنگامہ تو پل بھر میں ختم ہو جاتا۔ ہم بڑی اچھی پوزیشن میں ہیں لیکن یہ بتانا دشوار ہے  
بلکہ آدر کس طرف ہیں اور ہمارے آدمی کس طرف۔“ چنگیزی نے پرتشیش لہجے میں کہا۔  
”تو ہم اصطبل ہی میں بندھے رہیں گے۔“ حمید بھنا کر بولا۔  
”میں تو ان حالات میں کوئی مشورہ نہیں دے سکوں گا کیپٹن۔“

”یہاں گھوڑیاں زیادہ ہیں یا گھوڑے۔“  
”میں نہیں سمجھا۔“ چنگیزی کے لہجے میں حیرت تھی۔  
”سمجھے بوجھے بغیر جواب دو۔“

”گھگھ..... گھوڑے۔“

”تو آؤ..... انہیں عشق کرنا سکھائیں۔“

”کیوں مذاق کرتے ہیں!“ چنگیزی نروس سی ہنسی کے ساتھ بولا۔  
”عشق مذاق نہیں۔ عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو۔ سارے عالم میں بھر رہا ہے  
ش..... اسی کو گانا شروع کر دو تو قوالی کہلائے گی۔“

”کیپٹن پلیز..... کوئی ڈھنگ کی بات سوچئے۔“  
”جب تم یہی نہیں بتا سکتے کہ کون کس طرف ہے تو پھر ڈھنگ کی بات سوچئے کا فائدہ۔“  
”گولیاں اس وقت تک چلتی رہیں گی جب تک پیٹیاں نہ خالی ہو جائیں۔“  
”کچھ بردبانی تو تمہارا ساتھ بھی ہیں۔“

”انہیں ان کے قبیلے والے غدار سمجھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت وہ اسی لیے  
پتہ آئے ہوں گے کہ ان کے علاقے میں جا کر بھوت کو کیوں چھیڑا گیا۔ یا پھر وہ ان  
بانیوں کو پکڑنے آئے ہوں گے، جو آپ لوگوں کے ساتھ وہاں گئے تھے۔“  
”بھوت یاد پورا والا قصہ پرانا معلوم ہوتا ہے۔ کیا تمہیں اس کا علم نہیں۔“

”شکار گاہ چلنا پڑے گا۔“

”تم چل رہے ہو ساتھ۔“

”ضرور چلوں گا۔ ورنہ رات کا وقت ہے آپ دشواریوں میں پڑ جائیں گے۔“

جیب میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ چنگیزی بھی مسلح تھا۔ ہیڈ لائٹس کی شعاعیں  
دور تک سڑک پر پھیل رہی تھیں۔ محل سے شکار گاہ کا فاصلہ پندرہ میل سے کسی طرح کم نہ رہا ہوگا۔  
فاصلے کو طے کرنے میں کم از کم ایک گھنٹہ ضرور لگتا تھا۔ بیچ دار اور دشوار گزار راستے کی بنا پر کچھ کم  
اس سے بھی زیادہ وقت صرف ہوتا تھا۔ شکار گاہ کے قریب پہنچ کر انہوں نے فاروں کی آواز  
سنیں۔ مسلسل گولیاں چل رہی تھیں۔

## ٹاپ سیکرٹ

”یہ لک..... کیا ہو رہا ہے۔“ چنگیزی ہکلا یا۔

اور ٹھیک اسی وقت ایک گولی جیب کی چھت چھاڑتی ہوئی گزر گئی۔ حمید نے پورا  
بریک لگائے تھے تھے اور انجن بند کر کے نیچے کود گیا تھا۔

”تم بھی..... نیچے آؤ اور لیٹ جاؤ۔“ اس نے نیچے پہنچ کر چنگیزی سے کہا تھا۔  
اس نے حمید کے بعد ہی چھلانگ لگائی تھی۔ دونوں زمین پر اوندھے پڑے تھے۔  
گولیاں ان کے اوپر سے گزر رہی تھیں۔

”شاید بردبانیوں سے ٹھن گئی ہے۔“ چنگیزی آہستہ سے بولا۔ ”لیکن اس وقت یہ معلوم  
کرنا محال ہوگا کہ کون کس طرف ہے۔“

”چپ چاپ پڑے رہو!“ حمید بولا۔

”میرا خون جوش مار رہا ہے۔“

”ہو سکتا ہے تمہاری فارنگ سے تمہارے اپنے ہی آدمی زخمی ہو جائیں۔“

”یہی تو دشواری ہے۔“

”لیکن یہاں سے کسی اور طرف نکل چلو۔ ہماری آمد کا علم نہ خان کو ہے اور نہ حملہ

آروں کو۔ ہو سکتا ہے دونوں ہی اس جیب پر یلغار کر دیں۔“ حمید بولا۔



گھوڑے کی پشت سے جکڑ رکھا تھا۔

پھر تھوڑی دیر بعد آنکھوں کی پٹی کھولی گئی تھی..... اس نے خود کو ایک بڑے غار میں پایا،  
دونوں طرف مشطوں کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہ چار مسلح برہانبیوں کے زرعے میں تھا۔  
”خدا کی پناہ!“ وہ آہستہ سے بڑبڑایا۔ ان برہانبیوں میں سے ایک کو اس نے پہچان لیا

فانہ، جو انہیں خان دارا کی شکار گاہ سے..... آسیب زدہ علاقے میں لے گئے تھے۔

”یہ تم ہو..... شجر بر.....!“ حمید نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ہاں صاحب.....“ جواب ملا۔

”دونوں طرف کام کر رہے ہو۔“

”ہاں صاحب..... ابی واپس جائے گا۔“

حمید کو اس کی ڈھٹائی پر تاؤ آ گیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔ شجر بر کے چلے جانے کے بعد  
وہاں صرف تین ہی رہ گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رانٹھلیں تھیں۔

حمید خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔ دفعتاً ان میں سے ایک نے پیال کے بستر کی طرف  
اشارہ کیا۔

”آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو۔“ حمید اسے گھورتا ہوا غرایا۔

دفعتاً کسی جانب سے آواز آئی۔ ”وہ کچھ نہیں بتا سکیں گے۔“

”تم کون ہو۔ سامنے آؤ۔“ حمید دباؤ۔

”میں عذاب کا فرشتہ ہوں۔ وقت سے پہلے سامنے نہیں آ سکتا۔“

”تو پھر وقت سے پہلے مجھے کیوں تکلیف دی گئی ہے۔“

”یہاں آرام سے رہو گے۔“

”اچھی بات ہے۔ لیکن پیال کے بستر پر رات نہیں بسر کر سکوں گا۔“

”یہاں تمہیں عیش پسندی اور تن آسانی کی سزا بھی مل سکتی ہے۔“ کیا تم رات کا کھانا

کھا چکے ہو۔“

”نہیں.....!“

”اچھا..... کھانا بھجوا دیا جائے گا۔ اس وقت چپ چاپ سو جاؤ۔ صبح کو تم سے بات کی

”نہیں۔ بات برہانبیوں سے آگے نہیں بڑھی تھی۔ ان کے معاملات انہی تک  
ہیں۔ آج جب ان تینوں برہانبیوں کو آپ لوگوں کے ساتھ وہاں جانے کو کہا گیا تو انہوں نے  
بتایا تھا اور مشکل سے جانے پر آمادہ ہوئے تھے۔“

”شش.....“ دفعتاً حمید آہستہ سے بولا۔ ”کوئی ادھر آ رہا ہے۔“

چنگیزی خاموش ہو گیا۔ حمید نے آہٹ کی طرف کان لگا دیئے تھے۔ آنے والا  
شاید بہت احتیاط سے چل رہا تھا۔ فاروں کی آوازیں پہلے ہی کی طرح سنائی دے رہی تھیں  
ایسا ہی لگتا تھا جیسے دونوں طرف سے نتیجہ خیز اختتام کے لیے جدوجہد جاری ہو۔ اچانک  
چنگیزی کھانسنے لگا۔ پھر حمید نے بھی محسوس کیا جیسے اس کے حلق میں مریچوں کی دھانس ہو  
ہو اور پھر اس نے بھی کھانسا شروع کر دیا۔ گھوڑے بھی اس طرح اچھلنے کو دینے لگے  
ریاں تڑا کر بھاگ نکلیں گے۔“

”بھاگو..... گیس.....!“ حمید بدقت تمام بولا اور اس نے اصطبل سے نکل بھاگنے کی  
کوشش کی تھی۔ پتہ نہیں کس چیز سے ٹھوکر کھا کر گرا۔ پھر مکمل خاموشی چھا گئی۔ نہ فاروں کی  
آوازیں تھیں اور نہ گھوڑوں کی اچھل کود..... اپنی اور چنگیزی کی کھانسیاں بھی سماعت سے دور  
ہو گئی تھیں۔ گہری تاریکی اور مکمل بے حسی۔

اس بے حسی اور خود فراموشی کی مدت خواہ کتنی ہی طویل رہی ہو..... بالآخر شعور کی در  
جاگتی تھی اور اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ اپنی کوشش کے بغیر ہوا میں تیرتا چلا جا رہا ہو۔ یہی  
نہیں بلکہ شاعری والی ”سراپا درد“ کی ترکیب بھی اسی وقت سمجھ میں آئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا  
بیسے پورے وجود کو عجیب طرح کی اذیت نے جکڑ رکھا ہو۔

پھر آہستہ آہستہ ذہن کا غبار چھٹتا گیا تھا اور یہ حقیقت اس پر واضح ہوئی تھی کہ وہ ہوا میں  
نہیں تیر رہا بلکہ کسی گھوڑے کی تنگی پشت پر ڈال کر رسیوں سے جکڑ دیا گیا ہے اور گھوڑا غیر  
معمولی رفتار سے کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ اس بُری طرح جکڑا ہوا تھا کہ  
جسم کو جنبش تک نہیں دے سکتا تھا۔ بتدریج اپنی صحیح حالت کا احساس ہوتا رہا تھا۔ آنکھوں پر پٹی  
بھی بندھی ہوئی تھی۔ گھوڑے کی پشت پر اوندھا پڑا تھا اور ہاتھ پیر ادھر ادھر جھول رہے تھے۔  
خدا خدا کر کے کسی جگہ گھوڑا رکھا تھا اور رسی کے بل ڈھیلے کئے جانے لگے تھے جس نے

”ہائیں..... اے..... ارے۔ خواب سے بھی باہر نقل پڑے سالے۔“ وہ بھرائی ہوئی  
میں کہہ کر کھسیانی سی ہنس کے ساتھ بولا۔ ”ہی ہی..... ہی ہی..... سالے خواب میں بھی  
نہیں لینے دو غمے!“

حمید اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اسے گھورتا ہوا بولا۔ ”مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے۔“  
”تم مجھے نکاح نہیں کرنے دو غمے.....!“ قاسم نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”کیسا نکاح.....!“

”خواب میں ڈاکٹر فوجیہ سے میرا نکاح ہو رہا تھا کہ تم سالے آپکے..... بچ..... بچ آ  
پنے۔ خدا تمہیں گارت کرے اور وہ سالہ پہلے جاسوسی قراتا تھا۔ اب اجاب کافرشتہ بن گیا  
ب۔ میرے کمرے میں نہیں سونے دیتا فوجیہ کو..... قہتا ہے..... پہلے نکاح کرو.....!“

”کون کہتا ہے؟“

”وہی سالہ..... اجاب کافرشتہ۔“

”وہ ہے کون.....؟“

”میں نہیں جانتا۔“

اتنے میں قدموں کی چاپ سنائی دی اور دونوں خاموش ہو گئے پھر ڈاکٹر فوجیہ کمرے  
داخل ہوئی۔ حمید کو دیکھتے ہی اچھل پڑی۔

”خدا کی پناہ.....!“ اس کی زبان سے نکلا تھا۔ پھر ہنس پڑی۔ اور بولی۔ ”اب سب  
بلک ہو جائے گا۔“

”کیا ٹھیک ہو جائے گا۔“ قاسم نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

”جس نے بھی ہمیں پکڑا ہے جہنم رسید ہو جائے گا۔“

”تم میرے موکل تو جہنم میں بھیج دو غمے.....!“ قاسم دہاڑا۔

”سب کچھ تمہاری حماقتوں کا نتیجہ ہے۔ ہم سے مشورہ لئے بغیر تم نے یہ کیس کیوں لے

یاغما۔“

”تم قون ہوتی ہو مشورہ دینے والی۔ میں باس ہوں۔“

”تم بکواس ہو۔“

جائے گی۔“

”تمہاری مرضی۔“ حمید نے بیزاری سے کہا۔

تینوں مسلح بردبانی غار کے دہانے کے قریب جم گئے تھے۔

پھر آواز نہیں آئی تھی۔ حمید ان بردبانیوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ دفعتاً ان سے سوال

بیٹھا۔ ”یہ عذاب کافرشتہ کہاں سے آیا ہے۔“

وہ کچھ نہ بولے۔ اس طرح دیکھتے رہے جیسے اس کی بات سمجھ ہی میں نہ آئی ہو۔

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی غار میں داخل ہوا تھا لیکن حمید اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا کیونکہ

سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا برتن لایا تھا۔ بہر حال کھانے کے لیے جو

کچھ بھی آیا تھا۔ حمید کو زہر مار کر نا پڑا۔ ابلی ہوئی ترکاریاں تھیں۔

وہ آدمی بھی چلا گیا۔ تینوں پہرہ دار اب بھی موجود تھے۔ حمید کو خان دارا کا ملازم بردبانی

شجر بریاد آیا۔ اب تو اس میں شے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی کہ خود خان دارا ہی ان حرکتوں کا

ذمہ دار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ فائرنگ محض ایک ڈرامہ ہی رہا ہو۔ خان دارا کو اطلاع مل گئی ہو

کہ وہ چنگیزی کے ساتھ شکار گاہ کی طرف آ رہا تھا۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ فریدی رام گڑھ چلا گیا

تھا۔ اب وہ اس معاملے کو خود حمید کے زاویہ نظر سے بھی دیکھ سکے گا۔ یہی سب کچھ سوچتے

سوچتے اسے بالآخر پیال کے بستر پر نیند آ گئی تھی۔

دوسری صبح آنکھ کھلی تو پھر ایک ”طلسم ہو شر بانی“ منظر سے سابقہ پڑا۔ نہ وہ اس غار میں

تھا اور نہ پیال کے بستر پر۔ سلیقے سے سجایا ہوا کسی عمارت کا ایک کمرہ تھا۔ اس نے بستر سے

اٹھتے ہی سب سے پہلے دروازے کو آزمایا تھا۔ وہ مقفل نہیں تھا۔ کسی دوسرے کمرے میں کھتا

تھا۔ پھر دوسرے کمرے سے تیسرے میں پہنچا ہی تھا کہ ٹھک کر رہ گیا۔

سامنے فرش پر قاسم پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ نیچے موٹے موٹے گدیلے بچھے ہوئے

تھے۔ حمید خود کو کسی طرح بھی قابو میں نہ رکھ سکا۔

دوسرے ہی لمحے میں اس نے قاسم پر چھلانگ لگائی تھی۔

”ارے..... باپ رے.....“ قاسم نے بوکھلا کر اٹھ بیٹھنے کی کوشش کی اور حمید چٹک

کر دوڑ جا پڑا۔

”کیا باہر نہیں نکل سکتیں۔“

”کیوں نہیں! لیکن شاید میلوں تک اس عمارت کے علاوہ اور کوئی دوسری نہ ہوگی۔“

”چار قیدی بھی ہیں۔“

”کیسے قیدی.....؟“

”ایک ریٹائرڈ جج ہے..... ایک ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس ہے۔ ایک عالم ہے اور ایک

بی ایئر..... وہ طرح طرح کے خوفناک امراض میں مبتلا ہیں اور دن رات چیختے رہتے ہیں۔“

”وہ کون ہے؟ جو تمہیں یہاں لایا ہے۔“

”پتہ نہیں کون ہے لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ بھی میک اپ ہی میں تھا۔“

”اب تم بتاؤ بیٹا..... ورنہ سچ سچ جیل میں ہی رہو گے۔“ حمید قاسم کو گھورتا ہوا بولا۔

”بتا دوں گا.....!“ قاسم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”مگر تمہاری دھونس نہیں ہے۔ ان

راجہ سے بتا دوں گا۔ یہی چاہتی ہیں تو یہی سہی۔“

پھر قاسم نے بتایا کہ دو ماہ پہلے ایک آدمی اس سے ملا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ اس

ایک بہت بڑا کام لینا چاہتا ہے لیکن وہ اسے ٹاپ سیکرٹ کے فائل میں رکھے گا۔

”نہیں کو بھی قانون کا نذر نہ ہونے پائے۔ وہ اسے رام گڑھ لایا تھا اور رام گڑھ سے ایک

آجملے لے گیا جہاں اسے دیو بنا کر لوگوں کو ڈراتا تھا۔“

”وجہ بتائی تھی؟“ حمید نے قاسم کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”یہ دیکھو..... یہ سالے جاسوس ہیں۔ ابے ٹاپ سیکرٹ۔ ٹاپ سیکرٹ ہوتا ہے۔ وجہ

مہم ہو جائے تو ٹاپ سیکرٹ کیوں رہے..... ٹھیکے سے..... میں قچہ نہیں جانتا۔ چلے جاؤ یہاں

سہ اپنے معاملات میں تمہیں ناگ نہیں اڑانے دوں گا۔ میں بھی جاسوس بن گیا ہوں۔“

”بھوت بن گئے ہو۔“

”ٹھیکے سے.....!“ قاسم نے کہا اور حمید فوزیہ کی طرف مڑ کر بولا۔ ”مجھے دکھاؤ وہ قیدی

ہاں ہیں۔“

”فی الحال وہ جگہ مقفل ہے۔ دن میں دو بار انہیں کھانا دیا جاتا ہے۔ ان اوقات میں

نکلوا جاتا ہے۔“

”دیکھو..... دیکھو..... اس سالے کے سامنے بے عزتی نہ کرو۔“ قاسم حمید کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔

”تم تینوں قانون کی نظر میں مجرم ہو۔“ حمید نے قاسم کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”پرائیویٹ

سراغرسانی کا ادارہ قائم کرنے کا حق تمہیں حاصل نہیں ہے۔“

”راز دار۔“ سراغرسانی کا ادارہ نہیں۔ میں ذہنی امراض کا نفسیاتی علاج کرتی ہوں اور

انور پرائیویٹ کیس لیتا تھا۔

”اور یہ بھینسا میک اپ کر کے باس بنا بیٹھا رہتا تھا۔“

”دیکھا تم نے..... میں نہ کہتا تھا کہ اس زہر کی پڑیا کو معلوم ہو گیا ہے، اپنے ابا جان کو

جرور بتائے غی۔“ قاسم نے فوزیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تم خاموش رہو۔“ فوزیہ بولی۔ ”مجھے بتانے دو کہ ہم کس طرح اس جنجال میں پھنسے ہیں۔“

”بتاؤ..... بتاؤ..... میں تو جانتا ہی تھا کہ اب گھپلا ہو جائے گا۔“ قاسم حمید کو گھونٹ دکھا

ہوا بولا۔ ”سالے تم میری قبر میں بھی گھس آؤ گے۔“

”یہ حضرت باس بنائے گئے تھے اور یہ طے ہوا تھا کہ انور کے علم میں لائے بغیر کوئی

کیس نہیں لیں گے۔ انہیں تو موکلوں کے سامنے بولنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ انور ہی کیس

سنتا تھا اور مشورے دیتا تھا لیکن انہوں نے ایک معاملے میں ہم دونوں کو بتائے بغیر ہاتھ ڈال

دیا اور کئی کئی دن غائب رہنے لگے۔ دو دن پہلے کی بات ہے یہ میرے گھر آئے اور بولے

جلدی سے نکل چلو پولیس ہمارے پیچھے ہے۔“

”بیوی سے ٹکراؤ کے بعد!“ حمید بولا۔

”جی ہاں۔“ فوزیہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”میں ان کی بیگم صاحبہ کو پہچانتی نہیں تھی

ورنہ اس کی نوبت ہی نہ آنے پاتی۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ بیوی سے ان کے تعلقات

کیسے ہیں۔ بہر حال ان کے اسی پر اسرار موکل نے انہیں بہکایا تھا اور ہم دونوں رام گڑھ آن

پہنچے تھے۔ پھر وہاں ہماری آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئی تھیں اور یہاں لائے گئے تھے۔“

”یہاں کہاں؟“

”میں نہیں جانتی یہ کون سی جگہ ہے۔“

جہنم میں محفوظ رہتے ہیں۔ اسی لیے خدا نے مجھ کو دنیا میں بھیجا ہے کہ میں انہیں دوسرے جہنموں سے جہنم میں ڈال دوں۔ میں ان کے جسموں میں انہی امراض کے جراثیم دوسرے جہنموں سے پہنچا دوں گا۔“

”خدا کی پناہ.....! لیکن اس لڑکی نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو پتھر کی ہو گئی۔“

”اس نے اپنے باس سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے اور میرے لیے کام کی بھی

نہی۔ لہذا میں نے اس سے ایک کام لے کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

”خان دارا کے ملازم شکور کا کیا قصور تھا۔“

”اسنے اپنے مالک سے غداری کی تھی مجھ سے رشوت لے کر محل میں ٹائم بم رکھا تھا۔“

”لیکن اسے تمہی نے تو اس پر آمادہ کیا ہوگا۔“

”میں خدا کی طرف سے امتحان بھی لیتا ہوں۔“

”اتھارٹی لیٹر دیکھے بغیر یقین نہیں کر سکتا۔“

”میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“

”ہرگز نہیں..... دنیا کیسے یقین کرے گی کہ تمہیں خدا نے اس مشن پر بھیجا ہے اگر تم مجھے

یقین دلا دو تو میں تمہارے لیے کام کرنے پر تیار ہو جاؤں گا اور کرنل کو بھی اس پر مجبور کر دوں گا۔“

”اس کے علاوہ اور کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا کہ خدا نے مجھے جراثیم کے علم سے نوازا

ہے۔ میں دو قسم کے جراثیم سے ایک بالکل ہی نئی قسم پیدا کر سکتا ہوں۔ سائرہ کا پتھر جانا ایسے

نیا جراثیم کا کارنامہ ہے۔“

”اب یقین آ گیا۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ تم مذاہب کے فرشتے ہو اور خدا نے تمہیں

لیے دنیا میں بھیجا ہے کہ تم سائنٹفک طریقے سے انہ کرنے والوں کو سائنٹفک سزا دے

۔“

”شاباش! تم سیدھے راستے پر ہو۔“ آواز آئی۔

”لیکن جو باتیں میری سمجھ میں نہیں آ سکیں ان کے بارے میں ضرور معلوم کرنا چاہوں

۔“

”پوچھو! میں جواب دوں گا۔“

”کتنے آدمی آتے ہیں؟“

”دو مسلح آدمی۔ ابھی ہمارے لیے ناشتہ آئے گا۔ لیکن قیدیوں کو ناشتہ نہیں ملا۔ مرزا

دوپہر اور رات کا کھانا۔“

”پتہ نہیں کب لائیں گے سالے۔ میرا تو دم نکلا جا رہا ہے بھوخ کے مارے۔“

دفعۃً کہیں چھپے ہوئے مائیکر فون سے آواز آئی۔ ”کیپٹن حمید تم نے کیس سن لیا۔ اب

فوراً بتاؤ کہ کرنل فریدی کہاں غائب ہو گیا۔ تم دونوں کو بھی میرے لیے کام کرنا ہے۔“

دونوں اچھے لوگ ہو۔ رشوت نہیں لیتے اور خواہ مخواہ دوسروں پر زیادتیاں نہیں کرتے۔ اس پر

تمہارا مقام جنت ہے۔ میرے کام میں میرا ہاتھ بٹاؤ۔“

## عذاب کا فرشتہ

حمید برا سامنہ بنائے سنتا رہا۔ قاسم ڈاکٹر فوزیہ کی طرف دیکھتا ہوا احتقانہ انداز میں

پلکیں جھپکاتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ ”یہ تو میرا مَوتل بول رہا ہے۔“

”تو تم عذاب کے فرشتے ہو؟“ حمید نے فوزیہ کو آنکھ مار کر پوچھا۔

”ہاں! خدا نے مجھے اسی لئے دنیا میں بھیجا ہے کہ میں گنہگاروں کو سزا دوں اور نیکو کاروں

کو اپنا معاون و مددگار بناؤں۔ کیا تم نے کلام الہی پڑھا ہے۔“ نادیدہ آدمی کی آواز آئی۔

”پڑھا ہے اور پڑھتا رہتا ہوں۔“

”جہنم کا بیان پڑھا ہے۔“

”ہاں..... تم کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”جہنم ایک استعارہ ہے اور آگ اس تکلیف کا نام ہے جو کسی بڑے فعل کے نتیجے میں

آدمی کو پہنچتی ہے۔ مثال کے طور پر جنسی بدکاروں کو کبھی کبھی بڑے خطرناک امراض چٹ

جاتے ہیں اور ان کی زندگیاں ہی جہنم بن کر رہ جاتی ہیں۔“

”ہاں! میں نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے ہیں۔“

”اپنے بچپن میں دیکھے ہوں گے۔ اب انہیں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ ایسے سائنٹفک

طریقے اختیار کرتے ہیں کہ بدکاروں کے باوجود بھی ان کی تندرستی برقرار رہتی ہے۔ یعنی“

”مخیا کرنل پر تہی نے حملہ کرایا تھا؟“

”ہاں! وہ محض وارنگ تھی۔ مار ڈالنا مقصود ہوتا تو گولی دل کو بھی چسید سکتی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم لوگ جو ایماندار ہو اس معاملے میں مداخلت کرو۔“

”چنگیزی کو بلیک میل کرنے کی کوشش کیوں کی گئی۔ میں نے وہ خط دیکھا تھا۔“

”مجھے اپنے مشن کی تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ روپیہ چاہئے۔ خاں دارا یا دوسری خانوں کی دولت جائز طریقوں سے جمع نہیں ہوتی۔ اس لیے مجھے وہ دولت انہی کے خلاف استعمال کرنے کا حق خدا کی طرف سے دیا گیا ہے۔“

”بات سمجھ میں آگئی۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”اس موٹے کودیو کیوں بنایا گیا ہے۔“

”بروہانیوں کو خوفزدہ کر کے علاقہ خالی کرانا چاہتا تھا کیونکہ وہاں میں کام کرتا ہوں۔“

اس ذیل ڈول کا آدمی آج تک میری نظر سے نہیں گزرا۔ بہر حال یہ بات بروہانیوں ہی تک

رہ گئی تھی۔ شہری آبادی تک نہیں پہنچتی تھی۔ سارہ کو اس لیے بھی پتھر میں تبدیل کیا گیا ہے کہ

اس کی پبلٹی شہری آبادی میں بھی ہو جائے تاکہ پکنک منانے والے بھی ادھر کا رخ نہ کریں۔

لیکن خان دارا نے معاملے کو دبا دیا۔ پھر جب تم لوگ پہنچے تو میں نے اسے قطعی طور پر ضائع

کر دیا کہ کہیں تم لوگ اسے کسی سائنسی تجربہ گاہ میں نہ اٹھا لے جاؤ۔ اس طرح سنسنی پھیلا کر

اسے ممنوعہ علاقہ قرار دالنے کا مقصد ہی فوت ہو جاتا۔ سائنسدان یہاں اپنی چھاؤنی ڈال دیتے۔“

”پتھر جیلی کے ڈھیر میں کیسے تبدیل ہوا تھا۔“ حمید نے سوال کیا۔

”شکور کے ذریعہ اس پر ایک نسخہ آزمایا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ پتھر پانی ہو کر بہہ جائے گا،

لیکن فارمولے میں تھوڑی سی کسر رہ جانے کی بنا پر وہ جیلی کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا اسی لیے

تو دھماکہ کرانا پڑا تھا کہ اسی طرح ضائع ہو جائے۔“

”ابھی میں نے یہاں چار قیدیوں کے بارے میں سنا تھا۔ ان کا کیا قصہ ہے۔“

قبل اس کے وہ آواز آتی قاسم دباڑنے لگا۔ ”ابے سارے قصے اسی وقت ہو جائیں

گے۔ بھوخ کے مارے دم نکلا جا رہا ہے۔ ناشتہ بھجواؤ۔“

”اچھا! پہلے تم ناشتہ کر لو۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔“ آواز آئی اور حمید قاسم کو کھا

جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔

عظیم محاسن

”اور قیا!“ قاسم بھی پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولا۔ ”ہر جگہ کا بلیت بگھارنے لگتے

سارے۔“

”زبان بند رکھو ورنہ شامت آ جائے گی تمہاری..... ایسے جراثیم تمہارے جسم میں داخل

کرادوں گا کہ عورت بن جاؤ گے۔“

قاسم کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر بعد تین آدمی ناشتہ لائے تھے۔ تینوں مسلح تھے لیکن حمید نے

اٹھا کر ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ تو عذاب کے فرشتے سے پہلے ہی متفق ہو چکا تھا۔

ناشتے کے بعد پھر آواز آئی۔ ”غالباً تم لوگ ناشتے سے فارغ ہو چکے ہو۔“

”نہیں! تمہارا دیو اب مرغ کی ہڈیاں بھی چبا رہا ہے۔“ حمید اونچی آواز میں بولا۔

”اسی لیے تو میں اسے مستقل طور پر اپنے ساتھ رکھنے کے حق میں نہیں ہوں۔ کھا کھا کر

نئے کال کر دے گا۔“ آواز آئی اور قاسم قہر آلود نظروں سے حمید کو دیکھنے لگا۔

”ہاں! تو اب ان چاروں قیدیوں کے بارے میں سنو!“ آواز آتی رہی۔ ”ان میں

سے ایک ریٹائرڈ جج ہے جو رشوت لے کر انصاف کا خون کیا کرتا تھا۔ ایسا ہی ایک پولیس

آفیسر بھی ہے، ایک ایسا عالم بھی ہے جس نے اپنے علم کے ذریعہ لوگوں کو غلط راستوں پر ڈالا،

ایک ایسا سیاسی لیڈر ہے، جو پرمٹوں اور ٹھیکوں کے لیے عوام کو درغلا تا رہا ہے۔ اب میں ان

کے جسموں میں جہنم داخل کر کے ان کے گھروں پر پھینکوا دوں گا اور ان کے بچاؤ کے سارے

مائنٹنک طریقے دھرے رہ جائیں گے۔“

”جی خوش کر دیا تم نے..... واہ واہ.....!“ حمید خوشی کا اظہار کرتا ہوا بولا۔ ”اس سلسلے

میں کرنل اور یہ حقیر پتھر تمہارے بہت کام آ سکیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ ملک میں ایسے

کتنے گنہگار ہیں۔ تمہارے جراثیم ختم ہو جائیں گے لیکن ان کی تعداد بڑھتی ہی رہے گی۔“

”بہت خوب!“ آواز آئی۔ ”تم وہی کہہ رہے ہو جو میں نے سوچا تھا۔ بہت عقلمند ہو۔

جہانی الحال تمہارے ذمے یہ کام ہے کہ کسی طرح ان دونوں کو نکاح پر آمادہ کر لو۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ فوزیہ چیخ کر بولی۔

”اس پر قاسم کی“ ہی ہی ہی ہی۔“ اشارت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد وہ آواز پھر نہ آئی۔

”کیا حرج ہے اس میں؟“ حمید نے فوزیہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”بہت مالدار ہے تمہیں

”میری بے کرااری دیکھ کر..... اجاب کافرشتہ بھی مجھ پر رحم کھاتا ہے مگر تم سالے۔“

”میں نے کیا کیا ہے؟“

”تم قیوں آن مرے ہو۔ تمہیں دیکھ کر بھڑک گئی ہے۔ کل تہ۔ بڑی میٹھی میٹھی باتیں  
 بنی تھی۔“

”گھبراؤ نہیں! نکاح پر راضی کر لوں گا۔“

”اے نکاح تو میں خود بھی نہیں قرنا چاہتا۔ بیوی سے محبت ہو ہی نہیں سکتی۔ بیوی بن

الی آنکھیں نکالے گی..... غرائے گی۔“

”سب بیویاں ایسی نہیں ہوتیں۔“

”سب ہو جاتی ہیں۔ میرے باپ کی بھی ایسی ہی تھی، میری بھی ایسی ہے اور یہ بھی ہو

نے غی.....!“

”نکاح کے بغیر تو وہ تمہیں اس کے قریب بھی نہ جانے دے گا۔“

”چلو ڈھونڈ کر مار ڈالیں سالے کو۔“ قاسم نے گرجوٹی دکھائی۔

”جلد بازی کی ضرورت نہیں۔“ حمید بھی آہستہ سے بولا۔ ”بس تم اتنا کرنا کہ میرے

اف نہ تو کوئی بات سوچنا اور نہ کسی معاملے میں میری مخالفت کرنا۔“

”مگر تم تو اس کا ساتھ دے رہے ہو۔“

اس کے جواب میں حمید اسے صرف آنکھ مار کر رہ گیا تھا اور قاسم دونوں ہاتھوں سے منہ

باکرہنے لگا تھا۔

پھر انہوں نے باہر جانا چاہا تھا لیکن دروازہ باہر سے بند ملا۔ قاسم نے اسے خلاف

نہل قرار دیا تھا۔ وہ پھر اسی کمرے میں واپس آ گئے جہاں فوزیہ بیٹھی ہوئی تھی۔

”وہ پہر کے کھانے کے بعد وہ تینوں ادگھنے لگے تھے اور فوزیہ بولی تھی۔“ پتہ نہیں کیسی ہوا

بناں طرف کی۔ پیٹ بھرتے ہی نیند آنے لگتی ہے۔“

آرام کر سبوں پر پڑے وہ سو گئے تھے۔ پھر کسی قسم کے شور ہی کی بنا پر اچھل پڑے

غہ۔ پہلے تو اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ شور کی نوعیت کیا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ حمید کو احساس ہوا تھا

کہ وہ آوازیں اسی پوشیدہ مائیکروفون سے آرہی ہیں جس کے ذریعے وہ اس نامعلوم آدمی کی

پریکٹس وغیرہ کی جھنجھٹ سے نجات مل جائے گی۔“

”حمایتوں کے اس پہاڑ سے نکاح کروں گی۔“ وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

”اے..... دیگو..... جیرو تھری میری توین نہ قرو۔ میں باس ہوں۔“

”ایسا گدھا باس بھی مجھے نہ چاہئے، جو ایسی مصیبتوں میں پھنسا دے۔“

”اچھا..... اچھا..... دیگوں گا..... اگر تمہارے اندر ٹی بی کے جراثیم نہ ڈلوادیں تو پتہ

نہ قیا۔“

”بکو اس مت کرو۔“ حمید ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”میں ڈاکٹر فوزیہ کو رضا مند کر لوں گا لیکن

تمہاری گلہری خانم کا کیا ہوگا۔“

”اے ہو غانچہ..... مجھے پرواہ نہیں۔“

”ڈر کے مارے بخار آ گیا تھا جب وہ گھس آئی تھی آفس میں۔“ فوزیہ بولی۔

”اچھا..... اچھا..... مت کرنا نکاح..... ٹھیکے سے۔“

”یہ تو ہو کر رہے گا۔ میں نے عذاب کے فرشتے سے وعدہ کیا ہے۔“

”ناممکن ہے کیپٹن۔ میں مر جاؤں گی..... لیکن یہ نہ ہو سکے گا۔“

حمید نے قاسم کی نظر بچا کر اسے آنکھ ماری تھی۔ وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

پھر کئی منٹ تک خاموشی رہی تھی۔ حمید سوچ رہا تھا کہ اس عمارت سے کسی طرح نکلا

چاہئے۔ فوزیہ نے بتایا تھا کہ ان پر کسی قسم کی پابندی نہیں اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ باہر نکل

کر بھی وہ اندازہ نہ کر پائے گا کہ کہاں ہے۔ بہر حال اس سلسلے میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ

قاسم بول پڑا۔ ”میں اکیلے میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو چلو..... اٹھو..... کیوں نہ باہر چلیں۔“

”بب..... باہر.....!“ قاسم ہکلا کر بولا۔

”آں..... ہاں.....!“

”نہیں! اندر ہی رہیں گے۔“ قاسم اٹھتا ہوا بولا اور پھر اس کمرے سے نکل آنے کے

بعد اس نے کہا تھا۔ ”باہر نہ چلو۔ آغرسالی نے درواجا بند کر لیا تو باہر ہی رہ جائیں گے۔“

”وہ نکاح کرنے کو کیوں کہتا ہے۔“

آوازیں سنتے رہے تھے۔

دفعۃً وہ شور رک گیا اور پھر وہی آواز آئی۔ ”کیا تم لوگ جاگ پڑے ہو۔“

”ہاں! ہم جاگ پڑے ہیں۔“ حمید اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔

”ان بردبانیوں کو سزا دینی ہی پڑے گی۔ کیوں نہ ان کی نسل ہی ختم کر دی جائے۔“

”کیا قصہ ہے! بردبانیوں پر کیوں غصہ اتار رہے؟“

”اس نجس قوم کو ختم ہی ہو جانا چاہئے، جو دوسری اقوام کی لڑکیوں کے اغواء کو اپنا مذہب

فریضہ سمجھتی ہو۔ آج پھر وہ ایک ایسی ہی لڑکی کو اٹھالے گئے ہیں۔ اب میں انہیں فنا کر دوں گا۔“

”اس معاملے میں تو سجد و اہیات لوگ ہیں۔“ حمید بولا۔

”قاسم! جتنی جلدی ممکن ہو دیو بن جاؤ۔ آج انکی بستی کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گے۔“

”میں بہت تھک گیا ہوں۔ آج توفان ہی قردو!“

”کیسی بزدلی کی باتیں کر رہے ہو۔ ان کی عورتیں بڑی توانا اور تندرست ہوتی ہیں۔

جتنی چاہنا پکڑ لینا۔ ان کے سسلے میں تم پر نکاح کی پابندی بھی نہ ہوگی۔“

قاسم کسی نذیرے بچے کی طرح منہ چلانے لگا۔ حمید کی آنکھیں حیرت سے پھلک لگی

تھیں۔ اس نے بالآخر کہا۔ ”عذاب کے فرشتے مامور من اللہ ہو کر ایسی باتیں کر رہے ہو۔“

”ظالموں کو سبق دینے کے لیے اسی کام کو درست سمجھتا ہوں، جو وہ خود کرتے ہوں۔“

”اے تم اس کی باتوں میں نہ آؤ۔ میں تیار ہوں۔“ قاسم چپک کر بولا۔

”شاباش! تمہارے مرتبے بلند ہوں گے اور کیپٹن حمید تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔“

”جیسی تمہاری مرضی!“ وہ مردہ سی آواز میں بولا۔ سوچ رہا تھا کہ شاید اسی طرح کچھ کر

گزر نے کا موقع مل جائے۔

”تم ہمارا ساتھ دو گے۔“

”یقیناً! کیونکہ معاملہ کسی معصوم لڑکی کا ہے۔ میں ان بردبانیوں کا خون بہاؤں گا۔“

”واقعی تم مرد ہو۔“

پھر قاسم وہاں سے چلا گیا تھا اور ڈاکٹر فوزیہ خاموش کھڑی حمید کی شکل دیکھ کر جاری

تھی۔ حمید دیدہ دانستہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ دیو بھی نظر آ گیا۔

جلبہ بدل کر رہ گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سر سے پیر تک کوئی خول چڑھا لیا ہو۔ اس  
جنگ بھی شامل تھے۔ بہر حال اس ہیئت کدائی میں بحیثیت قاسم ہرگز نہیں پہچانا جاسکتا  
کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے چراغ الہ دین والے فلمی جن کی طرح ہنسا شروع  
کیا تھا۔

”خاموش ہو جاؤ!“ فوزیہ دہاڑی۔

تھوڑی دیر بعد دو مسلح آدمی کمرے میں داخل ہوئے اور انہوں نے ان دونوں سے باہر  
پکڑ لیا۔ ڈاکٹر فوزیہ کو وہیں ٹھہرنا تھا۔ اس نے لا پرواہی سے اپنے متعلق ہدایات سنی تھیں اور  
ہنک کر دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔

وہ باہر آئے اور حمید مڑ کر عمارت کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ چاروں طرف سے اونچی اونچی  
ہائوں میں گھری ہوئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گہرے کنوئیں میں کھڑے ہوں۔ مسلح  
انہیں ایک جانب لے چلو۔

پتلی پتلی دراڑوں سے گزرتے ہوئے وہ بالآخر ایک کھلی جگہ پر پہنچ گئے۔ یہاں کئی آدمی  
بلے سے موجود تھے۔ ان میں وہ نقاب پوش بھی نظر آیا جسے حمید پچھلی رات دیکھ چکا تھا۔ غالباً  
یہ اس کے لیے غار میں کھانا لایا تھا۔

وہ سب ایک طرف روانہ ہو گئے۔ حمید اور قاسم کے علاوہ وہ سبھی مسلح تھے۔ نقاب پوش  
بیت وہ آٹھ آدمی تھے۔ بے بسی کا احساس حمید کے ذہن پر طاری ہونے لگا۔ اگر جانا بوجھا  
ملائے دیتا تو کچھ شرع کر دیتا۔ قاسم پر اس وقت بردبانی عورتیں سوار تھیں۔ ورنہ وہ تو بہت  
کارآمد ثابت ہو سکتا۔ اس کے جسم پر بلٹ پروف خول موجود تھا۔ رائفلیں اور ریوولور اس کا  
جو بھی نہ بگاڑ سکتے اور وہ انہیں اٹھا اٹھا کر شیخ دیتا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد وہ پھر ایک تنگ راستے پر آ گئے جس کے دونوں اطراف میں  
لوہی اونچی چٹانیں تھیں۔ قاسم جھومتا ہوا چل رہا تھا۔ دفعتاً بولا۔ ”قیامیں اپنا قبچہہ اشارت  
کردوں۔“

”نہیں! ابھی نہیں۔ جب میں کہوں تب۔“ نقاب پوش نے کہا۔

حمید چونک پڑا۔ یہ تو وہی آواز تھی جو انہیں مائیکروفون کے ذریعے مخاطب کرتی رہی

تھی۔ اس نے نقاب پوش کو کینہ تو ز نظروں سے دیکھا تھا۔ لیکن کچھ بولا نہیں تھا۔ پھر ایک بڑھ کر نقاب پوش کے برابر چلنے لگا۔

”کیا تمہیں اپنے ساتھیوں پر اعتماد ہے۔“ اس نے نقاب پوش کو انگریزی میں مخاطب کیا

”ہاں! قطعی لیکن تم ٹھیک سمجھو وہ انگریزی نہیں سمجھ سکتے۔ یہ خانوں سے نکل کر ہوئے لوگ ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں خانوں کا دشمن ہوں اس لیے یہ مجھ سے نہیں کریں گے۔“

”ان میں کوئی بروہانی تو نہیں!“

”نہیں! یہ سب میرے خاص آدمی ہیں۔“

”تب تو ٹھیک ہے۔“

وہ ایک غار میں داخل ہوئے۔ نقاب پوش کے ساتھیوں نے کئی نارچیس روشن کر لی

اور وہ بہ آسانی بڑھتے رہے تھے۔

”رک جاؤ!“ دفعتاً نقاب پوش بولا۔ پھر وہ حمید کی طرف مڑا۔ ”تم دیکھو گے کہ کام کو دیکھ کر وہ کس طرح بدحواس ہوتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”سامنے والی دراڑ سے گزر کر ہم کھلم کھلا میں پہنچیں گے، وہیں سے کسی قدر نشیب میں بروہانیوں کی ایک بستی ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ لڑکی اسی بستی میں لائی گئی ہے۔“

”کیوں نہ ہم سب مل کر دھاوا بول دیں۔“ حمید بولا۔

”اس کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم سب اوپر سے تماشہ دیکھیں گے۔“ پھر اس نے کام کو قریب بلا کر کہا۔ ”تم ان سے کہنا کہ مغویہ لڑکی دو بروہانی لڑکیوں سمیت تمہارے حوالے کر دیں ورنہ تم پوری بستی کو تباہ کر دو گے۔“

”قتلہ لگاتا ہوا جاؤں؟“ قاسم نے پوچھا۔

”نہیں! خاموشی سے جاؤ! ورنہ وہ تمہارے پہنچنے سے پہلے ہی بھاگ کھڑے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ لڑکی کو بھی ساتھ ہی لے بھاگیں۔“

”میں سمجھ گیا۔ دغ لوں غاسالوں کو۔“ قاسم نے کہا اور دراڑ میں داخل ہو گیا۔

اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر کھلی فضا میں تھے۔ نقاب پوش نے ایک

بھاگ کیوں نہیں رہے۔“

”ان کے ہاتھوں میں بڑے بڑے ڈنڈے بھی ہیں!“ حمید نے کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے بروہانیوں نے قاسم کو گھیر لیا اور اسے ڈنڈوں سے پٹنے لگے۔

”اے..... اے..... خا جاؤں غا..... چبا جاؤں غا۔“ وہ لڑکھاتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ویسے وہ ہلٹ پر وٹ خول کی وجہ سے محفوظ ہی رہا ہوگا لیکن بہر حال وہ ایک وحشیانہ یلغار تھی۔ بوکھلا گیا ہوگا۔

”فائرنگ شروع کر دو!“ نقاب پوش نے اپنے ساتھیوں سے کہا ہی تھا کہ عقب سے آواز آئی۔ ”ٹھہرو۔“

وہ چونک کر مڑے۔ کچھ فاصلے پر شجر برنامی کھڑا نظر آیا۔ وہی جو پچھلی رات حمید کو غار میں نظر آیا تھا۔ خان دارا کا ملازم بروہانی شجر پر۔ اس نے خان دارا کی بھانجی نوشی کی کلائی پکڑ رکھی تھی اور ریوالور کی نال اس کی کینٹی سے لگا دی تھی۔

”اگر تم نے ان پر فائرنگ تو میں اس لڑکی کو یہیں ختم کر دوں گا۔ اپنے آدمیوں سے کہہ کہ اپنا اسلحہ زمین پر ڈال دیں۔“

”غدار! تو نے خان دارا سے بھی غداری کی اور مجھ سے بھی۔“ نقاب پوش بولا۔

”میں نے تو بروہانیوں سے بھی غداری کی ہے، جو اپنوں کے نہیں ہوتے وہ کسی کے نہیں ہوتے۔“ شجر پر نے جواب دیا۔

”میں تجھے جہنم میں پہنچا دوں گا۔“

”اپنے آدمیوں سے کہو کہ اسلحہ دوسری طرف نشیب میں پھینک دیں ورنہ ٹریگر



”کرئل..... نف..... فریدی۔“

”تم غلط نہیں سمجھے.....!“

دفتا نقاب پوش نے بائیں جانب چھلانگ لگائی اور نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔  
”تم انہیں سنبالو!“ فریدی حمید سے کہتا ہوا دوڑ پڑا۔ اس نے بھی نشیب میں چھلانگ

ہائی تھی۔

”سک..... کیپٹن!“ نوشی ہکلائی۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ شجر بر نہیں تھا؟“

”یہ بن کو نہ تھکاؤ۔ اس طرف بیٹھ جاؤ۔“ حمید بولا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔

نقاب پوشوں کے ساتوں آدمی ہتھکڑیاں پہن چکے تھے اور قاسم ایک طرف کھڑا ہانپ

ہاتھا۔

”اس کے ساز کی ہتھکڑی نہیں ہے جناب۔“ بروہانیوں میں سے ایک بولا۔

”ہاتھ پشت پر باندھ دو۔“ حمید نے کہا اور قاسم بوکھلاہٹ میں ”نغوں غوں۔“ کرنے لگا۔

”مجبوری ہے۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”چپ چاپ ہاتھ بندھو لو۔ مجرموں کے ساتھ

دھرے گئے ہو۔“

نوشی جو پھر حمید کے پاس آکھڑی ہوئی تھی بولی۔ ”وہ نقاب پوش کون تھا؟“ ”میں نہیں

جانتا۔“ حمید خشک لہجے میں بولا۔ ”تمہارے لیے لاعلمی ہی بہتر رہے گی۔“

”غمد..... بھائی..... برباد ہو جاؤں غا۔“ قاسم گڑگڑایا اس کے ہاتھ پشت پر باندھے

جار ہے تھے۔

”اگر یہ سچ بولتا ہو تو تمہاری رہائی کی کوشش ضرور کرتا لیکن یہ بروہانیوں کے

بھیس میں پولیس والے معلوم ہوتے ہیں اس لیے مجبوری ہے۔“

دفتا پے در پے کئی فائروں کی آوازیں کسی قدر دور سے آئی تھیں اور حمید اچھل پڑا تھا۔

”اوہ..... تم لوگ کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو۔“ اس نے فریدی کے ساتھیوں سے

کہا۔ ”ان لوگوں کا پھینکا ہوا اسلحہ اکٹھا کرو۔“

فائروں کی آوازیں تھوڑے تھوڑے وقفے سے آ رہی تھیں۔ وہ قیدیوں کو انہیں لوگوں کی

تحویل میں دے کر نشیب میں اترنے لگا۔ قاسم کے لیے وہ سچ محض فکر مند تھا۔ اسے عدالت

جائے گا اور اس لڑکی کی کھوپڑی ترخ جائے گی۔“

اس بار حمید کو چونکا پڑا۔ آواز شجر بر کی نہیں تھی۔ غالباً اسی کو ہوشیار کرنے کے لیے بولنے

”جو کہہ رہا ہے وہی کرو!“ حمید آہستہ سے بولا۔ ”ورنہ لڑکی کی جان جائے گی۔“

”تم آخر چاہتے کیا ہو؟“ نقاب پوش نے شجر سے پوچھا۔

”اپنے آدمیوں کو غیر مسلح کر دو..... سمجھوتہ ہو جائے گا۔ لڑکی بھی بچ جائیگی اور خانہ دارا کو واپس کر دی جائے گی۔“

”اسلحہ پھینک دو!“ نقاب پوش نے اپنے آدمیوں سے کہا۔

وہ اسلحہ پھینک رہے تھے اور حمید شجر بر کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے ریوا اور نوشی کی کٹھن

سے ہٹا کر اس کا رخ ان لوگوں کی طرف کر دیا اور بولا۔ ”اب تم سب اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ نقاب پوش غرایا۔

”سمجھوتہ۔“

اتنے میں قاسم گرتا پڑتا اوپر پہنچ گیا اور ہانپتا ہوا بولا۔ ”سارے پاگل ہو غئے..... ہیں۔

ڈنڈوں..... سے..... پیٹ کر رکھ دیا۔“ اس کے پیچھے بروہانی بھی اوپر چڑھ آئے تھے اور

انہوں نے نقاب پوش کے ساتھیوں پر ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے تھے۔ حمید اچھل کر

شجر بر کے قریب جا کھڑا ہوا۔

شجر بر نقاب پوش سے کہہ رہا تھا۔ ”سمجھوتہ یہ ہے کہ تم سب ہتھکڑیاں پہن لو۔ نہیں تو

جس نے بھی بھاگنے کی کوشش کی۔ جان سے ہاتھ دھوئے گا۔“

”تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔ روکو اپنے آدمیوں کو۔ ورنہ تمہاری پوری بستیوں

تباہ کر دوں گا۔“

پھر اچانک اس کے ساتھیوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑنی شروع ہو گئیں۔

”تنت..... تم..... شجر نہیں ہوا!“ دفتا نقاب پوش چونک کر بولا۔

”میرا بابا یاں بازو زخمی ہے۔ شجر بر مسکرا کر بولا اور اب تم بھی اپنی اصل آواز میں بولنا

شروع کرو تو زیادہ مناسب ہوگا۔“

حمید بیہوش آدمی کو بے نقاب کرنے کی فکر میں پڑ گیا تھا۔  
”کیا کرو گے؟“ فریدی بولا۔ ”کیا تم اب بھی نہیں سمجھتے؟“

”صرف شہبے کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔“ حمید نے کہا اور اس کے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ یہ خاندانہ اشرف تھا۔ نیم دیوانہ بیکشیر یا لوجسٹ۔

”اب بتاؤ وہ ٹائم بم کہاں ہے؟“ فریدی فوزیہ کو گھورتا ہوا بولا۔ ”جس کے دھماکے سے جراثیم والا ٹیوب پھٹ کر جھیل کے پانی کو مہلک بنا دے گا۔“

”اب کیا فائدہ؟“ فوزیہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”بلف کامیاب نہیں ہو سکا۔ اتنی جلدی یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی ایسا انتظام کیا جا سکتا۔ سارہ والے معاملے میں دیو کو بھی گھٹ کر ڈاکٹر اشرف نے عظیم حماقت کی تھی۔ اسی کی وجہ سے کھیل بگڑ گیا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو! قاسم کو صرف بروہانیوں سے علاقہ خالی کرانے ہی تک محدود رکھنا چاہیے تھا۔ مہذب شہریوں کے سامنے ناحق لائے تھے۔ تم لوگ۔“

اس کے بعد فریدی ان سبھوں کو قاسم سمیت اپنے ساتھ لے گیا تھا اور نوشی کو حمید کے ساتھ خان دارا کی شکار گاہ کی طرف روانہ کر دیا تھا۔

نوشی اپنے باپ کی اس حیثیت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ دوسرے دن اس کی تصدیق فریدی نے بھی کر دی۔ حمید کی کہانی سننے کے بعد اس نے کہا۔ ”ٹماٹر والے واقعے کی اہمیت صرف اسی قدر تھی کہ وہ اپنے باپ سے لڑ کر خان دارا کے پاس چلی جائے۔ وہ ہمیشہ یہی کرتا تھا۔ جب کوئی خاص مہم درپیش ہوتی تو نوشاہہ کو کسی نہ کسی طرح اپنے پاس سے ہٹا دیا کرتا تھا۔ یقین کرو کہ وہ نیم دیوانہ ہے۔ اصل مجرم فوزیہ ثابت ہوئی۔ اگر انور سے وہ عظیم حماقت سرزد نہ ہوئی ہوتی تو اتنی بڑی مجرمہ پر ہاتھ ڈالنا ہمارے لیے ممکن نہ ہوتا۔ وہ ایک جنگ باز اور امن کا ڈھنڈورا پیٹنے والے ملک کی ایجنٹ ہے۔ یہاں ڈاکٹر اشرف کے علم سے فائدہ اٹھا کر نت نئے جراثیم پیدا کر رہی تھی۔ اس کے لیے کچھ ایسے مقامی آدمی بھی درکار تھے، جو پوری طرح ان کے وفادار ہوتے یہ خانوں کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے لوگ تھے لہذا انہیں عذاب کا وہ فرشتہ بیحد پسند آیا، جو ظالموں کو دنیا ہی میں سزا دینے پر منجانب اللہ مامور کیا گیا تھا۔ وہ اس کے ایک اشارے پر اپنا خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ بہر حال فوزیہ

میں پیش ہونے سے کسی طرح بھی روکا نہ جا سکے گا۔ ڈاکٹر فوزیہ کی گردن بھی پھسائی فاروں کی سمت کا اندازہ اس نے لگا لیا تھا اور اب خود بھی خالی ہاتھ نہیں تھا۔ نقاب پڑنے آدمیوں کے پھینکے ہوئے اسلحہ میں سے ایک ٹامی گن اس نے اٹھالی تھی اور بہت احتیاط سے اسی طرف چلا جا رہا تھا۔ جدھر سے فاروں کی آوازیں آرہی تھیں۔ کچھ اور آگے بڑھاؤ کی عورت کی آواز سنائی دی۔

کرنل فریدی! خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے۔ ورنہ دس من کے اندر اندر پورا شہر تباہ ہو جائے گا ایک تنفس بھی زندہ نہ بچے گا۔ یہاں سے رام گڑھ کی مردے ہی مردے نظر آئیں گے۔“ لیکن پھر فار کی آواز آئی۔ اس کے بعد دوسری جڑنا بہت قریب کی تھی۔ حمید اور زیادہ احتیاط سے قریب والی آواز کی جانب ریگن لگا اور پھر اہل آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ فریدی کو لگا کہ نے والی عورت ڈاکٹر فوزیہ تھی۔ وہ پھر کہہ رہی تھی۔ ”کرنل فریدی! یہ محض دھمکی نہیں ہے۔ ایک ہلکا سا دھماکہ اس ٹیوب کو توڑ دے گا اور جراثیم جھیل میں پھیل جائیں گے اور آن کی آن میں وائر سپلائی کا مشینی نظام انہیں رام گڑھ تک پہنچا دے گا۔ پھر وادی گلبار سے رام گڑھ تک لاشیں ہی لاشیں..... لاشوں کا شہر..... بابا بابا۔“ فوزیہ نے پھر فار کیا اور دوسری طرف سے بھی فار ہوا۔ اس کی پشت حمید کی طرف تھی اور ایک بڑے پتھر کی اوٹ سے دوسری طرف فار کہہ رہی تھی۔ اچانک اس نے کہا۔ ”ڈاکٹر فوزیہ ریوالور پھینک دو۔ تم ٹامی گن کی زد پر ہو تمہارے پیچھے اڑ جائیں گے۔“ ساتھ اس نے اس کے قریب ہی زمین پر فارنگ کی تھی۔ فوزیہ اچھل پڑی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ پڑا۔ حمید اسے ٹامی گن کی زد پر لئے آگے بڑھتا رہا۔

”پردہ نہیں! میرے بعد لاکھوں آدمی مر جائیں۔ تم سب بھی مر جاؤ گے۔“ وہ وحشیانہ انداز میں بولی۔ ”مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ خود فریدی ہی کسی طرح اس لڑکی کو لے بھاگا ہے۔“ ”فکر نہ کرو! اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے رکھو۔“ حمید بولا پھر اس نے فریدی کو آوازیں دی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد فریدی وہاں پہنچ گیا۔ بے ہوش نقاب پوش اس کے کاندھے پر پڑا ہوا تھا۔ اس نے اسے ایک طرف ڈال دیا اور آگے بڑھ کر فوزیہ کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھنے لگا۔ اس کے لیے اس نے اپنا رومال استعمال کیا تھا۔

یہاں کی آب و ہوا میں خاص قسم کے جراثیم پیدا کر کے اس ملک کو بھجوا رہی تھی۔ اچانک فتنہ مچا کر ہو گئی اور انہوں نے یہ پروگرام بنایا کہ کسی کو پتھر کے مجسمے میں تبدیل کر کے اس کی پہلی کرائی جائے اور پھر یہاں کے مالدار لوگوں کو دھمکا کر ان سے بڑی بڑی رقومات وصول کی جائیں۔ اگر انہوں نے ادائیگی نہ کی تو وہ بھی پتھر کے ہو جائیں گے۔

اس رات خان کی شکار گاہ پر بروہانیوں نے حملہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ اشرف کے ساتھ تھے۔ حملے کا مقصد محض لوٹ مار کرنا تھا۔ ان کے پاس خواراک کی کمی ہو گئی تھی۔ میں رام گڑھ نہیں گیا تھا بلکہ مجھے اس بروہانی پر شبہ ہو گیا تھا جس کا نام شجر بر ہے۔ میں اسی کے پیچھے تھا اور پھر بہر حال میں نے اس سے اگلا لیا کہ وہ ایک نقاب پوش کے لیے بھی کام کرتا ہے اور اسے اس حملے کا علم تھا۔

اسی نے بتایا تھا کہ وہ رات کو رسد لوٹنے آئیں گے لیکن وہ مجھے اس غار سے آگے نہ لے جاسکا جہاں تم پہلے پہنچے تھے۔ اس کی رسائی وہیں تک تھی۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ اس معاملے میں اشرف کا ہاتھ ضرور ہے۔ شبہ اسی ٹھانڈا لے واقعے سے ہوا تھا۔ بہر حال پھر میں نے اس پر ہاتھ ڈالنے کے لیے یہی مناسب سمجھا کہ نوشی کے اغواہ کی اطلاع شجر بر ہی کے توسط نقاب پوش تک پہنچا ہی دی جائے۔ تم نے دیکھ ہی لیا کہ کیا ہوا تھا۔ شجر بر کو تمہارے اور میرے سلسلے میں بھی ہدایت ملی تھی کہ کسی طرح ہمیں اس غار تک پہنچا دیا جائے لہذا تم پہنچے تھے۔ شجر بر پر مجھے اس وقت شبہ ہوا تھا جب گھوڑوں پر بے آواز فائرنگ ہوئی تھی۔ اس کا رد عمل اس بروہانی پر مجھے قطعی مصنوعی محسوس ہوا تھا۔ اب رہے قاسم صاحب تو انہیں عدالت میں تو پیش ہی ہونا پڑے گا..... وعدہ معاف گواہ کی حیثیت سے.....!“

”لیکن اشرف آپ کے کاندھے پر کیسے سوار ہو گیا تھا؟“ حمید نے پوچھا۔

”بڑی مشکل سے قابو میں آیا تھا۔ اسے بیہوش کر کے تم لوگوں کی طرف پلٹا ہی تھا کہ فوزیہ آنکرائی۔“

”بڑے دل گردے کی عورت نکلی۔“ حمید نے کہا اور فریدی کے زخمی بازو کو پرتشویش

نظروں سے دیکھنے لگا۔

ختم شد